پاکستان کی اصل کہانی1968.69کا انقلاب

چنگاری ڈات کام06.05.2011

مصنف۔ لال خان
مترجم ۔ اسد پتافی
پہلا ایڈیشن ۔ جنوری دو ہزار نو
طبقاتی جدوجہدپبلیکیشنز 105منگل مینشن رائل پارك لكشمی چوك لاہور۔

انتساب

انیس سو آٹھاسٹھ ، اناہتر کے مزدوروں ' نوجوانوں اور دہقانوں کی نسل کے نام جس نے اپنی جرات اور عزم سے تاریخ کی کسوٹی پریہ ثابت کیاکہ اِس سرزمین پر سوشلسٹ انقلاب ایک زندہ حقیقت کے طو ر پر برپا کیا جاسکتا ہے۔

اظہارِتشکر ۔۔۔۔۔ میں چند ایسے ساتھیوں کا ممنون ہوں جن کی انتھک کاوشوں کے بغیر اس کتاب کا منظر عام پر آنا شاید ممکن نہ ہوتا۔کامریڈ آدم پال جس نے دن رات کی محنت سے انگریزی اور اردو ایڈیشنوں کو ٹائپ سیٹنگ سے لے کر پروف کی غلطیاں لگانے تک اس کتاب کی اشاعت میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔لندن میں کامریڈ ہیری وٹیکر نے نہایت ہی مہارت سے انگریزی ایڈیشن کا پروف کیا۔پرانے دوست فریڈویسٹن جس نے مختلف موضوعات پرمواد فراہم کیا اور سیاسی تناظر استوار کرنے میں معاونت کی۔کامریڈ ممتاز نواز مستوئی (ڈوڈی) نے تحقیق میں بہت مدد کی۔کامریڈ ثقلین شاہ جس نے اس کتاب کی ڈیزائننگ' لے آئوٹ اور سرورق تخلیق کیا۔کامریڈ رنگ الہٰی نے اپنی مخصوص لگن اور انتھک محنت سے خصوصاً اردو ایڈیشن کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ کامریڈ عابد جس نے کامریڈ آصف بٹ کے ساتھ مل کر اس کتاب کی چھپائی او رترسیل میں بے حد جانفشانی سے کام کیا۔کامریڈ اسد پتافی جس نے نہایت ہی نامسائد حالات میں اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔کامریڈ پارس جان جس نے نہ صرف ترجمے کو مزید بہتر کیا بلکہ ارود ایڈیشن کی زبان کو بلاغت دی۔میرے پیارے دوست اور ساتھی جو ناتھن کلائین جس کے محبت بھرے اصرار اور ہمت افزائی نے اس کتاب کو تحریر کرنے میں بہت مدد کی۔آخر میں، میں تین دہائیوں سے اپنے دوست ' ساتھی اور استاد کامریڈ ایلن وڈز کا ممنون ہوں جس نے نہ صرف ا س کتاب کا تعارف لکھا بلکہ مسلسل حوصلہ افزائی کی

جس سے میں اس کام کی تکمیل کرسکا۔ لال خان ، جنوری دو ہزار نو

پیش لفظ

تاریخ کے عظیم ترین نظریات ہمیشہ حقیقی زندگی کے واقعات کی کسوٹی پرپرکھے گئے ہیں۔ مارکسزم کے نظریات کی سچائی اور درستگی کو کائیناتی طور پر تسلیم کروانے کیلئے اکتوبر کی سرزمین پر عظیم بالشویک انقلاب کی فتح درکار ہوئی۔ دیوار برلن کے گرنے اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد کے عرصے میں حالیہ عالمی سرمایہ دارانہ بحران اور مالیاتی سرمائے کے زوال نے ایک مرتبہ پھر عالم کی توجہ انقلابی مارکسزم کے نظریات کی جانب مبذول کروائی ہے۔ عام وقتوں میں سماج کی سیاسی ' معاشرتی اور ثقافتی نفسیات کا متعین اور اس پر غالب حکمران طبقات کی رجعتی اخلاقیات اوراقدار ہی رہتے ہیں ۔ تمام تصادم 'تبدیلیاں ' واقعات'سوچیں ' سماجوں اور ملکوں کی پہچان اشرافیہ کے مفادات اور مالیاتی سرمائے کے جبر کی ضروریات کے مطابق تشکیل دی جاتی ہے۔ عالمی پیمانے پرپاکستان کی تاریخ اس کا کردار اور بطور ملک اسکی تعریف اسی حوالے سے پیش کی گئی ہے ۔ مختلف بیرونی اور ملکی تاریخ دانوں نے جو یہاں کی تاریخ مرتب کی ہے اور بورژوا دانشوروں اور ماہرین نے جو تجزیے کیے ہیں وہ حکمران طبقات کے مفادات کو مد نظر رکھ کر استوار کیے گئے ہیں ۔ اس سماج کی تاریخ سے اہم پہلوئوں کو یا تو دبایا گیا ہے یا پھر مکمل طور پر نظر انداز کردیا گیا ہے ۔ بہت سے غیر اہم مسئلوں کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ حقائق کو مسخ کرنے کی ان کوششوں میں ذرائع ابلاغ کے ساتھ نام نہاد بائیں بازو کے خود ساختہ مورخین بھی شامل تھے۔ جن کا سب سے بڑا شکار پاکستان کا انیس سو آٹھاسٹھ اور انایتر کا انقلابی ابھار تھا جس کو کچھ لوگوں نے ایوب خان کے خلاف احتجاج تصور کیا اور کچھ نے آمریت کے خلاف جمہوریت کی بحالی کی تحریک یا محنت کشوں کے اپنے مطالبات منوانے کی جدوجہد قراردیا۔ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی ۔ اس عوامی انقلابی ابھار کا کردار واضح طور پر سوشلسٹ تھا جس نے انقلاب آفرین حالات پیدا کردیئے تھے۔ اس تحریک نے نہ صرف موجودہ نظام کو چیلنج کیا ' آمریت کو للکارا' بلکہ سیاسی نظم ونسق کو تہہ وبالا کردیا تھا اور سب سے بڑھ کر مالکانہ حقوق کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس انقلابی کیفیت نے عوام میں ایک ایسی خواہش ' تڑپ اور جذبہ پیدا کردیا تھا جو اجتماعیت کے شعور کے ساتھ آگے بڑھ کر محنت کشوں کی ملکیت اور سیاسی حاکمیت قائم کرکے بڑی صنعتوں پر جمہوری غلبہ حاصل کرنے کی ہمت اور معیشت پر معاشرے کی حاکمیت کی جرات بھی دکھا سکتا تھا۔

اس کتاب میں ہم یہ سب نمایاں طور پر واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ یہ سارا شعور پاکستان کے محنت کشوں' نوجوانوں کی موجودہ نسل اور ان کی ہم عصر دنیا تک

پہنچ جائے۔کچھ مصنفین نے تاریخ کے اس شاندار انقلابی ابھار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ اور یہ کتاب اس تاریخی ابھار کے انقلابی کردار کو پوری طرح واضح کرنے کیلئے ہے جو سوشلسٹ فتح کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ بہت سے ساتھیوں اور دوستوں نے گزشتہ تین دہائیوں میں مجھے ہمت دلائی اور مشورہ دیا کہ اس فریضے کو سرانجام دوں مگر بعض دیگر اہم مصروفیات آڑے آئیں مگراب موجودہ غیر یقینی حالات ' شدید بحران اور پاکستان کے محنت کشوں کی بے پناہ مشکلات سے جنم لینے والے آزمائشی لمحوں میں اس کی تصنیف اور اشاعت ناگزیز ہوگئی ہے۔ پاکستان ان دنوں بنیاد پرستوں' دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کا مرکز سمجھا جارہا ہے ۔ اس کے وجود میں آنے کا مقصد ایک مذہبی ریاست قائم کرنا بیا ن کیا جاتا ہے ۔ فوجی حکومتوں 'مارشل لائوں' دبائو'گھٹن ' لاقانونیت' جرائم ' بددیانتی او ر عدم استحکام کے طویل سلسلے بھی سب پر ظاہر اور عیاں ہیں ۔ پاکستان کی نئی نسل کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان حالات کا بھرپور شعورر کھتی ہے ۔ اسلامی بنیاد پرست حالات کو ازمنہ اولیٰ کے تاریک دور میں لے جانا چاہتے ہیں جب کہ سامراجی اور ان کے گماشتے یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور بہتر حاکمیت سے سارے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔ پاکستان کے عوام کو ان دونوں کا تلخ تجربہ ہے جن سے گزرتے ہوئے انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ لوٹ مار' تشدد' تباہی اور بربادی دیکھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں‌نوجوانوں' محنت کشوں اور کسانوں کی اتنی زیادہ تحریکیں کیوں چلی ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے طور پر اپنے طریقوں سے سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ ' جاگیرداروں کے ظلم وستم اور استحصال سے نجات پانے کے لئے تھیں۔ انیس سو آٹھاسٹھ اور اناہتر کی انقلابی تحریک ان تمام تحریکوں سے نمایاں اور منفر د تھی جو سوشلسٹ فتح آسانی سے حاصل کرسکتی تھی۔ پاکستان کے عوام نے ظلم وستم 'تشدد' استحصال کے طویل ادوار سے گزرنے کا تلخ تجربہ کیا ہے ۔ ان ادوار کے خلاف وہ بہت مرتبہ آتش فشاں تحریکوں سے بھی گزرے ہیں۔ پاکستان کی سرکاری کہانی اس کے حاکموں اور ان کے کاسہ لیسوں کی کہانی ہے ۔ مگر اب پاکستان کی اصل کہانی جو اس ملک کے محنت کشوں نے اپنے خون پسینے اور آنسوئوں‌سے لکھی ہے پیش کرنے ضرورت ہے۔ پاکستان کے زیر دست محنت کشوں کا ایک اپنا مشن ہے ۔ خو د اپنی بیداری اور شعور کا مشن۔ انہوں نے ایک تاریخی فریضہ سرانجام دینا ہے۔ ایک سوشلسٹ انقلاب کو کامیاب بنانے کا فریضہ۔ انہوں نے اپنے طبقے کے مفاد میں بہت سی جنگیں لڑیں ہیں۔ بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ ان گنت خاموش بہادروں نے سوشلسٹ انقلاب کی فتح کے لئے لازوال جدوجہد کی ہے' نسل در نسل زخم سہے ہیں وہ پھر اٹھیں گے ' ایک اور جنگ لڑیں گے غلامی او راستحصال سے نجات پانے کی جنگ۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے ۔ ان کو بھی اپنی کہانی سنانی ہے ۔یہی پاکستان کی اصل

کہانی ہے۔، لال خان   لاہور۔تیس اکتوبر دو ہزار آٹھ

تعارف۔

پاکستان کے انیس سو آٹھاسٹھ اور اناہتر کے انقلاب کے حوالے سے لال خان کی یہ نئی کتاب "پاکستان کی اصل کہانی"عالمی مارکسزم کے نظریاتی خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔انیس سو آٹھاسٹھ میں یورپ کی توجہ فرانس کے شاندار انقلابی واقعات پر مرکوز تھی مگر مجھے پاکستان کی فقیدالمثال تحریک اچھی طرح یاد ہے جس نے مجھ پرگہرے اثرات مرتب کیے تھے ،میں نے اس وقت اس تحریک کے بارے میں ایک مضمون بھی لکھاتھاجوہمارے جریدے "پرسپیکٹو میں پاکستان،غداری کی زد میں آیاہواانقلاب،، کے عنوان سے شائع ہواتھا۔میرا یہ تعارف بھی اسی مضمون کے زیادہ تر مواد پر مبنی ہے۔ انیس سو اٹھاسٹھ کے آغاز میں ایوب خان کی فوجی آمریت ایشیا ئی حکومتوں میں ایک نمایاں مستحکم حکومت کے طورپر ابھرکر سامنے آئی تھی۔وہ دس سالوں تک ایک 'مرد آہن 'کے طورپر پاکستان پر حکمرانی کرتا رہاجس نے اپنے تئیں پاکستانی سماج کو انتشار سے بچایاتھا۔ایک کلاسیکل بوناپارٹسٹ انداز میں اس نے مغرب و مشرق کی بڑی عالمی متحارب طاقتوں کے مابین تعلقات میں توازن پیداکیے رکھا۔ابھی وہ برطانیہ و امریکہ سے امداد لے رہاہے تو ابھی روس و چین اس کی مدد کررہے ہیں۔مگر خاص طورپر چین کے ساتھ تعلقات نے اسے بہت فوائد مہیا کیے نہ صرف بھاری امداد اور تجارت کی شکل میں معاشی بلکہ سیاسی طورپر بھی کہ اس تعلق کی برکتوں سے ایوب آمریت کو 'ترقی پسند'حکومت کا تخلص میسرآگیا۔چینی افسرشاہی نے ایوب آمریت کی بھرپور حمایت کی۔چواین لائی نے انیس سو پنسٹھ کے دھاندلی زدہ الیکشن میں کامیابی پر ایوب خان کو مبارکباد پیش کی۔جب اسی سال پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو چین نے پاکستان کی یہ کہہ کر مدد کی تھی کہ یہ ایک 'عوامی جنگ 'ہے۔ یہ سب کچھ نامعقول جذباتی وجوہات کی بنیاد پر کیا جا رہا تھا۔کیونکہ دوسری طرف روس بھارت کا ساتھ دے رہاتھا۔یہ امداد پرانے اصول 'میرے دشمن کا دشمن میرا دوست ہے 'کے تحت فراہم کی گئی۔ عالمی سطح پر ایوب حکومت کی کامیابی اپنی گہری تہوں میں معاشی و سماجی بحران لیے ہوئے تھی۔کوئی شک نہیں کہ معیشت مثالی ترقی کر رہی تھی اور اس کی شرح پانچ سالانہ کو پہنچی ہوئی تھی مگر یہ ترقی صرف مغربی پاکستان کی حدود میں ہی تھی جبکہ اس کا مشرقی حصہ جو اب بنگلہ دیش بن چکاہے،اس سے محروم تھا اور وہاں ناامیدی اور نیم جاگیردارانہ پسماندگی کا راج تھا۔یہ صوبہ دوفصلوں پر انحصار کیے ہوئے تھا جن میں ایک چاول (جس کا دارومدار سیلاب پر ہوتاتھا)اور دوسری پٹ سن جس کی عالمی منڈی میں بہت زیادہ مانگ تھی کیونکہ اسے پلاسٹک سمیت دوسری

سنتھیٹک اشیا کی تیاری کیلئے کام میں لایا جاتا تھا۔مغربی صوبے میں جو زیادہ انڈسٹریلائزڈ ہو چکا تھا،دولت کا اجتماع خطرناک حدوں کو پہنچ چکا تھا۔ ایک طرف بدنام زمانہ بائیس خاندان ملک کی صنعتی دولت کے 66%،انشورنس کے 79%اور بینکنگ کے 80%کے مالک بن چکے تھے تو دوسری طرف اسی مغربی پاکستان میں ہی اوسط فی کس آمدنی35پونڈ سالانہ تھی جبکہ مشرقی پاکستان کے اندرتو یہ اس سے بھی بدتر15پونڈ سالانہ تھی۔ آبادی کی اکثریت کی اس قدر محرومی اور غربت نے ایک دھماکہ خیز کیفیت پیدا کر دی تھی جسے محض ایک چنگاری کی ضرورت تھی۔ 1967ء کے آخرتک مختلف علاقوں میں فسادات پھوٹ پڑے تھے جوکہ جنوری میں پھر سے شروع ہوگئے۔ان میں بنیادی ایشو جعلی الیکشن تھاجوایوب نے بنیادی جمہوریت کے نام سے متعارف اور مسلط کیے تھے۔یہ ایک ایسی دھوکہ دہی تھی جس کے تحت الیکشن کا حلقہ انتخاب 80000خود ساختہ بیسک ڈیموکریٹس افراد کو بنانا مقصود تھا۔ یہ 'بنیادی جمہوریے '(بی ڈی ممبر)دراصل حکومت کی کٹھ پتلیاں تھے............... انقلاب ..

.... انیس سو اٹھاسٹھ کے ابتدائی مہینوں میں پاکستان بڑی عوامی تحریکوں کی زد میں آچکا تھا جن میں عوام کی سبھی پرتیں شریک تھیں۔بورژوا پریس اسے 'مخلوق راج'قرار دے رہاتھا۔صحیح تو کہاجا رہاتھا ان طفیلی حکمرانوں کی جانب سے جو عوام پر حکمرانی کر رہے تھے؛بے چارے عوام؛مزدور اور کسان جوسماج کی ساری دولت پیداکیاکرتے ہیں انہیں مخلوق ہی کہا جائے تو بہتر ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ یہ انقلاب اچانک سامنے نہیں آیا،اس کی تیاری کب سے سماج میں ہو رہی تھی۔بظاہر استحکام کے عین نیچے بے چینی و اضطراب آہستہ آہستہ مگر یقین کے ساتھ پنپتے جارہے تھے۔ سترہ جنوری کو پولیس نے ڈھاکہ میں مظاہرین پر فائر کھول دیے جس سے درجنوں افراد ہلاک ہوگئے۔چو بیس جنوری کو شہر ایک عام ہڑتال کے باعث مفلوج ہو کررہ گیا،طلبہ کو سنبھالنے کیلئے فوج طلب کر لی گئی۔پھر صحافیوں کی طرف سے چو بیس گھنٹوں کی ہڑتال کا اعلان کردیا گیا جو حکومت کی طرف سے ''ایمرجنسی لا''مسلط کیے جانے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔(یہ قانون جنگ کے دوران نافذ کیاگیاتھا مگر اب اسے ''اندرونی دشمنوں،،کے خلاف بروئے کارلایاجارہاتھا)۔ عوام کے بپھرتے غم وغصے سے گھبرا کر ایوب حکومت نے مراعات کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔خاص کر طلبہ کے ساتھ اس کی ہمدردیاں اچانک ابھرنے لگیں ۔اس نے یونیورسٹیوں میں طلبہ تنظیموں پرلگی پابندی اٹھالی ۔مگر ایوب نے مراعات اور اصلاحات میں بہت دیر کر دی تھی ۔یہ لوگوں کو مطمئن اور پرسکون کرنے کی بجائے ان کو مزید بھڑکا تی چلی گئیں۔اس کیفیت کو بھارت میں ہونے والے مڈٹرم الیکشن میں مغربی بنگال میں یونائٹڈ فرنٹ کی کامیابی نے اور بھڑکادیا۔اس کے اثرات پاکستان کی مشرقی سرحدوں کے اندر تک سرایت کر آئے۔جس سے

نئی سرکشی کے امکانات کا خدشہ بڑھنے لگا۔ایو ب نے بادل نخواستہ مشرقی پاکستان میں سے گرفتار اپوزیشن لیڈر شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر دیا۔بحران سے بچنے کی حتمی کوشش کے طور پر ایوب ملک کی اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ ملنے کو راضی ہو گیا جنہیں اس نے 1965ء میں ”پانچ بلیاں قرار دیا تھا جو اپنی اپنی دم اپنے اپنے منہ میں دبائے پھرتی تھیں“۔مگر اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات میں بائیں بازو کی پارٹیوں کو باہر ہی رکھا گیا۔

تمام تر بحران میں بورژوا اپوزیشن DAC نے خود کو انتہائی بے بس اور لاچار ثابت کیا۔کراچی کی کاک ٹیل پارٹیوں میں پیش کیے جانے والے ’آئینی اصلاحات‘ کے مطالبات کو سڑکوں پر نکلے ہوئے عوام گھاس نہیں ڈال رہے تھے۔طلبہ جو اس تحریک کے روح رواں بنے ہوئے تھے،انہوں نے محنت کش طبقے کی طاقت کو اپنے ساتھ ملا لیا۔مغرب کے سنجیدہ سرمایہ دار جریدے بے بسی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔مغربی بنگال میں یونائٹڈ فرنٹ کی کامیابی اور پاکستان میں عوام کی سرکشی نے ’اکانومسٹ‘ کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا”اگر ایشیا کے کسی شہری حصے میں انقلاب کی تڑپ واضح دکھائی دے رہی ہے تو وہ کلکتہ ہے مگر مشرقی پاکستان کے شہر بھی اس سے کم پیچھے نہیں ہیں“۔

فروری اور مارچ میں سارے ملک کو ہڑتالوں کی ایک بہت بڑی لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔13فروری کو دس سالوں میں پہلی بار لاہور میں سرخ پرچم لہراتے نظر آئے، 25000سے زائد ریلوے مزدور سڑکوں پر مارچ کرتے اور نعرے لگاتے نکل پڑے تھے”ہم چین کے عوام کے ساتھ ہیں‘سرمایہ داری مردہ باد“۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے مزدور اور کسان سماج کو بدلنے پر تیار ہو چکے تھے۔بدقسمتی سے کوئی مارکسی پارٹی موجود نہیں تھی جو اس انقلابی دھارے کو اس کے منطقی انجام تک لے جاتی۔

پیکنگ کی حمایتی نیشنل عوامی پارٹی،نیپ کی مزدوروں اور کسانوں کی وسیع پرتوں میں حمایت اور اثرات موجود تھے۔مگر وہ انقلابی پروگرام سے عاری تھی چنانچہ عوام کو انقلاب کیلئے منظم و متحرک کرنے کی بجائے اس چین نواز سٹالنسٹ پارٹی نے دائیں بازو کی مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے ساتھ بلاک تشکیل دینے کا مطالبہ کر دیا۔مائواسٹ کسان لیڈر مولانا بھاشانی نے جلسوں میں پرجوش تقریریں کیں اور حکمرانوں کو خانہ جنگی سے خبردار کرتے ہوئے دھمکی دے دی کہ” الیکشن میں حصہ لینے والوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا جائے گا“۔لیکن یہ تقریریں اور اس کے سبھی الفاظ محض الفاظ ہی رہے ،عملاً کچھ بھی نہیں کیا گیا۔اس دوران مشرقی پاکستان میں کسانوں نے زمینوں کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا اور انہوں نے جرائم پیشہ افراد،دیہی سربراہوں اور ایوب حکومت کی بنیادی جمہوریت کیلئے مرکزی کردار ادا کرنے والے کلکٹروں کو سزائیں دینی شروع کر دیں۔عوام کے موڈ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بورژوا لیڈر مجیب کو بھی ڈھاکہ کے طالبعلموں کے مطالبات کے تیار کردہ پروگرام کی

حمایت کرنی پڑگئی کہ صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا،اور سیٹو ،سینٹو جیسے سامراج حمایتی معاہدوں سے تعلق ختم کردیاجائے گا۔

ایک شاندار تحریک

بورژوازی کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ پاکستان انقلاب کی دہلیز پر پہنچ چکاہے۔وہ کچھ غلط بھی نہیں سوچ رہی تھی۔پاکستان کے تاجروں نے اپنی رقم بیرون ملک منتقل کرنے پر بھاری رقوم خرچ کرنی شروع کردیں۔دوہفتوں کے دوران ہی سٹرلنگ کی بلیک مارکیٹ میں قیمت 21روپے سے 30 روپے پر پہنچ گئی۔جبکہ سونے کی قیمت میں40%اضافہ ہوگیا۔برطانوی سرمایہ دارپریس نے بھی پاکستان کی تشویشناک صورتحال کی نشاندہی کی اور کہا کہ حکومت کی خود کو سنبھالنے میں ناکامی واضح ہو چکی ہے۔

ریاستی عملداری ریت کے ذروں کی طرح بکھر چکی تھی۔ساری قوت مزدوروں اورکسانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی اورجس طرح 1936ء میں سپین میں ہواتھا جہاں مزدوروں ‘کسانوں کو جلدہی ”الیکشن پروگرام“کی حامل جمہوریت سمیت سبھی حکمرانہ چالبازیاں سمجھ آگئی تھیں ،یہاں بھی یہی ہوا مزدوروں‘کسانوں‘ نوجوانوں کو سب سمجھ آگئی تھی۔دس سالوں تک نکمے نکھٹو سیاستدان اپنا سارازورلگا کر جو نہیں کر سکے تھے،اسے عوام کے انتھک انقلابی عمل نے ممکن بناناشروع کردیاتھا۔پھر ان بورژوا سیاستدانوں کا کردار کیارہ گیاتھا؟ یہی کہ پرولتاریہ اور کسان اقتدار کسی ”لیڈر“کے حوالے کر دیتے۔

چوبیس فروری کو ’فنانشل ٹائمز‘نے بتایا کہ کراچی میں سینئر افسروں کا کورٹ مارشل کیا جا رہاہے کیونکہ انہوں نے حکم عدولی کی تھی اور حکم یہ تھا کہ مظاہرین پر گولی چلا دی جائے۔’دی ٹائمز‘نے صورتحال کے بارے میں لکھا کہ”ہر شعبے میں ہڑتالیں ہو رہی ہیں ،تجارت ہو یا کوئی ادارہ،ڈاکٹروں سے لے کر ریلوے اور ریاستی انجینئروں تک، ہر سڑک ہر گلی میں عوام کے مارچ ہو رہے ہیں۔پچھلے پندرہ دنوں سے ڈھاکہ میں پولیس کی وردی تک نظر نہیں آئی“۔

سرمایہ دارانہ نقطہء نظر سے پاکستان کی صورتحال قابو سے باہر ہو چکی تھی۔حکومت کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔حکومت چلانے والے ہوا میں معلق ہو چکے تھے۔ پولیس فورس شل ہو چکی تھی جبکہ فوج متذبذب تھی۔تحریک نے ہر شعبے ہرایک ادارے کو اپنے اثرات میں لے لیاتھااور سماج کو تبدیل کر کے رکھ دیاتھا۔ایک کلاسیکل

انقلاب کے سبھی عوامل موجود تھے سوائے ایک انقلابی قیادت کے۔

ایسی صورتحال کے ہوتے ہوئے اگر اسے قیادت میسر آجاتی تو سماج کی تبدیلی کا عمل آسانی سے تکمیل پا سکتاتھا۔لیکن یہ صرف پاکستان کے مزدوروں اورکسانوں کی ہی بد قسمتی نہیں تھی فرانس اور اٹلی میں بھی ان کے مزدور اورکسان بھائیوں کو بھی قیادت کی تنگ نظری، نااہلی اور بزدلی نے ناکامی کی دلدل میں دھکیل دیاتھا۔پاکستان کے سٹالنسٹوں کی طرف سے عوام کی شاندارکامیاب جدوجہدکے باوجود اقتدارکو قبضے میں نہ لے کر ردانقلاب کو کھلا موقع فراہم کیا گیا۔

پاکستان کے مزدوروں اورکسانوں کی اس قدر شاندار اور حقیقی جدوجہد کو جتنا خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے اور یہ کسی طوربھی فرانس اور اٹلی میں ان کے طبقاتی بھائیوں کی طرف سے چلائی جانے والی عظیم تحریکوں سے کم اہمیت کی حامل نہیں تھی۔درست قیادت کی فراہمی اسے اقتدار سے ہمکنارکرسکتی تھی۔لیکن پھر اٹلی فرانس کی طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خرابی، کمزوری قیادت میں تھی نہ کہ تحریک چلانے والوں میں۔نہ تو بھٹو نہ ہی نیپ' کوئی بھی اقتدار سنبھالنے کو تیارنہیں تھا۔اسی کمزوری نے ہی یحییٰ کی فوجی بغاوت کو موقع فراہم کردیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی

پاکستان پیپلزپارٹی یکم دسمبر **1967**ء کو قائم ہوئی تھی اس کا پروگرام سوشلسٹ تھا اور اسکی بنیادی دستاویزات میں کہاگیا کہ تمام پیداواری ذرائع کو قومی ملکیت میں لے کر ایک عوامی ملیشیا تشکیل دی جائے گی۔ذوالفقار علی بھٹو جو بے نظیر بھٹو کا والدتھا،نے ایوب خان کی مخالفت شروع کی ہوئی تھی جبکہ ماسکو اور پیکنگ کے چاہنے والے 'ترقی پسند'ایوب خان کی حمایت میں پیش پیش تھے۔چنانچہ بھٹو مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آتاگیا۔ہر چند کہ وہ سندھ کا ایک وڈیرہ ہی تھا اور ایوب کابینہ میں وزیرخارجہ بھی رہ چکاتھا۔اس کے باوجود بھی اس نے سوشلزم کا نعرہ بلند کیااور بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی۔**1968/69**ء کی تحریک کی موجوں پر سوار ہو کر پیپلز پارٹی معتبر و مقبول ہو چکی تھی۔بھٹو نے سوشلزم کے نفاذکیلئے نعرہ بلند کیا ،اسے کچھ لوگوں نے ایک' خطرناك انقلابی' قراردے دیا ۔لیکن سب سے سنجیدہ بورژوا جریدوں کے نزدیک ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔'دی ٹائمز'نے اپنے قارئین کو سنسنی خیز مواد فراہم کرنے کے ارادے سے ایک رپورٹر کو بھٹو سے انٹرویو کرنے کیلئے بھیجا ۔اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا''کراچی میں اپنے گھر میں سگار پیتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا کہ اس کا سوشلزم کا

تصور چین کے سوشلزم کا نہیں بلکہ سکینڈے نیویا کا سا ہے۔پاکستان کے چین کے ساتھ جو قریبی تعلقات قائم ہیں وہی بہت ہیں‘‘۔(دی ٹائمز۔ 26 فروری 1968ء) ’اکانومسٹ‘ نے اس کے بارے میں لکھا ’’بھٹو کے بارے میں وہی بات ذہن میں رکھی جائے جو بہت پہلے نہرو کے بارے میں کہی گئی تھی (یعنی یہ روسیوں کے نزدیک چینی ہے ‘‘)۔

1968ء کی تحریک کے کئی لیڈر پیپلزپارٹی میں شامل ہو گئے ۔ 1970ء کے الیکشن میں عوام نے بھاری تعداد میں پیپلزپارٹی کو ووٹ ڈال کر کامیابی سے ہمکنار کردیا کیونکہ وہ سماج میں تبدیلی کے آرزومند تھے اور پارٹی کے سوشلسٹ پرگرام سے متاثرتھے۔ان کے پاس دو ہی متبادل تھے یاتو وہ سرمائے کی ذلت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں یاپھر سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا رستہ اپنالیں مگر بھٹو اور اس کے دائیں بازو کے ساتھی ایسا نہیں کر سکے۔کچھ ریڈیکل قسم کی اصلاحات ضرور کی گئیں مگر وہ سماج کو بدلنے میں ناکام رہے ۔ جاگیرداروں اورسرمایہ داروں سے سمجھوتے کرلیے گئے اور یوں فوج کو اقتدارپر قبضے کا موقع فراہم کردیاگیا ۔

ہر انقلاب کے دوران ایسے مواقع آیاکرتے ہیں جب عوام یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سے دھوکہ کیاجارہاہے جس پر وہ خودہی قدم اٹھانا شروع کردیاکرتے ہیں۔روس میں جولائی 1917ء میں یہی ہواتھا یا پھر جنوری 1919ء میں جرمنی میں سپارٹکسٹ موومنٹ کے دوران بھی ایسا ہواتھا۔مئی ستمبر 1972ء کے دنوں میں بھی یہی ہوا جب پرولتاریہ اپنے مطالبات منوانے کیلئے سڑکوں پر نکل آیا۔یہ تحریک پاکستانی پرولتاریہ کے پیٹروگراڈ، کراچی میں پورے جوبن سے ابھری۔ حکومت نے تحریک کو کچلنے کا تہیہ کرلیا ۔ لانڈھی میں مزدوروں کے ایک مظاہرے پر گولی چلا دی گئی جس سے درجنوں مزدور ہلاک ہو گئے۔اس واقعے سے مزدور مایوس ہوگئے یوں ردانقلاب کیلئے رستہ ہموارہوتا چلاگیا۔ بائیں بازو کے خلاف موقف لے کر پیپلز پارٹی حکومت نے پنڈولم کو دائیں بازو کی طرف دھکیل دیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بحران کے عروج کے وقت پارٹی تقسیم ہوگئی۔ہمیشہ کی طرح سے، یہاں بھی مسئلہ مشرقی پاکستان کی آزادی کا تھابھٹو کی طرف سے اس سوال پر کوئی سمجھوتہ کرنے سے انکار کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستانی بورژوازی اور فوج کی خواہشات اور ان کے مفادات کے تابع ہو چکا ہے۔اس کا نتیجہ ایک ہولناک تباہی کی شکل میں نکلا ۔پہلے پاکستان تقسیم ہوگیا اور بعد میں بھارت کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی اور پھر اس کے بعد بھٹو ناگزیر طورپر فوجی اور رجعتی طاقتوں کے ہتھے چڑھ گیا جنہوں نے اسے بحرانوں کے بھنور میں پھنساتے ہوئے پہلے اقتدار سے الگ کیا اور بالآخر اسے تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ پاکستان کی رجعتی ردانقلابی اشرافیہ نے اسے شکارکرلیاتھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی اپنی مصالحانہ پالیسیوں کا بھی شکارہوا کہ اس نے رجعتی قوتوں کے

ساتھ تعلق استوار کرنے کی کوشش کی تھی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے عوام ایک بارپھر فوجی آمریت کی سیاہ طویل رات کی تاریکیوں میں ڈبودیے گئے۔

انیس سو آٹھاسٹھ کا ورثہ

ضیاء الحق کی آمریت ایوب اور یحییٰ کی آمریتوں سے بدرجہا بدترین تھی۔امریکی سامراج کی مکمل آشیرباد کے ساتھ اس وحشی حکومت نے ظلم اور جبر کی سب حدیں توڑ دیں۔بدترین آمریت کی بدترین شکلیں ، ذلت آمیزبدعنوانی کے ساتھ کراہت انگیز مذہبی منافرت اور بربریت ،یہ اس ضیائی دور کا چہرہ تھا جس نے لاہور کی عظیم روایتی ثقافت کو برباد کرڈالا ،جبکہ مذہبی انتہاپسندی نے دانش و حکمت کو پاتال میں دھکیل دیا۔یہی وہ دورتھا جس میں امریکہ مکمل طورپر پاکستان کا آقا بننے میں کامیاب ہوگیا جس نے اس کی فوج کو افغانستان میں بیدردی سے استعمال کیا۔تب سے اب تک پاکستان و افغانستان کے عوام اس عہد ظلمت کی سزائیں بھگتتے چلے آرہے ہیں۔

طیارے کی تباہی جس میں ضیامرا تھا ،شاید سی آئی اے اور آئی ایس آئی کے کچھ عناصر کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ تھا۔**1988**ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی دوسری بار بے نظیر بھٹو کی قیادت میں برسراقتدار آئی مگراس نے فوج اور حکمران طبقات کے ساتھ مصالحت کی پالیسی اختیار کی جس نے محنت کش طبقے کی مایوسی کو اور بھی گہرا کردیا اور انہیں مزید شکستوں سے دوچارکردیا۔پارٹی قیادت کی طرف سے ’ فری مارکیٹ‘ کی پالیسیوں اور ڈاؤن سائزنگ ،نجکاریوں ،بے روزگاری اور غربت کی شرح میں اضافے نے عوام کی بد قسمتی کو مزید گہرا کرڈالا۔ جمہوریت کے تجربے ایک بارپھر مشرف آمریت کے تسلط کو سامنے لے آئے ۔پاکستان ایک اتھاہ مایوسی کی دلدل میں دھکیلا جا چکاہے۔بے پناہ ذرائع وسائل کے باوجود اس کی معیشت تباہ وبرباد کر دی گئی ہے۔مالیاتی حوالے سے یہ کنگال ہو کردیوالیہ پن کی زد میں آچکا ہے۔غربت اور بے روزگاری انتہاؤں کو پہنچی ہوئی ہے۔امریکی سامراج کی رجعتی پالیسیوں اورزوال پذیر پاکستانی حکمرانوں کی لوٹ مار کی وجہ سے بنیاد پرستی اورتاریکی کی قوتوں کو ابھرنے کے مواقع دے دیئے گئے ہیں۔بربریت اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے جس نے سماج کو نگلنا شروع کردیا ہے۔

پاکستانی عوام کو درپیش خطرات کا ایک بدترین مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب **27**دسمبر**2007**ء کو بے نظیر بھٹو کووحشیانہ طریقے سے قتل کر دیاگیا۔ یہ سب اس خطرے سے نمٹنے کیلئے کیاگیا جو پیپلز پارٹی کی لیڈر کے آنے سے ایک عوامی ابھار کی شکل میں سامنے آ چکاتھا۔عوام اپنے مسائل کے حل کیلئے پیپلز پارٹی کا رستہ دیکھ رہے تھے کہ

شاید ان کی زندگی کی تلخیاں اور ذلتیں کم ہو جائیں‘شاید ان کے بھی دن بدلے جائیں۔ وہ ”روٹی کپڑا اور مکان“کیلئے ترس رہے تھے تڑپ رہے تھے۔رجعتی اور سامراجی طاقتیں مزدوروں کسانوں کی تحریک کو تہس نہس کرنے کیلئے سب کچھ کر جایاکرتی ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت ہر ممکن کوشش کرے گی کہ مزدوروں کسانوں کی **1968/69**ء کی انقلابی روایت کو سرے سے بھلا دیا جائے ۔اگرچہ یہ انہی مزدوروں کسانوں کی روایت ہی تھی جس کی بدولت پیپلز پارٹی کو طاقت بھی ملی اور حکومت بھی۔یہ لوگ سب کچھ بھول چکے ہیں اور کچھ بھی نہیں سیکھ سکے۔یہ پیپلزپارٹی کی سوشلسٹ روایات سے منہ پھیر چکے ہیں،یہ ایسا تاثر دیتے ہیں جیسے پارٹی کی کوئی بنیادی دستاویز ہے ہی نہیں۔یہ تو ایک ایسے وقت اور ماحول میں سرمایہ داری کو بچانے کی کوشش کررہے ہیں جہاں سرمایہ داری کا عالمگیر بحران اسے ناممکن بنا چکاہے۔یہ کیفیت پیپلز پارٹی کو ایک نئی شکست سے دوچارکردے گی جس سے رجعتیت لامحالہ پھر سے مسلط ہوجائے گی۔ان حالات میں آنے والے دنوں میں عوام ایک نیا دھماکہ کر کے دکھا سکتے ہیں،ایک نیا **1968**ء یقینی طورپر سامنے آسکتاہے۔

امریکی فلسفی جارج سنتیانا نے کہاتھا کہ ’جوتاریخ سے کچھ نہیں سیکھتا ،بالآخر اسے دہرانے پر مجبورہوجاتا ہے‘۔میرااستاد اور کامریڈ ٹیڈگرانٹ اس مقولے کو بہت اہمیت دیا کرتا تھا۔جتنا تاریخ کو جاننا آج ضروری ہوچکا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا‘خاص طورپر انقلابات کی تاریخ۔پاکستان کا **1968/69**ء کا انقلاب بھی بیسویں صدی کے عظیم واقعات میں سے ایک تھا۔یہ تاریخ کئی قیمتی اور اہم اسباق سے بھری ہوئی ہے اور لال خان کی یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے ،انہی اہم قیمتی اسباق کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ہر انقلابی کیلئے لازمی ہے کہ وہ انتہائی غور کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

آج **1968/69**ء کی روایات کو مارکسی رحجان ”طبقاتی جدوجہد“بھرپور قوت وتوانائی کے ساتھ سامنے لا رہا ہے۔ **1980**ء میں ہالینڈ میں جلا وطن ایک گروپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی،اب ”طبقاتی جدوجہد“، خاص طورپر پچھلے دس سالوں میں خاطر خواہ قوت اور اثرات کا حامل ہو چکا ہے۔یہ پاکستان میں واحد حقیقی انقلابی رحجان ہے جس نے وسیع عوامی بنیادیں تعمیر کر لی ہیں۔لال خان کی قیادت میں،اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ میرا دوست میرا کامریڈ ہے،اس رحجان نے مستقل مزاجی کے ساتھ اصولوں پر کاربندرہتے ہوئے الٹرا لیفٹ فرقہ پرستی اور بے اصول موقع پرستی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

پاکستان کے لوگوں کے سامنے دو راستے ہیں؛سوشلزم یا پھر بربریت ۔”طبقاتی جدوجہد“اورعالمی مارکسی رحجان ایک ساتھ مل کر پاکستان ،برصغیر اور ساری دنیا میں سوشلزم کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ **1968/69**ء کے عظیم انقلاب کو برپا کرنے والے بہادر مزدوروں کسانوں اور نوجوانوں کو سب سے بہترین خراج تحسین صرف یہی ہے کہ

ہم اس جدوجہد کو جاری رکھیں اور اسے ایک سوشلسٹ فتح تک لے کر جائیں۔ہم وعدہ کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایسا کر کے رہیں گے۔

ایلن وڈز

لندن 20 اکتوبر 2008ء

ایک انقلابی عہد
انقلابی تحریکوں سے سرشار دنیا

”جو عناصر ایک بے مثال معاشی عروج کو پیدا کررہے
تھے وہی عناصر تھے جو معاشی بربادی اور سماجی بغاوتوں کے
ابھرنے کے سامان بھی پیدا کرتے جارہے تھے“
(ٹیڈ گرانٹ،2006-1913ء)(1)

انقلابی ادوار تاریخ کے غیر معمولی لمحات ہوا کرتے ہیں۔یہ روزروز کا معمول نہیں ہوا کرتے۔ 1968/69ء کے دو سال بھی انسانی تاریخ کا ایسا ہی ایک دور تھا۔یہ کیفیت صرف پاکستان کی ہی نہیں تھی کہ عوام کے انقلابی ابھار کی سرکش موجوں نے 7نومبر1968ء سے لے کر 26 مارچ 1969ء کو نا قابل شکست ایوب آمریت کے خاتمے تک جدوجہد کی فقید المثال تاریخ رقم کرتے ہوئے ریاست کو چیلنج کردیا تھا بلکہ تحریک سوشلسٹ انقلاب کی منزل کے قریب پہنچ گئی تھی۔یہ وہ لمحے تھے جب سارے کرہ ارض پر ،ہر براعظم پر انقلابی تحریکیں چھائی ہوئی تھیں۔

دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد دنیا بڑی انقلابی تحریکوں کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ یالٹا، تہران اور پوٹس ڈیم میں سٹالن' روزویلٹ ،ٹرومین اورچرچل کے مابین ہونے والے معاہدے ان تحریکوں کے ساتھ غداری کے مترادف تھے۔ان معاہدوں کے بعد مزدورتحریکوں کی کمیونسٹ قیادت نے انقلابات کے ساتھ غداریاں کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو ان سماجوں میں اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کا موقع فراہم کردیا۔بھارت' اٹلی' فرانس اور جرمنی اس کی بڑی مثالیں ہیں۔تاہم بعد از جنگ کے سرمایہ دارانہ نظام کے عروج اوراس کے نگران ونگہبان کے طورپر امریکی سامراج کے ابھار،اور اس کے ساتھ ہی سٹالن زدہ سوویت یونین میں ہونے والی ترقی نے مشرقی اور مغربی یورپ سمیت جدید سرمایہ دارملکوں میں ایک ٹھہرائو کی کیفیت پیداکردی تھی۔ اسی دوران ہی تیسری دنیا اور سابقہ نوآبادیاتی ملکوں میں سامراجی استحصال کی شدت میں اتنا اضافہ ہو چکاتھا اور ان ملکوں کی مقامی بورژوا قیادت اتنی بدعنوان ہو چکی تھی کہ انقلابی ابھاران ملکوں میں ابھرتے رہے اورکئی ایک ملکوں میں انہوں نے سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔

ان میں سب سے اہم 1949ء میں ہونے والا چین کا انقلاب تھا۔مارکسی نقطہء نظر سے یہ 1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعدانسانی تاریخ کا دوسرابڑا واقعہ تھا تاہم یہ کلاسیکل

مارکسی بنیادوں پر رونمانہیں ہواتھاجیساکہ روس میں لینن' ٹراٹسکی اور بالشویک پارٹی کی قیادت میں ہوا تھا۔ 1949ء کا چینی انقلاب جو کسانوں کی سرخ فوج کے ذریعے برپا ہواتھا سوشلزم کی ایک شکل تھی جس میں محنت کش طبقے کا کوئی نمایاں مرکزی جمہوری کردار نہیں تھا جس کے ذریعے منصوبہ بند معیشت کو چلایاجاتا۔جس طرح سے روس میں ہواتھا جہاں کم از کم پہلے پانچ سے سات سالوں تک معیشت کی منصوبہ بند ی میں مزدوروں کا کردار مرکزی تھا۔پیکنگ کی نئی حکومت کے خدوخال 1917ء کے روس سے نہیں بلکہ 1949ء کے بگڑے ہوئے سٹالنسٹ روسی ماڈل سے مشابہت رکھتے تھے۔ 50 اور60کی دہائیوں میں ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کے اندر انقلابات کے ذریعے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو اکھاڑپھینکا گیا۔اگرچہ ان کے ماڈل بھی سٹالنسٹ روس یا مائواسٹ چین کی طرز پر ترتیب دیے گئے تھے اور سماجی تبدیلیوں کا عمل بھی گوریلا کاروائیوں یا پھر انقلابی فوجی افسروں کی بغاوتوں کے ذریعے سرانجام دیاگیاتھا۔ان انقلابات نے جو شکل اور نوعیت اختیار کی ان سے پرولتاری بوناپارٹسٹ ریاستیں سامنے آئیں۔ جن ممالک میں اس قسم کی مخصوص تاریخی شکلیں ابھر کر سامنے آئیں ان میں چین ، کیوبا، ویتنام، لائوس، کمبوڈیا،شام،ایتھوپیا،یمن ،موزمبیق،انگولا ،صومالیہ ،افغانستان سمیت کچھ اور ملک ہیں جو ان سے کچھ مختلف رہے۔خطرناک حد تک افسرشاہانہ بگاڑ کے باوجود ان حکومتوں کا کردار ترقی پسندانہ تھا کیونکہ انہوں نے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو اکھاڑ دیا تھا۔ انہوں نے کم سے کم سرمائے کے حاوی کردار اور مرکزی معیشت پر سے نجی ملکیت کا خاتمہ کردیاتھا۔لیکن یہاں ایک سوویت مزدور جمہوریت کی کمی اور" ایک ملک میں سوشلزم "کے تنگ نظر متعصب نظریے کی بدولت اور اس سے بھی بڑھ کر ان ملکوں کے روس یا پھر چین پر بھاری انحصار نے انہیں بھی روس اور مشرقی یورپ میں سٹالنزم کے انہدام کے بعد منہدم ہونے پر مجبور کر دیا۔

مگر اس سب کے باوجود بھی جنگ کے بعد کے عرصے میں انقلابات کا سلسلہ کسی طور نہیں رکا، کئی جگہوں پرنوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ملکوں کے اندر یہ تحریکیں قومی آزادی کی جکڑبندیوں سے بھی باہر نکل چکی تھیں۔ان ملکوں میں یہ تحریکیں "قومی جمہوری انقلاب"کی حدودوقیود پھلانگ گئی تھیں۔سلطنت روم کے زوال کے بعد نسل انسانی کی شاید یہ سب سے بڑی تحریک تھی ۔ اپنی وسعت اور تاثیر میں یہ اتنی شدید تھی کہ سامراجی تسلط کو اس سے بڑے چیلنج کا شایدہی کبھی سامناکرناپڑاہو۔کسی حد تک بڑے ملکوں میں جہاں ماسکو یا چین نواز کمیونسٹ پارٹیاں اتنی بڑی نہیں تھیں،یاجہاں وہ ان تحریکوں کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں،اور ان تحریکوں کو قومی جمہوری انقلاب تک ہی محدود کرنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہی

تھیں وہاں ایک نئے سیاسی مظہر کا جنم ہوا۔یہ نیا مظہر پاپولرازم تھا۔

ارجنٹائن سے مصر تک اور انڈونیشیا سے لے کر پاکستان تک پاپولرازم جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا چلا گیا۔یہ بنیادی طور پر بائیں بازو کی قیادت کی سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی ناکامی کا ہی نتیجہ اور عکاس تھا۔جو ایک طرف قومی جمہوری انقلاب کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی تو دوسری طرف قومی بورژوازی کی اپنے فرائض پورے کرنے میں نااہلی کی وجہ سے سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکی۔ جبکہ ان ملکوں کے عوام خود کو محرومیوں،غربت ،سرمایہ دارانہ استحصال اور سامراجی لوٹ مار سے نجات دلانے کی جستجو میں تڑپ رہے تھے۔ ان ملکوں میں چلنے والی تحریکوں پر حاوی ہونے والی مقبول قیادت زیادہ تر فوجی اشرافیہ کے اندر سے ہی برآمد ہوئی تھی۔کم از کم ان کی صلاحیتیں سٹالنسٹ لیڈروں سے زیادہ تھیں جن کی مدد سے وہ ان تحریکوں کے مزاج اور کردار کو سمجھ رہے تھے۔اوریوں یہ مقبول لیڈر، بائیں بازو کی روایتی قیادت کے مقابلے میں ان بڑی عوامی سرکشیوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے میں بھی کامیاب ہو رہے تھے۔مگر یہ مقبول قیادت کسی طور مارکسزم اور انقلابی سوشلزم سے آگاہی نہیں رکھتی تھی یاپھر ان سے واقفیت انتہائی کم اور نہ ہونے کے برابر تھی۔وہ عوامی تحریکوں اور ان کی جدوجہد کی شاندار صفات اور جوش وجذبے سے متاثرہوتے چلے جارہے تھے۔مارکسزم سے اپنی بنیادی ناواقفیت کے باوجود یہ لیڈر سوشلسٹ قراردیے جانے لگے کیونکہ انہوں نے ریڈیکل انقلابی نعرے اور مطالبے اپنالیے تھے جو عوام کے انقلابی مزاج کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اور جو سماج کو بدلنے کی لگن میں تاریخ کے دھارے میں متحرک ہو چکے تھے۔نیچے سے عوام کے شدید دباؤ نے ان مقبول لیڈروں کو ریڈیکل اقدامات کرنے پر مجبور کردیا جن میں بڑے پیمانے پر نیشنلائزیشن،سنجیدہ زرعی اصلاحات جیسے کچھ اور اقدامات تھے جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو ہلا کر رکھ دیا مگر یہ ریڈیکل اقدامات نظام کو اکھاڑپھینکنے کیلئے نہیں کیے گئے تھے۔

مصر

ان لیڈروں میں سے ایسے بھی تھے جو سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کی منزل تک اپنا سفر لے جانا چاہتے تھے۔مصر میں کرنل جمال عبدالناصر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھاجو **1956**ء میں برطانیہ' فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کو شکست دینے اور نہر سویز کو نیشنلائز کرنے کے بعد ساری معیشت کوہی نیشنلائز کرناچاہتاتھا۔سویزجنگ کے دوران سامراجیوں کو مصری فوج کی طرف سے انتہائی دلیرانہ جوابی کاروائی کا سامناکرناپڑا جس کی قیادت پاپولسٹ لیڈر جمال کررہاتھااور جس کے پیچھے اس کی پرجوش عوام اپنے جذبے اور ولولے سمیت متحرک تھی۔سویز

جنگ 29اکتوبر 1956ء کو شروع ہوئی تھی،یہ برطانیہ‘ فرانس اوراسرائیل کا ایک مشترکہ منصوبہ تھا جس کا مقصد حکومت کو گرانا اور جمال کو اقتدار سے الگ کرنا تھا۔مگر سامراجی اپنے مقاصد میں بری طرح ناکام رہے۔اور ان کو سمجھ آگئی کہ وہ دن چلے گئے جب یہ اپنی کسی بھی نوآبادیات میں اپنی مرضی مسلط کرتے تھے اور جو کہتے تھے وہی ہوتاتھا۔

1955ء سے لے کر 1957ء تک جمال نے مصر کے سب غیر ملکی بینکوں اور انشورنس کمپنیوں سمیت کئی دوسرے اداروں کو نیشنلائز کرلیاتھا۔طاقت کی اس مرکزیت کو دیکھتے ہوئے جمال چاہتاتو انقلاب کر سکتا تھامگرجب اس نے اپنا نمائندہ روس بھیجا اوران دنوں روس کے قائد برزنیف سے اپنے اقدامات کیلئے منظوری اور امداد چاہی تو اسے بری طرح سے جھاڑ دیاگیا ۔ برزنیف نے قراردیا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مکمل خاتمے کا قدم اٹھانے سے (خواہ یہ ایک بگڑی ہوئی سٹالنسٹ شکل میں ہی تھا)مشرق وسطیٰ کے اندر طاقتوں کا توازن خراب ہوجائے گا۔اور اس کی وجہ سے بہت مشکلات کھڑی ہوجائیں گی۔پہلے ہی سرد جنگ کے باعث امریکہ روس کے مابین معاملات اچھے نہیں جارہے ۔

روس اور چین دونوں ملکوں کی قیادت نے کئی نوآدیاتی انقلابات کے ساتھ اسی قسم کا کردار ادا کیا۔ مصر اپنے پرولتاریہ اور اپنی معیشت کے اعتبار سے مشرق وسطیٰ کا ایک انتہائی اہم ملک تھا اور ہے۔ اس ملک میں اگر سرمایہ داری کو ختم کرکے وہاں منصوبہ بند معیشت قائم کر دی جاتی ، اگرچہ یہ بالائی سطح سے متعارف کرائی جاتی،تو اس سے پورے خطے میں معیاری تبدیلی واقع ہو سکتی تھی۔یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح ”قومی سوشلزم“نے تباہ کن کردار اداکیا۔سرمایہ دارانہ نظام کے بچ جانے سے مصر میں سماجی بحران شدید ہوتا چلاگیا بلکہ مصری سرمایہ داروں کی نااہلی اور نقاہت نے ناصر کی مقبولیت کوگھن کی طرح چاٹنا شروع کردیااور وہ عوامی تائیدوحمایت سے محروم ہوگیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عرب قومی پرستی کی طرف جھکنے اورعرب قوم پرستی کو فروغ دینے پر مجبورہوگیا۔مگر قوم پرستی کسی طوربھی مصر اور مشرق وسطیٰ کے عوام اور محنت کش طبقے کی محرومیوں اور ضرورتوں کا نہ حل تھی نہ کوئی مداواکر سکی۔اس کا نتیجہ سامنے آنا شروع ہوگیا او ر ناصر کی سماجی وسیاسی کمزوری خارجی سطح پر سامنے آنی شروع ہوگئی۔ 1967ء میں مصر کورجعتی اسرائیل کے ہاتھوں عبرتناک شکست کا سامنا کرناپڑگیا جس نے اپنی پچھلی شکست کا بدلہ بھی لے لیا۔اس حقارت آمیز شکست نے ناصر کواستعفیٰ دینے پر مجبورکردیا،یہ استعفیٰ ریڈیو اورٹی وی پر پیش کیاگیاتھا۔جس پر نہ صرف مصر کے اندر بلکہ پوری عرب دنیا میں ناصر سے ہمدردی رکھنے والے لاکھوں عوام سڑکوں پر نکل آئے جس کے بعد ناصر کو اپنا استعفیٰ

واپس لینا پڑگیا۔تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ پر ہے کہ 1962ء سے 1967ء کے دوران مصر میں ناصر کی اندرونی سطح پر مخالفت میں کافی شدت آچکی تھی۔شروع میں معیشت کے خاطرخواہ حد تک سنبھلنے کے بعد اس میں گراوٹ آنی شروع ہو گئی تھی۔ناصر کی مخالفت کا زیادہ اظہار ملائوں کی طرف سے تھا جن سے ناصر نے سختی سے نمٹا۔1969ء تک اس کی عدلیہ کے ساتھ بھی خاصی مخالفت پیداہوگئی تھی ، اسے بھی ناصر نے سختی سے دبا دیا۔

ناصر 1970ء میں فوت ہوا جس کے بعد انورالسادات نے اس کی جگہ سنبھالی۔اگرچہ اس نے ناصر کی حکومت میں شریک لوگوں کو ہی اپنے ساتھ شامل رکھا تاہم انور نے ناصر کی معاشی پالیسیوں کو توڑنا اور بدلنا شروع کردیا۔یہی نہیں بلکہ اس نے ناصر عہد کے کئی لیڈروں کو موت کے گھاٹ اتارنا بھی شروع کردیا۔وہ ملک کو دوبارہ امریکی سامراج کے زیراثر لے گیا۔یوں ناصر کی انقلابی حاصلات کا ملیامیٹ کر دیاگیا۔یہ ایک ایسا سبق ہے جسے ہم سب کو ،خاص طورپر آج کے وینزویلا کے حوالے سے، سمجھنے کی ضرورت ہے۔تب سے اب تک حکومت مغرب کے حمایتیوں کے ہاتھوں میں چلی آرہی ہے اور جو نہ صرف امریکی سامراج کی گماشتگی کرتے چلے آرہے ہیں بلکہ انہوں‌نے قابل نفرت صیہونی اسرائیلی حکمرانوں کے ساتھ بھی بہتر تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی حزب مخالف جس کا ان کو سامنا ہے وہ"اخوان المسلمین " ہے جو کہ ایک بنیاد پرست مذہبی جماعت ہے ۔بد قسمتی یہ ہے کہ اسے امریکی سامراج نے سویز جنگ کے بعد ناصر سمیت عرب اور مسلم دنیاکے دیگر بائیں بازو کے لیڈروں کے خلاف سرگرم ہونے کیلئے تشکیل دیاتھا۔چالیس سال کے بعد آ ج پھر مصر کے اندر طبقاتی جدوجہد کی نئی لہریں ابھرنا شروع ہو چکی ہیں اوروہاں بائیں بازو کی قوتیں دوبارہ منظم و متحرک ہو رہی ہیں۔

انڈونیشیا

سٹالنزم کی پالیسیوں کا دوسرا بڑا تباہ کن اورالمناک انجام ہمیں انڈونیشیا کے اندروہاں کی کمیونسٹ پارٹی KPI سے تعلق رکھنے والے تقریباًپندرہ لاکھ افراد کے قتل عام کی شکل میں ملتا ہے۔ 1950ء اور1960ء کی دہائیوں میں یہ پارٹی سٹالنسٹ بلاک سے باہر دنیاکی سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی تھی۔1958ء میں اس پارٹی کے کام کی نوعیت اتنی موثر تھی کہ انڈونیشیا کی73%فوج اس کی حمایتی بن چکی تھی۔لیکن یہاں‌پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس پارٹی کو چینی سٹالنسٹ قیادت نے حکم دیا کہ وہ اپنی قوتوں کو

تحلیل کرتے ہوئے خود کوپاپولسٹ بوناپارٹسٹ جنرل سوئیکارنو کی نیشنل پارٹی آف انڈونیشیا **PNI** میں ضم کر دے۔مقبول عام سوئیکارنوکے مائو اور چینی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔وہ سامراج مخالفت میں اپنی شعلہ بیانی کیلئے تو مشہورتھا مگر وہ بس شعلہ بیان ہی تھا اور وہ سرمایہ داری کے ساتھ جڑا رہنا چاہتاتھا۔مگر وہاں کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت کی وجہ سے انقلابی ابھار سراٹھارہاتھا۔انتہائی مختصر وقت کے اندر کمیونسٹ پارٹی ایک انقلابی سوشلسٹ پروگرام کا اعلان کرتے ہوئے وہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کر سکتی تھی۔مگر پیکنگ کے حکم پر خود کو نیشنل پارٹی میں ضم کرکے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت اپنے ڈھانچوں،کیڈروں اور ارکان کے آگے ننگی ہوچکی تھی۔یہ مہلک غلطی اس وقت اپنے نتیجے سمیت سامنے آئی جب سوئیکارنو حکومت کا اس کی نیشنل پارٹی کے جنرل سیکرٹری جنرل سہارتو نے تختہ الٹ دیا اور ایک وحشیانہ آمریت مسلط کردی۔**1965**ء میں سہارتونے امریکی سی آئی اے کی آشیرباد اور اسلامی بنیاد پرستوں کی معاونت کے ساتھ مل کر جدید انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام کیا۔یہ بھیانک اور مہلک نتیجہ تھا اس سٹالنسٹ مرحلہ وار انقلاب کے نظریے کا' جسے کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت کے ذریعے نوآبادیاتی دنیا کے انقلابات پر مسلط کیاگیاتھا۔سہارتو کی بربریت کی سفاکی اور تحریک کی شکست کے اثرات اتنے بھیانک اور خونریز تھے کہ وہاں کی نوجوان نسل اور محنت کشوں کوجنرل سہارتو کا مقابلہ کرنے اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنے میں **34**سال کا عرصہ لگ گیا۔

یہ کوئی اتفاق یاپھر حادثہ نہیں کہ بیشترملکوں کے اندرہونے والے پرولتاری بوناپارٹسٹ انقلابات میں روس یا چین کی حمایت یافتہ کمیونسٹ پارٹیوں نے تحریک کونام نہاد"جمہوری مرحلے"تک روکے رکھ کر انتہائی رجعتی کردارادا کیا۔یہ ایسا مرحلہ ہوتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام قائم اور مستحکم رہتا ہے۔سٹالنسٹ بائیں بازو کی طرف سے منشویکوں کے متروک و ناکام "دومرحلوں کے نظریے" **Two Stage Theory** پر عمل پیرا ہونے کے لاابالی پن نے ایک خلا پیداکر دیا۔تاریخ اور فطرت دونوں کا اصول ہے کہ یہ خلا کو پسند نہیں کرتے۔اسی سے واضح ہوجاتا ہے اورہم دیکھ سکتے ہیں کہ تاریخ کے اس دور میں چھوڑے جانے والے اس خلاکو پاپولسٹ لیڈروں نے کس طرح پر کیا۔ارجنٹائن میں پیرون،مصر میں ناصر اور پاکستان میں بھٹو اسی خلاکے نتیجے میں ہی منظرنامے پر ابھر کر آئے۔اور سچ تو یہ ہے کہ **1968/69**ء کا انقلاب اور اس کے بعد سامنے آنے والے واقعات پاپولرازم کے مظہر کی مکمل وضاحت کرتے ہیں۔

انقلاب کے ترقی یافتہ ممالک پر اثرات

1968/69ء کے دور کی تاریخی اہمیت یوں بھی ہے کہ سابقہ نوآبادیاتی ملکوں میں برپاہونے والی انقلابی تحریکوں کی باز گشت ترقی یافتہ ملکوں میں بھی سنائی دی جہاں مزدوروں اور نوجوانوں نے تحریکیں شروع کر دی تھیں۔یہ وہ وقت تھاجب بعد ازجنگ کے عرصے کاسرمایہ دارانہ عروج اور پھیلائو زوروں پرتھامگر اس عروج نے ڈرامائی طورپر سست روہوناتھا۔جدید صنعتی ملکوں میںترقی کی دودہائیوں کے مسلسل عروج کے بعداٹلی اورفرانس کے اندر نوجوانوں اور مزدوروں کی تحریکیں شروع ہو گئیں جن کا رنگ روپ انقلابی تھا۔آئرلینڈ میںسول رائٹس موومنٹ پھٹ پڑی تھی اور امریکہ کے اندر نوجوانوں کی تحریک سامنے آگئی۔برطانیہ کے اندر بھی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھایہاں تک کہ جرمنی اور سویڈن جیسے ملک بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔حقیقت یہی ہے کہ سبھی ترقی یافتہ ملکوں میں عوام کی کسی نہ کسی شکل میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔کچھ ہی عرصے بعد سپین' پرتگال اور یونان بھی ان سے محفوظ نہیں رہ سکے جن کے نتیجے میں وہاں آمریتیں ختم کر دی گئی تھیں۔میکسیکو نے بھی ایسے ہی ڈرامائی واقعات دیکھے یہاں تک کہ سٹالنزم کو بھی چیکوسلواکیہ میں تحریک نے گھیر لیاتھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان انقلابی تحریکوں کی اکثریت کی ابتدا اور اٹھان طالبعلموں کی طرف سے ہوئی تھی۔بنیادی طور پریونیورسٹی کیمپس ہی ان تحریکوں کے مراکزبنے ہوئے تھے ۔اس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ طالب علم ہی کسی سماج میں موجود بے چینی کے بڑھتے ہوئے ابھار کا بیرومیٹر ہوا کرتے ہیں۔یہ درختوں کے وہ پتے ہوتے ہیں جو طوفان کی آمد سے قبل سب سے پہلے سرسراتے ہیں۔ لیکن پھر ان تحریکوں کوحقیقی طاقت اور تقویت اس وقت ملی جب محنت کش طبقہ اور عوام جدوجہد اور انقلاب کے اس دھارے میں شریک ہوئے ۔کیفیا ت اور جہتوں میں فرق اور فاصلوں کے باوجودعوام کی نفسیات میں جو بات مشترک تھی وہ سماج کی تبدیلی کی خواہش تھی، وہ استحصال اور ذلتوں' اذیتوں کے حامل نظام کا خاتمہ چاہتے تھے،سماج کی سوشلسٹ تبدیلی ان کی جستجو اورجدوجہدکا محور ومرکز تھی۔ہم کوشش کریں گے کہ حقائق سامنے لاکر اپنے اس دعوے کی سچائی ثابت کریں۔وہ بھی ان واقعات کی روشنی میں جو ان لمحوںمیں پیش آرہے تھے اور جن کے ذریعے یہ تحریکیں اپنا اظہارکررہی تھیں۔اس کی سب سے نمایاں اور جاندار شکلیں اٹلی' فرانس اور خود پاکستان ہیں۔

فرانس۔ مئی 1968ء تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی عام ہڑتال

1968ء میں فرانس میں جو ہوا اس کی شدت اور حدت اس قدر گہری اور اتنی وسیع تھی کہ اس نے نہ صرف فرانس کی ریاست اور حکمران طبقات بلکہ دنیا کے ہر ایوان اقتدار کو ہلا کے رکھ دیاتھا۔یہی نہیں بلکہ اس تحریک کی تاثیر نے دنیا بھر کے آدرش وادیوں‘ انقلابیوں اور تبدیلی کے خواہاں عوام کو بھی امید اورولولے سے مالامال کردیاتھا۔یہ واقعات انقلابی قوتوں اور محنت کش طبقے کی سماجی‘ معاشی اور سیاسی طاقت کو ابھارکر سامنے لے آئے اورانہیں تاریخی واقعات میں عملی شرکت کا موقع فراہم کردیا۔برطانیہ میں ”مارکسی رحجان“ کے بانی ٹیڈ گرانٹ نے فرانس کے مئی1968ء کے انقلابی واقعات پر ایک کتابچہ لکھاتھا ،ہم یہاں اس کا ایک قابل ذکر حصہ نقل کررہے ہیں۔”سینکڑوں فیکٹریوں میں کوئی پرزہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔نہ ہی وہاں پبلک ٹرانسپورٹ کا ایک بھی پہیہ چل پایا۔رجعتی اخبار ایسی سبھی خبروں کو سنسر کر رہے ہیں ،یہی حالت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بھی ہے۔فرانس کے لاکھوں مزدوروں نے اپنے ہاتھ روک لیے ہیں اور سبھی فرانسیسی سرمایہ د ارانہ کمپلیکس بند ہو چکے ہیں۔

یہ ہوتی ہے وہ دیومالائی طاقت جو محنت کش طبقے کے عمل میں آنے سے عیاں ہو تی ہے۔یہ جواب ہے ان مایوس دانشوروں اورمفکرین کے اس غلط واویلے کا کہ محنت کش طبقہ تو بے بس‘ بے حس اور محض چارپیسوں کا غلام ہوتاہے وغیرہ وغیرہ۔جب سیاسی طورپر ناخواندہ مزدور بھی یہ دیکھتے اور سیکھتے ہیں کہ ان کے اپنے مزدوربھائی اقتدارمیں آنے والے ہیں لیکن فرانسیسی مزدور اورٹریڈیونین قیادت کی بزدلانہ ، نیم دلانہ پالیسیوں کی وجہ سے ایسانہیں ہوسکا۔ یہ وہ سبق ہے جو فرانس کے واقعات کا حاصل ہے جنہوں نے فرانس کے حکمران طبقات سمیت دنیا بھر کے استحصالیوں کو ہلاکے رکھ دیاتھا“۔(2)

یہاں ہم پھر دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح طالبعلموں نے انقلاب کے شعلے کو جنگل کی آگ میں بدل دیاتھا۔انقلاب کی وہ لہر جس نے کا م چھوڑہڑتالوں اور فیکٹریوں پر قبضوں کی مہم کا آغاز کیاتھا وہ طالبعلموں کی طرف سے ہی شروع کی گئی تھی۔یہ لڑائی اس وقت شروع ہوئی جب طلبہ سوغبونے Sorbonne یونیورسٹی میں اپنی ایک میٹنگ کر رہے تھے جس پر پولیس نے وحشیانہ حملہ کردیا ،ایسا جرمن تسلط کے بعد پہلی بارہوا تھاکہ پولیس کسی یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔اس کے بعد طلبہ

اور پولیس کے مابین جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

لندن کے جریدے ڈیلی ایکسپریس کے مطابق”پیرس کی 80%آبادی طالبعلموں کے ساتھ مل گئی تھی۔سینئر سیکنڈری سکول طلبہ سکولوں سے باہر نکل آئے تھے اور استادوں کو مجبور کردیا گیا کہ وہ زبردستی کلاس رومز کو تالے لگا کر طلبہ کو اندر بند رکھیں۔لیکن پابندی کی یہ چال بھی کامیاب نہ ہو سکی اور اساتذہ بھی طلبہ سمیت مزدوروں کے ساتھ شامل ہوگئے ۔سب سے اہم اور قابل غور پہلو یہ ہے کہ طلبہ مسلسل محنت کشوں کا حوصلہ بڑھاکر ان کو متحرک‘منظم اور جدوجہد کیلئے بر سرپیکار کرتے رہے۔فرانسیسی کہاوت کہ ” ہم نے اس سے اچھے دن کبھی نہیں دیکھے “ان دنوں سچ بن کر سامنے آگئی تھی۔

طلبہ کے عزم و حوصلے اور کامیابیوں سے ہمت اور جذبہ حاصل کرنے والے نوجوان فیکٹری مزدوروں نے ان کے ساتھ مل کر 13مئی کو لاکھوں کا مظاہرہ کردکھایا جس سے رینالٹ Renault سمیت کئی فیکٹریوں میں کام چھوڑ ہڑتال کی ابتدا کر دی گئی۔ 13مئی کی یہ عام ہڑتال ایک معیاری موڑ ثابت ہوا جس نے سب کچھ بدل کر اور سب کو ہلا کے رکھ دیا۔اس دن لاکھوں مزدور اور نوجوان پیرس کی سڑکوں پر نکل آئے۔کہا جاتاہے کہ اس مظاہرے کے شرکاء کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔”اس اجتماع نے ماضی کی ہر چیز کو تبدیل کر کے رکھ دیاتھا۔سفید کوٹوں میں ملبوس ہسپتالوں کے ہر شعبے سے لوگ اس میں شریک تھے جن کے ہاتھ میں بینر تھے اور جن پر یہ سوال درج تھا کہ وہ زخمی کہاں ہیں جن کو غائب کر دیا گیاہے۔اس میں ہر فیکٹری‘ ہر ادارے‘ ہر شعبے کے لوگ شریک تھے۔ریلوے مزدور،پوسٹل مزدور،ایرپورٹ مزدور، پرنٹر، میونسپل مزدور،میٹل مزدور،سیلز مین،الیکٹریشن،وکلا،سیور مین،بینک ملازمین ، تعمیراتی مزدور، گلاس اور کیمیکل مزدور،ویٹرز،پینٹرز،گیس مزدور،شاپ گرلز،انشورنس کلرک، سڑکوں کی صفائی کرنے والے،فلم سٹوڈیو آپریٹرز،بس ڈرائیور،اساتذہ،نئی قائم شدہ پلاسٹک انڈسٹری کے مزدور‘ لوگ ہی لوگ‘ انسانوں کا ایک سیلاب ہر طرف نظر آرہا تھا۔جدید سرمایہ دارانہ سماج کے یہ انسان جو کسی گنتی میں نہیں آرہے تھے،یہ ایک ایسی مجتمع طاقت تھی جو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور یہ کر بھی گزرتی لیکن اگر اس کی درست قیادت ہوتی تو “۔(3)

یونینوں کی قیادت نے سوچا کہ ہم نے میدان مارلیا اور طاقت دکھا دی ہے اور بس یہی کافی ہے۔ ان کی عام ہڑتال کو آگے لے جانے اور اسے پھیلانے کی نیت ہی نہیں تھی۔انہوں نے مظاہرے کو اپنی طاقت کا اظہار سمجھا اور بس اسی پر اکتفا کرتے ہوئے ختم کرنا مناسب سمجھا ۔لیکن جب تحریک شروع ہوتی ہے تو پھر یہ اپنے رستے خود متعین کرتی ہے۔اس عام ہڑتال نے ایک چھوٹی جھیل میں بڑے اور بھاری پتھر کے گرنے کا

کام کردیاتھا۔ اگرچہ یونینوں کے ساتھ صرف ساڑھے تین لاکھ مزدور ہی وابستہ تھے جبکہ مظاہرے میں دس لاکھ افراد شریک ہوئے ،اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد ہڑتالوں اور فیکٹریوں پر قبضے کی ایک مہم سارے فرانس میں پھیلتی چلی گئی۔یہ لہر فرانس کے ایک کونے سے دوسرے تک پھیل گئی ۔ صرف صنعتی ادارے ہی نہیں بلکہ بینک ملازمین ،وائٹ کالر مزدوروں اور کیٹرنگ ورکرز نے اس ہڑتال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔مزدوروں کا صرف 30%یونینوں میں منظم تھا مگر اس ہڑتال میں 50%سے زیادہ مزدور شریک ہوئے جو مزدوروں کی انقلابی توانائی اور صلاحیت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہر انقلاب کی طرح اس میں بھی سماج کے اب تک سیاسی طورپرانتہائی پسماندہ ودرماندہ، بے یار ومددگارچلے آنے والے حصے بھی اپنے پائوں پر کھڑے ہو چکے تھے ۔غریب کسانوں نے نانتیس Nantes شہراور دوسرے کئی قصبوں کے اردگرد طلبہ اورمزدوروں کی حمایت میں بغاوتیں کر دی تھیں۔(4) اور یہ سب مثالی نظم وضبط سے کیاجارہاتھا ۔یہاں تک کہ بورژوا ذرائع ابلاغ نے بھی اس کو تسلیم کیا کہ ”یہ سب گریس لگی ہوئی ایسی مشینوں کی طرح سے تھے جو کام نہیں کر رہی تھیں“۔

اتنا کچھ ہوجانے کے باوجودکمیونسٹ پارٹی اور CGT نے کیتھولک یونینز اور سوشلسٹ Force Ouvriereکے ساتھ مل کروہ کچھ کرنے سے انکارکردیا جو نوجوان اور محنت کش چاہ رہے تھے‘اقتدارپر قبضہ۔اس احسان مندی پر ”آبزرور“نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا”اس وقت کمیونسٹ یونینیں اور گال حکومت دونوں ایک ہی چیلنج سے نبردآزماہیں اور دونوں ہی دیوار کے ایک طرف کھڑی ہوئی ہیں“۔رجعتی جریدے Le Figaroنے بھی کمیونسٹ قیادت کی ہوشمندانہ اور مدبرانہ سیاست کو مثالی اور قابل قدر قراردیا۔

نانتیس شہر میں مزدوروں نے پٹرول پمپوں کا کنٹرول سنبھال لیا اور کسی کو بھی پٹرول دینے سے انکار کردیا جب تک کہ ان کے پاس ہڑتالی کمیٹیوں کی طرف سے لکھا ہوا اجازت نامہ نہ ہوتا۔(4) شہر میں صرف ایک پٹرول پمپ پر پکٹ قائم کر دی گئی جہاں ڈاکٹروں کو پٹرول دیاجاتاتھا۔کسان تنظیموں کے ساتھ روابط قائم کرکے غذائی اجناس کی فراہمی کو ممکن بنایا گیا جس کی قیمتوں کا تعین مزدور اور کسان مل کر کیاکرتے تھے۔ منافع خوری سے بچنے کیلئے دکانوں پر سٹکرز لگائے جاتے تھے ”یہ دکان اجازت کے ساتھ کھولی گئی ہے؛ہماری قیمتیں یونینوں کی طے کردہ ہیں جومسلسل ان کی نگرانی کرتی ہیں“۔ان سٹکروں پر CGT,CFDT اور FOیونینوں کے دستخط ہوتے تھے۔عام دنوں میں 80سینٹ میں فروخت ہونے والا دودھ50سینٹ میں بیچا جارہاتھا۔آلو 70سینٹ سے کم ہوکر 12سینٹ میں بیچاجارہاتھا۔گاجر بھی اسی طرح 80سے 50 پر آگئی تھی اور یہی کیفیت دیگر اشیا کی بھی تھی۔

طالبعلم ،اساتذہ،پیشہ وارانہ خدمات سرانجام دینے والے،کسان،سائنسدان یہاں تک کہ برگر بیچنے والی لڑکیاں بھی جدوجہد میں شریک ہوگئے تھے۔پیرس میں طلبہ نے SORBONNE پر قبضہ کر لیا،جبکہ Theatre de L,Odeon پر 2500طلبہ نے قبضہ کرلیا اور سکولوں کے طلبہ نے سکولوں کو اپنے قبضے میں لے لیاتھا۔اس دوران جب سکول بند ہوچکے تھے طلبہ اساتذہ نے مل کر نرسریوں ، پلے گروپوں اور مفت کھانوں سمیت ہڑتالی طلبہ کیلئے سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کردیا۔اور یہ صرف طلبہ ہی نہیں تھے ،سماج کی ہر پیشہ ور پرت انقلاب کے اس دھارے میں شریک اور ملوث ہوچکی تھی۔یہاں تک کہ خلابازوں نے ایک رصد گاہ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔سیکلے Saclayمیں ایک نیوکلیر ریسرچ سنٹر میں بھی ہڑتال کر دی گئی۔اس ادارے میں 10000لوگ کام کرتے تھے جن میں محققین ،ٹیکنیشن انجینئرز اور گریجوایٹ سائنسدان شامل تھے۔یہاں تک کہ گرجے بھی اس کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔لاٹن کوارٹر کے علاقے میں کیتھولک نوجوانوں نے ایک گرجے کا کنٹرول سنبھال لیا اور عوامی مسائل پر بحث شروع کر دی۔

پیرس میں ہنگامے جاری رہے جن میں طلبہ اور مزدور پولیس کی شیلنگ اور لاٹھیوں کا بہادری سے مقابلہ کرتے رہے۔صرف ایک واقعے کے دوران 795گرفتاریاں جبکہ 456 افرادزخمی ہوئے۔ مظاہرین نے پیرس بورس(سٹاک ایکسچینج)کو آگ لگانے کی کوشش کی جو کہ سرمایہ داری کی ایک نفرت انگیز علامت تھی۔ لیون میں ایک پولیس کمشنر ایک ٹرك کے نیچے آکر کچلا گیا۔ محنت کش جب بھی کبھی متحرك ہوا کرتے ہیں تو معاملات عام ہڑتال کی روٹین سے باہر نکل جایا کرتے ہیں۔ان سب میں ایک انتہائی اہم عنصر ذرائع ابلاغ کا تھا ۔عام طورپر یہ ریاست کے ہاتھوں استعمال ہونے والاطاقت کا ایک آلہ بنے رہتے ہیں۔لیکن پھر یہ ریڈیو اور ٹیلیویژن محنت کشوں کی بدولت ہی کام کرتے ہیں ۔25مئی کوORTFریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشن ہڑتال پر چلے گئے جب رات 8بجے کی خبریں نشر نہیں ہوئیں۔صحافیوں اور پبلشروں نے چھاپہ خانوں پر ایک طرح سے مزدووں کا کنٹرول قائم کردیا۔بورژوا جریدوں کو اپنے اداریے ”چھان بین “کرانے پڑگئے تھے اور ورکرز کمیٹیوں کی اجازت کے ساتھ چھاپنا پڑجاتاتھا۔قومی اسمبلی میں یونیورسٹی کے بحران اور Quartier Latin میں ہونے والی لڑائیوں پر بحث شروع کر دی گئی۔لیکن یہ ساری بحثیں غیر ضروری اور غیر متعلقہ ہو چکی تھیں ۔طاقت ان کے ہاتھوں سے پھسل کر سڑکوں پر منتقل ہوچکی تھی۔24مئی کو صدر ڈیگال نے ریڈیو' ٹیلیویژن پر آکے ریفرنڈم کرانے کا اعلان کیا۔مگر اس کا ریفرنڈم محنت کشوں کی تحریک تلے آکے دھرا رہ گیا۔جنرل ڈیگال کو اس کیلئے بیلٹ پیپر چھپوانا محال ہوگیا کیونکہ فرانسیسی پرنٹنگ مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی جبکہ ڈیگال نے یہ بیلجیم سے چھپوانے کی کوشش کی جسے

وہاں کے مزدوروں نے شائع کرنے سے انکار کردیا۔ بین الاقوامی یکجہتی کی صرف یہی ایک مثال نہیں تھی بلکہ جرمن اوربیلجیمکے ٹرین ڈرائیوروں نے بھی اپنی اپنی سرحدوں پرٹرینیں روک دی تھیں تاکہ فرانس کی ہڑتال ٹوٹنے نہ پائے۔

ہر سنجیدہ سیاسی مبصر نے اس صورتحال میں موجود انقلابی کیفیت کا ذکر کیا"فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لینے والے طوفانی واقعات کے پیچھے محض سنجیدہ نوعیت کے تحفظات یاضرورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ نظام حکومت کے خلاف عمومی غم وغصے کا اظہار ہے۔ مزدور صرف معاشی سہولتوں کا ہی تقاضا اور مطالبہ نہیں کر رہے ہیں یا یہ کہ اوقات کار کم کیے جائیں،بلکہ یہ طلبہ کی طرح سے انقلابی کمیٹیاں تشکیل دیتے جارہے ہیں"۔(5)

پر امن سماجی تبدیلی

برطانوی بورژوازی کے سنجیدہ جریدے ٹائمز لندن نے بھی فرانس میں ہونے والے واقعات کے انقلابی ہونے کا اعتراف کیا۔"فرانس کے اندر ایسے حالات پیدا ہوچکے ہیں جو باآسانی کسی بھی کامیاب نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ مزدوروں نے آخری حد تک جانے کا تہیہ کرلیا ہے۔درمیانہ طبقہ، خاص طورپر اس کی نچلی پرتیں ہڑتال کے ساتھ خاصی ہمدرد ہو چکی ہیں۔کئی جگہوں پر تو یہ نہ صرف شامل ہیں بلکہ آگے آگے بھی ہیں۔خصوصاًبحری جہازوں پرجہاں افسران تک بھی اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہڑتال میں شامل ہوچکے ہیں"۔(6) ٹائمز کو بھی تسلیم کرناپڑگیاتھا کہ طاقت محنت کش طبقے کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی ہے جو نظام کو بدلنے کیلئے تیار ہو چکے ہیں۔ "فیکٹریوں،بندرگاہوں،کانوں اورسڑکوں پر حقیقی طاقت محنت کشوں کے ہاتھوں میں آ چکی ہے۔دوہری طاقت کی ایک کلاسیکل مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔کیفیت یہ ہوچکی ہے کہ قومی اسمبلی میں ہونے والی بحث تک بھی مزدوروں کی اجازت سے ٹیلی ویژن پر نشر کی گئی ہے اور اس کا اعتراف خود ڈیگال کے ایک وزیر نے کیا ہے۔حکومت کی روایتی طاقت کے ادارے فوج اور پولیس بھی اب اعتبار کے قابل نہیں رہے۔پولیس تو خود ہی انقلاب کے تندو تیز شعلوں کی گرفت میں آ چکی ہے۔ان کی یونین نے حکومت کو ایک انتباہ جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پولیس افسران ہڑتالی مزدوروں کے موقف کی مکمل تائید کرتے ہیں اگرچہ وہ قانونی تقاضوں کی وجہ سے اس مزدور تحریک میں شامل نہیں ہو سکتے مگر پبلک اتھارٹیز پہلے کی طرح سے پولیس کو مزدوروں کی اس جدوجہد کے خلاف استعمال نہیں کر سکیں گی(7) (اگر کوئی تصادم ہوا بھی تو)کئی

سنجیدہ حصے، اگر اکثریت نہ بھی سہی ،مزدوروں کے ساتھ جا کے شامل ہو جائیں گے۔اگر فوج نے مداخلت کی کوشش کی تو اس میں بھی اوپر سے نیچے تک پھوٹ پڑجائے گی ۔اس کا امکان ایک فوجی نے ظاہر کیا ہے جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ طلبہ اور مزدوروں پر حملہ کرے گا تو اس نے جواب دیا کبھی نہیں خواہ ان کا طریقہ کار کوئی بھی ہو میں ایسا کبھی نہیں کروں گا کیونکہ میں خود بھی ایک مزدور کا ہی بیٹا ہوں"۔(8) ٹیڈ گرانٹ اس بارے میں لکھتا ہے کہ کیا اس سے بھی زیادہ بہتر اور مناسب موقع کوئی اور ہوسکتا تھا کہ جب محنت کش طبقہ آرام اور سکون کے ساتھ اقتدار پر قبضہ کرسکتا ہو!

رجعتیت اس مرحلے پر انتہائی کمزور پڑ چکی تھی اور اگر فاشسٹ اور فوجی جرنیل بدمعاشوں کے گروہوں کو تیار کر کے انہیں مزدوروں کے خلاف بھیجتے بھی تو ان کو پہلے پہل ہی ورکرز ڈیفنس گارڈز کے ذریعے چپ کرادیا جاتا اور پھر مسلح عوام ان سے خود نمٹ لیتے۔ حکومت اور اس کی کٹھ پتلی قومی اسمبلی ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔اگر کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ایک اونس جرات بھی ہوتی اور وہ اپنے کارکنوں، عہدیداروں یا پھر عوام کی توانائی سے لیس ہوتی تو اس کی طاقت اور اثرانگیزی میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہوتا اور محنت کشوں کی تبدیلی کی جستجو کو اپنی طاقت کا مرکز ومحور بنا سکتی تھی ،وہ بھی انہی کے بنائے ہوئے طاقت کے آلے یعنی ورکرز کونسلوں کے ذریعے ۔

ڈیگال کی سوانح عمری" آخری عظیم فرانسیسی .جنرل ڈیگال کی زندگی"مرتب کرنے والا مصنف سی ولیم لکھتا ہے"25مئی کو ڈیگال کا موڈ انتہائی خراب تھا ،وہ سٹھیا چکا تھا اس کے ایک وزیر کے مطابق اس کے قویٰ کام کرنا چھوڑ چکے ہیں اور وہ اب بوڑھا ہوچکا ہے جبکہ ایک اور وزیر نے کہا کہ وہ بے حس ہوچکا ہے اور اسے کوئی پتہ نہیں چل رہا کہ آگے کیا ہونے والا ہے! 25سے28مئی تک ڈیگال مسلسل اداس و نڈھال کیفیت کا شکار رہا۔ 27مئی تین بجے شام وزراء کی میٹنگ تھی جس کی صدارت جنرل نے کی مگر سب نے محسوس کیا کہ اس کا دل اور دماغ کہیں اور ہی تھے۔وہ بس اپنے وزیروں کو دیکھے بغیر ان پر سے نظریں گھماتا رہا،وہ میز پر اوندھا ہوکر اپنی بانہیں پھیلائے بیٹھا رہا ،اس کے شانے لٹکے ہوئے تھے جیسے وہاں کچھ ہو ہی نہیں رہا تھا...بعد میں ڈیگال نے امریکی سفیر کو ملاقات میں بتایا 'کھیل ختم ہو چکا،کچھ ہی دنوں میں کمیونسٹ اقتدار میں ہوں گے' "۔(9)

ٹائمز لندن اپنے اداریے میں ایک سوال اٹھاتا ہے کہ کیا ڈیگال فوج کو استعمال کر سکے گا؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہاں وہ ایک بار شاید ایسا کر سکے ۔لیکن دوسرے الفاظ میں یہ خونریز تصادم فوج کو اندر سے توڑ کے رکھ دے گا"۔ یہ تبصرہ اپنے وقت کے سرمایہ داری کے سب سے سخت گیر ترجمان جریدے کا تبصرہ

تھا۔اوریہ تبصرہ ان حالات کی مناسبت سے کسی طور بھی غلط نہیں تھا۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنی دیوہیکل تحریک کیوں کر سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے سے رہ گئی؟آخر کس طرح سے سوشلسٹ فتح اتنی بڑی پرولتاریہ جدوجہد کے باوجود ہاتھوں سے پھسل گئی؟اس سوال کا جواب ہم نہیں بلکہ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا سے پوچھتے ہیں جس نے مئی 1968ء کیلئے اپنی انٹری میں لکھا"ڈیگال بحران سے نمٹنے میں ناکام رہا ،نمٹنا تو درکنار، وہ اس کی نوعیت کوسمجھنے سے بھی محروم رہا۔تاہم کمیونسٹ اور ٹریڈیونین قیادت نے اس کو سانس لینے کی مہلت فراہم کردی ۔

یکم مئی 2008ء کو فرانس کے انقلابی واقعات کی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے ایلن وڈز نے اپنے بصیرت افروز مضمون میں حسب ذیل لکھا؛

" ایک 'عام ہڑتال'دوسری ہر قسم کی ہڑتالوں سے اس لئے مختلف ومنفردہواکرتی ہے کہ یہ طاقت کا سوال پیدا کردیتی ہے۔یہ سوال نہیں کہ اجرتوں میں کتنا اضافہ ہواہے بلکہ یہ سوال کہ طاقت کا اصلی محورومرکز کون ہے؟گھرکا مالک کون ہے؟تندوتیز واقعات نے مزدوروں کے شعور کی وسعت اور گہرائی میں برق رفتاری سے اضافہ کردیاتھا۔ان کو ادراک ہو گیاتھا کہ یہ ہڑتال کسی معاشی سہولت یا رعائت کیلئے نہیں بلکہ اس سے بھی بڑے کسی اورمقصدکیلئے کر رہے ہیں۔ان کویہ سمجھ آچکی تھی کہ طاقت تو ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہی ہے اور ان پر وہ کمزوری بھی ظاہر وعیاں ہو چکی تھی جسے ریاست اپنی دائمی طاقت بناکر پیش کرتی چلی آرہی تھی۔ضرورت اس امر کی تھی کہ کام کرنے کی ہر جگہ پر نمائندے منتخب کیے جاتے اور انہیں ہر شہر' ہر قصبے میں ہڑتالی کمیٹیوں کے ساتھ منسلک کر دیاجاتاجو ایک مرکزی کمیٹی تشکیل دے کر اس کے ساتھ جڑجاتیں جو طاقت کو اپنے کنٹرول میں لے لیتی اور پرانے فرسودہ استحصالی ریاستی ڈھانچے کو تاریخ کے کچرے میں ڈال دیتی۔مگر یہ سب نہیں کیاگیا اور یوں محنت کشوں اور نوجوانوں کی انقلابی توانائی کو ہوا میں تحلیل کردیاگیا ایسے جیسے بھاپ پسٹن کے بغیر ضائع ہو جایاکرتی ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ آخرکار مزدورتھک ہارکر اپنے اپنے کام پر لگ گئے جبکہ ریاست نے اپنی طاقت دوبارہ مجتمع کرلی اوراس نے اپنا انتقام شروع کر دیا۔فرانسیسی محنت کشوں کی جدوجہد شکست سے دوچارکر دی گئی تھی مگراس انقلاب کی روایات آج بھی فرانس کے عوام کے دلوں میں زندہ اور درخشندہ ہیں اور ساری دنیا ان کو اب بھی یاد کرتی ہے۔آج سرمایہ دارانہ نظام ایک بار پھر شدید بحران کی زد میں آرہاہے اور پچھلے بیس سالوں سے دبے ہوئے تضادات پھٹ کر سامنے آنے والے ہیں جن کے نتیجے میں سارے یورپ میں بڑی طبقاتی لڑائیاں شروع ہو جائیں گی"۔(10)

یورپ انقلابی موجوں کی زد میں

فرانس کے طوفانی واقعات نے اپنے پڑوسی اور دیگر یورپی ملکوں کو بھی متاثر کردیاتھا۔ یہاں تک کہ وہ ممالک جن کی مزدور تحریکیں اصلاح پسندی کی زد میں آئی ہوئی تھیں اور جو ملک انتہائی ترقی سے مستفیدہورہے تھے ان میں بھی سماج کی تہوں میں موجود تضادات ابھر کرسامنے آگئے تھے۔ عالمی جنگ کے بعد سامنے آنے والے بے نظیرسرمایہ دارانہ عروج کے باوجود اور سوشل ڈیموکریسی کی طرف سے کی جانے والی متعدد اصلاحات کے باوجود طبقاتی تضادات جو سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کا ناگزیر حصہ ہواکرتے ہیں ،وہ اپنا اظہار کرتے ہوئے سامنے آگئے۔یہ بھی کہاجاتا ہے کہ سوشل ڈیموکریٹک حکمرانوں کی طرف سے دی جانے والی یہ مراعات بھی خیرات میں نہیں دی گئی تھیں بلکہ یہ محنت کشوں کی سنجیدہ جدوجہد کاہی نتیجہ تھیں۔جیساکہ مارکس نے قرار دیاتھا کہ ”جونہی اور جب بھی حکمران طبقہ اپنے پائوں تلے انقلابی لرزش محسوس کرتاہے وہ اصلاحات کرنی شروع کردیتا ہے“۔

یورپ میں ہونے والی تیز صنعتی اور معاشی ترقی نے وہاں صنعت اور معیشت کو وسعت بھی دی اور اسے جدید بھی بنایا مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس نے وہاں طبقات کے مابین توازن کو تبدیل کر کے رکھ دیاتھا۔معیشت کی ترقی نے پرولتاریہ کی طاقت‘ میں بھی اضافہ کردیا۔اس نئے طاقتور پرولتاریہ نے **1968**ء کی انقلابی کیفیت میں اپنی طاقت توانائی اور جذبے کا اظہار کر دیا تھا،فرانس کی مئی **1968**ء کی تاریخی جدوجہد نے بعد میں اٹلی میں بڑی مزدور تحریکوں کو جنم دیا۔

اٹلی کا”گرم موسم خزاں“

اٹلی بھی قریبی ممالک میں پیداہونے والی کیفیات سے شدید متاثر ہو رہا تھا۔ **1968**ء میں وہاں ایک طلبہ تحریک متحرک تھی جس کے ساتھ مزدوروں کے کچھ حصے بھی شریک تھے مگر **1969** ء میں اٹلی کا پرولتاریہ اٹھ کھڑاہوا اور اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ہر شکل وصورت کو چیلنج کرنا شروع کردیا۔

1950ء کی دہائی اور **1960**ء کے اوائل میں اٹلی میں جو ریڈیکل معاشی وسماجی ترقی ہوئی اسے ”اطالوی معجزہ“قرار دیاجاتاہے۔یہ ایک نسبتاً کم ترقی یافتہ معیشت کا حامل ملک تھا جہاں صنعت کا زیادہ حصہ اس کے شمال مغرب میں محدودتھامگریہ ایک انتہائی جدید ملک بن گیا۔لاکھوں کی تعداد میں کسانوں کا بڑا حصہ

خصوصاً جنوبی اٹلی سے شہروں کی طرف ہجرت کر گیا اور پرولتاریہ کی شکل میں ڈھل گیا۔ 1948ء میں ایک زرعی ملک اٹلی 1968ء میں زرعی نہیں رہا تھا۔اس کے شہر تیزی سے پھلتے پھولتے اور پھیلتے رہے جس کی وجہ سے سماجی مسائل بھی جنم لیتے چلے گئے۔اٹلی میں آگے پیش آنے والے طوفانی واقعات کی علامتیں 1958/63ء کے مابین ہڑتالوں اور مظاہروں سے برآمد ہونا شروع ہو چکی تھیں لیکن 1969ء میں عروج کو پہنچنے والی تحریک کی ابتدا 1966ء میں انجینئرنگ ورکروں کی ہڑتال سے ہوئی جو بعد میں دیگر شعبوں میں پھیلتی گئی۔اس ہڑتال سے ہی ابتدائی انجینئرنگ ورکرز ہڑتالی کمیٹیاں سامنے آئی تھیں۔ 1967ء میں طلباء کے مظاہرے شروع ہوئے جن کے دوران کئی یونیورسٹیوں پر قبضے ہو گئے۔اسی دوران نوجوانوں اور مزدوروں کی جبلتی وحدت سامنے آتی چلی گئی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور منسلک ہوتے رہے اس وحدت اوریکجہتی نے آئندہ دنوں میں اپنا اظہار کرنا تھا۔

جس معاملے سے تنازعہ شروع ہوا وہ حکومت اور مالکان کے مابین پنشنوں پر اختلاف کی شکل میں سامنے آیا۔1967ء میں یونین نے اس معاملے پر ہونے والی ہڑتال ختم کرنے کی کال دی اور اس کا خیال تھا کہ نیچے تحریک خاموش ہو جائے گی مگر یونین کو آگے چل کے ایک جھٹکے سے دو چار ہونا پڑا۔ 1968ء میں ہڑتالوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس پر یونینوں نے کوشش کی کہ ریفرنڈم کرا کے کام چلالیا جائے مگر نیچے مزدوروں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بغاوت کی پہلی نشانی تھی جو یونینوں کو نیچے اپنے مزدوروں سے ملی۔جس کے نتیجے میں یونینوں کو عام ہڑتال کی کال دینی پڑی جو انتہائی کامیاب رہی جس کی توقع خود یونین قیادت کو بھی نہیں تھی۔اگلی بڑی لڑائی علاقائی اجرتوں کے تنازعے پر شروع ہوئی۔عالمی جنگ کے بعد سے مالکان نے اجرتوں کا ایک نیانظام رائج کیا تھا جس کے تحت جنوب کے مزدوروں کو شمال کے مزدروں کے مقابلے میں کم اجرتیں دی جاتی تھیں ۔1968ء میں مزدوروں نے اس امتیاز کے خلاف مطالبات پیش کیے ۔ نومبر 1968ء میں پنشنوں اور اجرتوں میں امتیاز کے خلاف ایک طاقتور عام ہڑتال کی گئی۔ 1969ء میں مالکان کی فیڈریشن نے اجرتوں میں فرق کو ختم کرنے کا مطالبہ تسلیم کرلیا۔

ہر ہڑتال اور ہر مظاہرے کے بعد حکومت مالکان اور مزدوروں کو سمجھوتے پر مائل ہونا پڑ رہا تھا اور مراعات ملتی جا رہی تھیں جس سے مزدوروں کا اعتماد بڑھتا چلا جا رہا تھا۔مزید حصول کیلئے وہ مزید طلب کرتے چلے گئے۔مزدور طبقے کو اپنی اہمیت اور طاقت کا ادراک ہوتا چلا گیا، اس سارے عمل کے دوران ہی فرانس میں طوفانی واقعات کا ظہور ہوا۔جن کی وجہ سے اطالوی مزدوروں کے اعتماد اور جوش و جذبے کو اور بھی تقویت مل گئی۔اٹلی کے وہ مزدور بھی جو اب تک کسی مظاہرے یا ہڑتال میں شریک نہیں ہوئے

تھے وہ بھی سرگرم عمل ہو گئے۔پسماندہ ترین علاقوں کی فیکٹریاں بھی ہڑتالیں کرنے لگیں۔خواتین کی بہت بڑی تعداد مظاہروں' ہڑتالوں میں شریک ہوتی چلی گئی جو اپنے مرد مزدور ساتھیوں کے جذبے اورحوصلے بڑھاتی رہیں۔اس ریڈیکلائزیشن سے فیکٹری کونسلیں بنتی چلی گئیں جنہیں فیکٹری کے مزدور منتخب کیا کرتے تھے وہ بھی واپس بلائے جانے کے اختیار اور حق کے ساتھ۔ 1969ء کے سرما میں ان کمیٹیوں نے نیچے سے جدوجہد کا آغاز کردیا جس سے روایتی یونینوں کی قیادت کی بالادستی ختم ہوتی چلی گئی۔پہلے پہل فرقہ پرست لیفٹ نے سمجھا کہ شاید اس سے روایتی یونینوں کا خاتمہ ہی ہو گیا ہے مگر یہ ان کی شدیدکج فہمی تھی۔ 1967/68ء کے دوران یونینوں کی ممبر شپ میں دوگنا اضافہ ہواتھا۔نیچے سے ایک انقلابی تحریک کے دباؤ نے یونینوں کی قیادت کو سامنے آنے پر مجبورکردیاتھا۔اور جو کچھ اب تک ''غیر سرکاری'' ہوتا چلا آرہاتھا وہ اب ''سرکاری'' ہوتا جارہاتھا۔ قیادت کو اپنے ورکروں کو مطمئن اور خوش کرنے کیلئے انقلابی تقریریں کرنی پڑگئی تھیں۔انہیں زبانی اور عملی طورپر لیفٹسٹ ہونا پڑگیاتھا۔لیڈرشپ کی اس ریڈیکلائزیشن نے مزدوروں کی بھاری تعداد کو یونینوں کی ممبرشپ کی طرف مائل کردیا کیونکہ وہ جدوجہد کرنے کے موڈ میں تھے۔ٹریڈیونین قیادت ایک ایسے شیر پر سوارہو چکی تھی جس پر سے اترنا محال ہوچکاتھا۔

اٹلی اور فرانس کی تحریکوں میں فرق یہ تھا کہ فرانس میں یہ مکمل عروج تک پہنچ کر فیکٹریوں پر قبضے کر چکی تھی۔سوائے نظام کو اکھاڑ پھینکنے سے ، مزدوروں کے بس میں جو کچھ بھی تھا وہ انہوں نے کر کے دکھا دیاتھا۔کچھ ہفتوں تک جاری رہنے والی یہ تحریک اپنے انجام تک انتہائی زوروں سے لڑی جانے والی جنگ تھی۔عروج کی انتہائوں کو پہنچنے والی فرانسیسی تحریک اپنی قیادت کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوئی۔اٹلی کی تحریک اگرچہ اس عروج تک نہیں پہنچ پائی جہاں فرانس کی تحریک پہنچی تھی مگر یہ سالوں متحرک رہی یعنی پورے دس سال۔یہ ایک انتہائی غیرمعمولی صورتحال تھی جو بالآخر 1979ء میں اس وقت اپنے انجام کو پہنچی جب اسے انتخابی میدان میں شکست کا سامنا کرنا پڑاجب کمیونسٹ پارٹی نے الیکشن میں کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کا ساتھ دینے کا اعلان کردیاتھا۔اس انجام کیلئے اطالوی بورژوازی کو بہت عرصے تک سازشوں ، ٹریڈیونین قیادت کے ساتھ مصالحتوں اور مزدوروں کیلئے مراعات کی شکل میں بہت کچھ کرنے کا موقع مل گیاتب جا کر صورتحال ان کے کنٹرول میں آسکی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک حقیقت کو ضرور واضح کرتا ہے اوروہ محنت کش طبقے کی بے پناہ طاقت ہے۔اٹلی میں محنت کش ایک نہیں دس بار اقتدار پر قابض ہو سکتے تھے۔وہاں صرف ایک کمی تھی اس قیادت کی کمی جو یہ کر سکتی۔المیہ یہ ہے کہ ایسی

قیادت تھی ہی نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک شکست کھا گئی ۔ یہی نہیں بلکہ ایک ایسا عہد شروع ہوا جس کے بعد مسلسل محنت کشوں کی حاصلات پر حملے ہوتے رہے۔ 1980/90ء کی دہائیوں میں ہڑتالوں کی تعداد میں کمی ہوئی اور ٹریڈیونینوں کی ممبر شپ میں کمی واقع ہوتی چلی گئی۔اب حالیہ دنوں میں ہم دوبارہ ہڑتالوں اور عام ہڑتالوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوتا دیکھ رہے ہیں ۔تاریخ کا پہیہ ایک بار پھر گھوم رہاہے اور اٹلی کا محنت کش طبقہ ایک بار پھر میدان عمل میں اترنے کی تیاری کررہاہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں کو دہرانے کی بجائے ان سے سبق حاصل کریں۔

آئر لینڈ

دنیا بھر کو متاثر کرنے والے انقلابی واقعات نے شمالی آئرلینڈکو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیاتھا۔دنیا کے مختلف ملکوں میں پیداہونے والے انقلابی ابھار تیزی کے ساتھ طویل اور موثر تحریکوں کو جنم دینے کا پیش خیمہ ثابت ہوجایاکرتے ہیں۔استحصال اور محرومی کے خاتمے کی خواہش ان ابھاروں سے نئی شکتی و توانائی حاصل کرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ آئر لینڈمیں سول رائٹس موومنٹ کے معاملے میں بھی ہوا۔

ایلن وڈز نے اس کی تفصیلات کو کچھ یوں بیان کیاہے۔

” یہ تحریک واقعی عالمی صورتحال کی ہی عکاس تھی،خاص طورپر اس پر فرانس کی مئی 1968ء کی انقلابی کیفیت کے اثرات نمایاں تھے۔یہ اپنی آئرش روایات سے جڑی ہوئی تھی۔”یونائٹیڈآئرش مین“کی بغاوت بھی 1789/93ء کے فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھی۔ 1916ء کی ” ایسٹر سرکشی “پہلی عالمی جنگ کا براہ راست رد عمل تھی۔شمالی آئرلینڈ کے طلبہ کا جوش و جنون کسی طور بھی ان کے فرانسیسی طالب علم بھائیوں سے کم نہیں تھا۔سول رائٹس موومنٹ ہفتہ24اگست1968ء کے دن کول آئی لینڈ سے ڈنگانن تک 2500افراد کے مارچ سے شروع ہوئی تھی ۔پہلے توپروٹسٹنٹ کے غنڈوں نے اس مارچ پرحملہ کردیا۔پھرجب یہ لوگ کریگاون پل سے گزر رہے تھے تو پولیس نے مارچ پر لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ اس لڑائی میں 88افراد زخمی ہوگئے ان میں11پولیس والے بھی تھے۔یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ IRAآئرش ریپبلکن آرمی کا اس تحریک سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔اس کی بجائے اس تحریک کا تعلق مارکسزم اورانقلابی نظریات سے تھا ۔اس تحریک میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں عناصر شامل تھے۔ 19اپریل کو ڈیری میں ایک خوفناک جھڑپ ہوئی جس میں لوگوں نے خود پر حملہ کرنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا،اس لڑائی کی اصل کہانی اعدادوشمار سے ہی ظاہرہوتی ہے جس میں

79سویلین کے مقابلے میں 209پولیس والے زخمی ہوئے۔پٹرول بموں سے کیے جانے والے حملوں کے بعد اتھارٹیز نے بکتر بند گاڑیوں کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔اگلے روز اونیل نے استعفیٰ دے دیا اور ریفارم پروگرام کوڑے دان میں ڈال دیا گیا۔

”18مارچ کو سول رائٹس ایسوسی ایشن نے اعلان کیا کہ وہ اپنی جدوجہد جاری رکھے گی اور سول نافرمانی کی تحریک کو آگے بڑھایا جائے گا۔ایک عبوری مطالبات کا حامل پروگرام جاری کیا گیا۔جس میں مقامی حکومت کیلئے ایک فرد ایک ووٹ،اٹھارہ سال کیلئے ووٹ کا حق،انتخابی حلقوں کیلئے آزاد بائونڈری کمیشن کا قیام،گھروں کو مختص کرنے کیلئے ایک کھراصاف ستھرا نظام،بلا امتیاز روزگار کا حق،Bسپیشل قانون کا خاتمہ اور سپیشل پاور ایکٹ میں ترمیم کے مطالبات شامل تھے“۔

1966ء کا سال درحقیقت تبدیلی کا موڑ ثابت ہو رہاتھا اور جیسا کہ ایلن وڈز لکھتاہے کہ ”نوجوانوں کی بڑی تعداد تحریک کا حصہ بنتی جا رہی تھی،جن کے تیور اور رنگ روپ تک انقلابی ہو چکے تھے اور جو کسی انقلابی رستے پر چلنے کے خواہاں تھے۔لیکن یہ کسی طور تحریک کی قیادت کے اندازوں اورتخمینوں سے مناسبت نہیں رکھتے تھے۔قیادت تناظر سے محروم تھی اور اسے آگاہی نہیں تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور کیا کرنا چاہئے۔وہ تو 1969ء کے واقعات سے حیران و پریشان رہ گئی تھی جب آئرلینڈ تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہاتھا۔ 12اگست کو ڈیری کے علاقے کیتھولک بوگ سائیڈمیں رائل السٹر کنسٹیبلری RUCاور پروٹسٹنٹ مظاہرین کے مابین جھڑپوں میں حملوں کو روکنے کیلئے رکاوٹیں قائم کی گئیں ۔ردانقلابی رجعتی قوتوں کے ساتھ لڑائی کے دوران سرخ پرچم ہاتھوں میں لیے مظاہرین بوگ سائیڈ ڈیری کی آزادی کے نعرے بلند کرتے رہے۔“

ان واقعات میں انقلابی رحجان و جو ش وجذبہ نمایاں بھی تھا اورصاف طورپر اپنا اظہار بھی کررہا تھا ۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ٹریڈیونینز پر مشتمل مسلح ورکروں کی ایک دفاعی فورس تشکیل دی جاتی جیسا کہ کانولی نے آئرش سٹیزن آرمی تشکیل دی تھی“۔

”جب کوئی انقلابی قوت موجود نہیں تھی کہ جو قیادت سنبھال سکتی،تو ردانقلابی قوتوں نے یقینی طورپر اپنی گرفت مضبوط کرنی تھی اور صورتحال کو اپنے کنٹرول میں لینا ہی تھا۔شمال میں ایک انقلابی خطرے سے خوفزدہ ہوکر آئرش بورژوازی نے اسے قومی رنگ روپ دینے کی کوشش شروع کر دی۔ا س مقصد کیلئے انہوں نے دانستہ آئرش ریپبلکن آرمی IRAمیں پھوٹ پیدا کر دی۔اگرچہ یہ بھی ان کی دانست میں انتہائی لیفٹسٹ ہی تھی ۔اس مقصد کیلئے دائیں بازو، قدامت پرستوں اور لالچی عناصر کو بھاری رقوم سے نوازا گیا۔اور ایک مدمقابل تنظیم پروویژنل IRA کھڑی کر دی گئی ،بعد ازاں اسے ہی ”جائز“تنظیم

قرار دیا گیا"۔

"جب چھ کائونٹیوں کی آبادی نے سٹارمنٹ کے جبر واستبداد کا دلیری سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اور "لا اینڈ آرڈر"قائم کرنے والی قوتوں کے ساتھ میدان میں اتر آئی تو سٹارمنٹ کوبرطانوی فوج طلب کرناپڑ گئی تاکہ" فسادیوں "کے ساتھ نمٹا جا سکے۔لیکن یہ سب کچھ صرف وہاں تو نہیں ہورہاتھا،صرف وہی نہیں تھے جنہیں فوج کی مداخلت کی ضرورت تھی۔حقیقت یہ تھی کہ دونوں آئرش اور برطانوی حکمران طبقات ڈرے ہوئے تھے کہ شمال میں کائونٹیوں میں پھیلی سرکشی جنوب اور برطانیہ میں نہ پھیل جائے۔چنانچہ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اس انقلابی خطرے کو ہر طریقے سے کچل دیاجائے"۔

"ڈیری میں ینگ سوشلسٹوں کی مارکسی قیادت میں بوگ سائیڈ ڈسٹرکٹ میں‌ڈیری سٹیزن ڈیفنس کمیٹی قائم ہو چکی تھی۔ایک اشتعال انگیز واقعے میں رائل کنسٹیبلری نے اچانک حملہ کردیاجس سے ایک بڑے تصادم کا خطرہ پیدا ہوگیا۔بوگ سائیڈ اورکریگان کے لوگ اپنے اپنے علاقوں کے دفاع کیلئے باہر نکل آئے اور مورچہ بند ہو گئے۔سخت لڑائی کے باوجود ریاستی مسلح ادارے عوامی مورچوں کو توڑنے اور بوگ سائیڈ میں داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ وزیراعظم جیک لنچ نے ڈبلن میں‌آئر لینڈ کے عوام سے خطاب کے دوران اعلان کیا کہ وہ اقوام متحدہ کی امن قائم کرنے والی فورس کو طلب کرنے جارہاہے کیونکہ "سٹارمنٹ"اب کنٹرول سے باہر ہو چکاہے۔یہ برطانیہ کیلئے کھلا پیغام تھا کہ وہ شمال میں نظم و نسق کو قائم کرنے کیلئے مداخلت کرے"۔

برطانوی حکومت نے اشارہ ملتے ہی فوری کاروائی کی۔برطانوی وزیراعظم جیمزکیلاگن کے حکم پر **14**اگست**1969**ء کو برطانوی افواج ڈیری میں کاروائی کیلئے بھیج دی گئیں۔ **15**اگست کو فوج بلفاسٹ پہنچ گئی۔چھ متاثرہ کائونٹیوں میں اس ہفتے کے دوران چھ ہزار برطانوی فوجی داخل ہو چکے تھے۔کئی خود ساختہ لیفٹسٹوں سمیت بہت سے اہل دانش نے اس کاروائی کو بجا اور بروقت قراردے دیا۔لیکن اس سے بھی کوئی مسئلہ حل نہیں‌ہوسکا۔اونیل حکومت کے پانچ سالوں کے دوران فرقہ وارانہ لڑائیوں میں صرف تین افراد مارے گئے جبکہ **1969**ء کے سرما میں وہاں‌نو افراد ہلاک ہوئے، **150**افراد گولیاں لگنے سے زخمی ہوئے جبکہ **500**گھر تباہ اور **2000**افراد بے گھر کر دیے گئے۔ لیکن یہ سب ان سانحوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھاجو ابھی آگے پیش آنے والے تھے"۔

"پہلے پہل تو برطانوی فوج کا کیتھولکوں نے والہانہ استقبال کیا۔مگر بہت جلد ہی برطانوی فورسز کی اصلیت اور ان کے حقیقی اہداف سامنے آنے شروع ہوگئے۔شمال میں پنپتی' پھیلتی انقلابی تحریک کا خاتمہ ہی اس کا مرکزی ہدف تھا۔اور اس کارخیر میں‌بھی کمیونسٹوں کا خاتمہ بنیادی مقصدتھا۔اس مہم میں جنوب کے سرمایہ داروں نے

ہر ممکن تعاون کیا اوراپنی تشکیل کردہ پروویژنل آئی آر اے سے بھرپور کام لیا۔آج کل تو شاید کسی کو ان کا نام تک بھی یاد نہیں رہا لیکن اس وقت انہوں نے وہ سب کچھ کیا جس سے کمیونسٹوں کا خاتمہ کیاجا سکتاہو۔یہاں تک کہ کمیونسٹوں کے پاس جو کتابیں ہوتی تھیں وہ بھی جلا دی گئیں۔یہ تصور بھی محال ہے کہ ایک ہی لڑائی کے دوران برطانوی فوجی طاقت کو شکست دی جا سکتی تھی ،جیسا کہ ہم آگے پیش آنے والے واقعات میں دیکھتے ہیں‘‘۔

’’شکست سے دوچار ہوتی ہوئی رجعتیت کو فیصلہ کن ضرب لگانے کیلئے ضروری تھا کہ فرقہ پرستانہ تقسیم کا قلع قمع کیاجاتا مگر اس کیلئے لازم تھا کہ درست پالیسیاں اور طریق کار اپنا یاجاتا۔کسی قیادت کی عدم موجودگی میں بھی کئی ایسے مواقع اور رستے موجودتھے جن کی مددسے فرقہ پرستانہ منافرت کوپچھاڑا جا سکتاتھا۔اگست 1969ء میں ہارلینڈ اور ولف شپ یارڈ پر ہونے والی 9000 مزدوروں کی میٹنگ میں کیتھولکوں کی جانب سے فرقہ پرستانہ دہشت گردی کو رد کیا گیا۔ ایرڈوئن سمیت کئی علاقوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مزدوروں کا مشترکہ مارچ اور محاصرہ شروع کر دیا گیا‘‘۔

’’1969ء کے سرما تک بالی مرفی،سپرنگ ہل،ٹرف لاج،نیو بارنسلے،سپرنگ مارٹن،ہائی فیلڈ اور کلونارڈ کے علاقوں میں ’’غیر فرقہ پرستانہ‘‘ مقامی د فاعی گروپ قائم کر دیئے گئے۔اگر اس رحجان کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس پٹرولنگ کو مسلح کیاجاتا تو پھر تناظر ہی کچھ اورہوتا ،مناظرہی مختلف ہوتے ۔اس کی بجائے دونوں فرقوں کی انتہاپسند تنظیموں نے ایک دوسرے کے خلاف وحشیانہ اقدامات شروع کر دیے ۔ مخالف فرقے والوں کو ان کے گھروں سے نکال نکال کر مارا اور جلایا جانے لگااور پھر چل سو چل۔یہ مجرمانہ وحشیانہ بربریت محض اس لئے کی گئی تاکہ فرقہ واریت کو طبقاتی وحدت کے خلاف مسلط کر دیا جائے۔ سرمایہ داروں کی یہ حکمت عملی کارگر بھی رہی اور کامیاب بھی‘‘۔(11)

جیسا کہ ہم ایلن وڈز کے تجزیے میں بھی دیکھتے ہیں، 1968ء میں آئر لینڈ میں چلنے والی سول رائٹس موومنٹ میں یہ امکانات موجود تھے کہ یہ آئرش پرولتاریہ کی انقلابی تحریک بن جائے۔جو کمی موجود تھی وہ ایک عوامی انقلابی پارٹی کی کمی تھی جو اس کیفیت میں ایک واضح رستہ دکھا سکتی ۔اس کمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکمران طبقے نے کیتھولک کو پروٹسٹنٹ سے لڑا دیا اور یوں انقلابی جوش وجذبے کو فرقہ پرستانہ بربریت و منافرت میں بدل کے رکھ دیاگیا۔

میکسیکو

1968/69ء کے انقلابی طوفان نے لاطینی امریکہ کا رخ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔یہ وہ خطہ تھا جو پانچ سو سال تک یورپ کی نوآبادی چلا آرہاتھا اور جہاں اس تسلط کے خلاف بڑی عوامی تحریکیں چلتی چلی آرہی تھیں۔سامراجی حکمرانی کے تحت بیسویں صدی میں ہونے والی معاشی وسماجی طرز سے پیدا ہونے والی مشترکہ مگر ناہموار ترقی نے تضادات کو اور بھی گہرا اور شدید کردیاتھا۔وسطی اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کو اس دوران بدترین وحشیانہ وسفاك آمریتوں کا سامناکرناپڑگیا۔جن کے تسلط کا بڑا مقصد وہاں ابھرنے والی تحریکوں کا قلع قمع کرناتھاجو سامراجی لوٹ مار،سرمایہ دارانہ استحصال اور آمریتوں کے خلاف سامنے آتی رہتی تھیں۔یہ لکھنے اورسمجھانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب وحشی آمریتیں مسلط کرنے کے پیچھے امریکہ تھا۔دنیا کے اس خطے میںجنم لینے والی ایک کہاوت انتہائی مشہور ہے بلکہ عالمگیر شہرت اختیار کر چکی ہے جس میں سوال کیاجاتاہے کہ" تمہیں پتہ ہے کہ امریکہ میں فوجی بغاوتیں کیوں نہیں ہوتیں؟جواب یہ ہے کہ' اس لئے کہ امریکہ میں کوئی امریکی سفارت خانہ نہیں ہے"۔

تاریخی حوالے سے سب سے بڑی انقلابی تحریک اور سب سے بڑی وحشیانہ آمریت بھی میکسیکو میں 1968ء میں سامنے آئی۔امریکہ کے پہلو میں واقع یہ ملک جس کی 5000کلومیٹر سرحد امریکہ کے ساتھ ملی ہوئی ہے،چنانچہ اس کی افرادی قوت سمیت اس کے وسائل کی لوٹ مار امریکی سامراج کیلئے اہم بھی تھی اورآسان بھی۔میکسیکو سے امریکہ کے کئی دفاعی تحفظات بھی وابستہ تھے۔یہ تاریخی واقعات 1968ء کے اولمپکس سے کچھ پہلے ہوئے۔ڈرامائی طورپر میکسیکو اس عرصے کی انقلابی لہر سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔دنیا بھر میں ہونے والی ترقی کی وجہ سے اس کی معیشت بھی تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔مگر پھر یہ ترقی ناہمواری میں بھی شدت سے اضافہ کرتی چلی جا رہی تھی اور امارت وغربت میں فاصلے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے ۔میکسیکو کا صدر دنیا کو دکھاتا پھر رہاتھا کہ دیکھوہم نے میکسیکو کوایک جدیدملک بنا دیا ہے۔ اس ترقی کے اعزاز میں وہاں اولمپکس ہورہے تھے۔مگر صدر کی سوچ کے برعکس میکسیکو کے نوجوان اور مزدور کچھ اور ہی سوچ رہے تھے اور یوں دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح میکسیکو بھی اسی تاریخی انقلابی دھارے کا حصہ بن گیا۔27اگست کو میکسیکو سٹی میں چارلاکھ لوگ جمع ہوئے جو صدر کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے۔

یہاں بھی تحریک نوجوانوں کی طرف سے سامنے آئی مگر جب اسے بدترین تشدد سے کچلنے کی کوشش کی گئی تو مزدور اس میں شریک ہوگئے۔ ابتدا میں دومظاہروں سے یہ تحریک شروع ہوئی ان میں سے ایک کیوبا انقلاب کے ساتھ یکجہتی کیلئے کیاگیاتھا دوسراپولی ٹیکنیک طلبہ کی طرف سے تھا جس میں انہوں نے اپنے اداروں میں پولیس مداخلت کے خلاف احتجاج کیاتھا۔دونوں مظاہروں کو پولیس کی طرف سے کچل دیاگیا۔مگراس جبر نے طالبعلموں کو گائے بنانے کی بجائے شیر بنا دیا۔انہوں نے ملک بھر کے طلبہ کو عام ہڑتال کرنے کی کال دے دی۔مظاہروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ابتدا میں یہ تیس ہزار پرمشتمل ہوتے تھے مگر اگلے ہی مہینے یہ پانچ لاکھ تک پہنچ گئے۔ طالبعلموں نے شعوری طورپرعام لوگوں سے ملناشروع کر دیا،اپنے گلی محلوں ، بس سٹیشنوں، مارکیٹوں میں لیفلیٹ کے ذریعے رابطے کیے گئے۔مزدوروں نے اس کا انتہائی گرمجوشی کے ساتھ جواب دیا۔میکسیکو سٹی میں طلبہ کے ایک ایسے ہی مظاہرے کو کچلنے کیلئے ٹینک بلا لیے گئے۔حکومت کی ہر دلعزیزی ظاہرکرنے کیلئے صدر ڈیاز اورڈازنے ہزاروں سرکاری ملازمین کو جمع کر کے مظاہرے کا اہتمام کیا۔مگر اسی مظاہرے کی ابتدا میں ہی یہ ملازمین پھٹ پڑے ” ہمیں یہاں لایا گیا ہے ،ہمیں ڈیاز کی بھیڑیں بنا کر لایا گیاہے“۔

پھر اولمپکس کی ابتدا سے محض دس دن پہلے 2اکتوبر کو ایک نئی ریلی نکالنے کا منصوبہ بنایاگیا۔جبکہ حکومت نے تہیہ کیاہوا تھا کہ کسی قسم کے مظاہروں کو نہیں ہونے دینااور ان دنوں تو ملک کوہرحالت میں پرسکون ہونا اور معاملات قابو میں ہونا ضروری تھے۔کلچرل پلازہ میں پانچ ہزار طلبہ اور مزدور جمع ہوئے جس میں انہوں نے یونیورسٹیوں کی خود مختاری،سیاسی قیدیوں کی رہائی اور سماجی انصاف جیسے جمہوری مطالبات پیش کیے ۔مگر سکیورٹی ادارے جیسے ان کے انتظار میں تھے۔اچانک ہی مجمع میں موجودسکیورٹی کے آدمیوں نے فائرنگ شروع کر کے بھگدڑ مچا دی۔اسے جواز بناتے ہوئے فوج نے اپنی مشین گنیں مجمع پر کھول دیں۔ہمیشہ کی طرح سے اس ہلاکت خیزی کی درست خبر تاحال نامعلوم ہے ،اس دن 150سے لے کر500افراد کے مار دیے جانے کا بتایا جاتاہے۔سینکڑوں گرفتار اور ان گنت گم کر دیے گئے جن کا آج دن تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔اس قتل عام کا پیغام واضح تھا کہ طلبہ قیادت کو ختم کردیاجائے جن کی وجہ سے تحریک دن بدن پھیلتی ہی چلی جارہی تھی اور اس میں سماج کی دوسری پرتیں بھی شریک ہورہی تھیں۔

اس سال کے شروع میں ہی ہم نے عوامی جمہوریہ چین میں بھی بیجنگ اولمپکس کے انعقاد کا بڑا شور اور غلغلہ سناجو تبت میں تحریک کو کچلنے کے پس منظر میں ہوئے ۔لیکن 1968ء میں میکسیکو سٹی میں جو حشر بپا کیا گیا اس پر امریکہ کی طرف سے نہ

تو کوئی تشویش کا اظہار کیا گیا نہ کوئی مذمت کا ایک لفظ کہا گیا۔ ظلم تو یہ ہے کہ اگلے تین سالوں تک یہ پتہ ہی نہیں چلنے دیا گیا کہ یہ واقع ہوچکا ہے۔

یہ سانحہ وقتی طور پر تحریک کو پیچھے دھکیل گیا۔یہ وقت کی کسی تہہ میں بارود بن کر چھپ گیا۔تاہم یہ واضح ہوگیا کہ مدتوں سے چلے آرہے ایک جماعتی راج (یعنی انسٹیٹیوشنل ریولیوشنری پارٹی PRI کے اقتدار) کے خاتمے کی ابتدا ہوگئی۔1968ء کی یہ تحریک ایک دراڑ ڈال گئی جس نے حکومت کا تو تختہ گول کیا ہی مگر اس کے ساتھ ہی یہ تحریک کو بھی لمبا وقفہ دے گئی،کسی ایک اور نئے عہدتک کیلئے ،وہ عہد جس میں اب ہم پہنچ چکے ہیں۔اس عہد ساز تجربے کے اسباق نئی نسلوں تک منتقل ہو چکے ہیں اور یہ اسباق 2006ء کے پچھلے الیکشن کے تجربے اور سبق کے ساتھ مل کرمزید پختہ ہو چکے ہیں ،جس میں امریکی سازباز اور معاونت کے ساتھ واضح دھاندلی کی گئی۔میکسیکو میں عالمی مارکسی رحجان کے ساتھ وابستہ El Militante نام کی تنظیم میکسیکو کے انقلابی لیفٹ میں موثرو معتبر قوت کے طورپر ابھر رہی ہے۔ریاستی جبراس پر پہلے سے ہی بڑھ چکا ہے۔آنے والے سالوں میں یہ رحجان ایک انقلابی پروگرام اور ایک عالمی مارکسی حکمت عملی کے ساتھ لاطینی امریکہ میں سوشلسٹ انقلاب کیلئے امید کی پہلی کرن ثابت ہوسکتا ہے وہ بھی دنیا اور تاریخ کی سب سے بڑی سامراجی قوت امریکہ کے عین پہلو میں۔

چیکوسلواکیہ

دوسری عالمی جنگ کے بعد سامراجی طاقتوں نے سٹالنسٹ روس کے ساتھ معاہدے کیے جن کے بعد یورپ کو اپنی اپنی مرضی کے حلقہ اثر میں تقسیم کردیا گیا۔ اس بٹوارے کے تحت روس کو مشرقی یورپ کے زیادہ تر حصے سے نوازدیا گیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اس بات کا اعتراف کرلیا گیاتھا کہ روس اب دنیا کی بڑی طاقت بن چکاہے جس نے اب دنیا کے اس حصے پر عسکری حکمرانی کرنا تھی۔اس معاہدے سے مشرق کا تو جو بنا سو بنا مگر مغربی یورپ میں بعد میں ہونے والے انقلابات کوقربان ضرور کردیا گیا۔یونان‘ اٹلی اور فرانس کی دلیرانہ تحریکیں شکست سے دوچارہوئیں۔مشرقی یورپ کے اندر بھی تحریکوں کو پسپائی ہوئی کیونکہ وہاں بھی سٹالن نے روس کی طرح کا افسرشاہانہ سوشلسٹ طرز حکمرانی مسلط کر دیاتھا۔برطانیہ کے چالباز وزیر اعظم چرچل نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ سٹالن کے ساتھ معاہدہ پوٹس ڈیم میں ہونے والی سربراہی کانفرنس میں اکتوبر 1944ء میں طے پایا ”وہ لمحہ بزنس کا معاملہ طے کرنے کا تھا چنانچہ

میں نے کہا ’آئیے اب بلقان کے بارے میں بھی کچھ آپس میں سمجھوتہ کر لیں،تمہاری فوجیں رومانیہ اور بلغاریہ میں موجود ہیں ہمارے بھی وہاں مفادات ہیں ، منصوبے ہیں اور کارندے موجود ہیں ،ہمیں چھوٹے طریقوں سے معاملات طے کرنے سے گریز کرنا چاہیے، جہاں تک روس اور برطانیہ کا تعلق ہے کیاخیال ہے کہ اگر 90%رومانیہ تمہارے پاس رہے ،ایسے ہی یونان کا 90%ہمارے پاس رہ جائے !جبکہ یوگوسلاویہ کو 50-50کرلیاجائے!ا س دوران جب ان باتوں کا ترجمہ کیا جارہاتھا میں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا ۔90%رومانیہ ‘ روس،بقایا 10%باقیوں کا۔ 90% یونان‘برطانیہ(امریکہ سے معاہدے کے مطابق)باقی 10%روس کا۔یوگوسلاویہ اور ہنگری 50-50،75%بلغاریہ ‘روس جبکہ باقی دوسروں کیلئے۔ میں نے وہ کاغذ سٹالن کی طرف کھسکا دیا جو اس دوران ترجمہ سن چکاتھا۔ایک وقفہ سا آیاپھر اس نے اپنی نیلی پنسل سے کاغذ پر بڑا سا ٹک کا نشان لگایااور اسے واپس ہماری طرف کھسکا دیا۔اس میں بس اتنی ہی دیر لگی جتنی کسی کے بیٹھنے میں لگتی ہے۔نشان لگا کاغذ میز کے درمیان میں رکھاتھا۔میں نے کہا کہ کتنا عجیب وغریب اور بیہودہ لگتاہے کہ جس طریقے سے ہم نے معاملات کو سمیٹا ہے ‘کتنی آسانی کے ساتھ ہم نے کروڑوں انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ کرلیاہے۔اس کاغذ کو بہتر ہے جلا دیا جائے۔ اس پر سٹالن نے کہا نہیں اسے محفوظ رکھنا چاہیے“۔(12)چرچل مزید کہتاہے ”سٹالن وعدے پر قائم رہااور اکتوبر معاہدے پر کاربند رہااور اس دوران جو کچھ بھی ایتھنز (یونان)میں کمیونسٹوں کے ساتھ ہوتا رہا اس کے بارے پراودا یا ازویسشیامیں مذمت کا ایک بیان تک بھی شائع نہیں ہوا“۔(13)

جیساکہ ٹیڈ گرانٹ نے 1951ء میں ”سٹالنزم ؛بعد ازعالمی جنگ“ کے عنوان سے لکھا تھا”یورپ میں روس کی عالمی جنگ میں کامیابی اور جرمنی و اٹلی کے فاشزم کی ناکامی نے بڑی عوامی تحریکوں کو جنم دیا جن کی وجہ سے سارے براعظم میں ہی سرمایہ د ارانہ نظام کے خاتمے کے امکانات پیداہوگئے تھے۔تاہم روس کی کامیابی کے اثرات و نتائج متضاد اور پیچیدہ شکلوں میں سامنے آئے ،عارضی طورپر ہی سہی مگر اس کامیابی نے سٹالنزم کو کچھ وقت کیلئے مضبوط ضرور کردیا“۔(14)

سامراجی طاقتیں روس کی مشرقی یورپ اور ایشیامیں بالادستی کو تسلیم کرنے پر مجبورہو گئی تھیں،ایسا وہ کبھی بھی نہ کرتے یہاں تک کہ رجعتی زار روس ہوتاتو اس کو بھی یہ وقعت کبھی نہ دیتے۔روس کی سٹالنسٹ افسرشاہی زارروس کے وحشیانہ ارادوں سے بھی کہیں زیادہ علاقے میں اپنا تسلط قائم کر چکی تھی۔کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے اپنی شاندار کتاب ”روس انقلاب سے رد انقلاب تک“ میں اس حوالے سے تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ”وہ دور جس کے دوران مشرقی یورپ میں سرمایہ داری ختم اور اس کی جگہ سٹالنزم کا رائج ہونا ایک مخصوص عمل کا شاخسانہ تھا جس کی تفصیل میں نے اس

دور میں لکھی گئی دستاویزات میں اپنی تحریروں میں بیان کی تھی۔مشرقی یورپ کے اندر نازیوں اور ان کے ساتھیوں کی شکست کے نتیجے میں ریاستی طاقت میں پیدا ہوجانے والے خلا کو فاتح سرخ فوج کی قوتوں نے آکے پر کیا۔ان علاقوں کی نحیف ونزار بورژوازی تھک ہار کے ادھ موئی ہو چکی تھی۔اسے ایک تو جرمن بورژوازی نے چوس لیا تھا یا پھر وہ جنگ کے دوران میں ہی نازیوں کی معمولی پارٹنر بن چکی تھی۔مشرقی یورپ کی سرمایہ داری تو جنگ سے پہلے ہی کمزور حالت میں تھی۔جنوبی امریکی ریاستوں کی مانند ان کی حالت بھی بڑی طاقتوں کی نیم نوآبادیات کی سی تھی۔وہاں جنگ سے پہلے کی حکومتیں علاقے کی بالکنائزیشن کی وجہ سے جان لیوا بحران کی زد میں آچکی تھیں اور حکمران طبقات کی نااہلی سے قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکے تھے۔یہ سب حکمران فوج اور پولیس کی ملی جلی آمریتوں کی شکل میں ہی تھے جن کی عوام کے اندر کسی قسم کی کوئی بنیادیں نہیں تھیں"۔(15)

اس سب کے باوجود مشرقی یورپ کئی بار عوامی تحریکوں کی زد میں رہا جنہوں نے افسرشاہانہ اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کی کوششیں کی تھیں۔ان میں سب سے مشہور 1956ء میں ہنگری کی تحریک ہے جہاں ہم ایک سیاسی انقلاب ہوتا دیکھتے ہیں۔یہ بغاوت اس وقت خون میں ڈبو دی گئی جب روسی ٹینک اس پر چڑھادیے گئے ۔تاہم بعد ازاں 1968ء میں پھیلنے والی انقلابی کیفیت کو نام نہاد"آ ہنی پردے "بھی نہیں روک سکے تھے۔فرانس اور دیگر ملکوں کے جوش و جذبے نے مشرقی یورپ میں افسرشاہانہ جبر وتسلط کے خلاف دبی ہوئی بے چینی کو پھٹنے کی طاقت فراہم کر دی تھی۔مشرقی یورپ کے ان ملکوں میں چیکو سلواکیہ سب سے زیادہ متاثر ہوا۔یہ تحریک"پراگ سپرنگ "یاپراگ کی بہارکے نام سے مشہورہوئی ۔(پراگ چیکوسلواکیہ کا درالحکومت تھا) ایک بارپھر یہ طالب علم تھے جنہوں نے چنگاری کو آگ بنانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ابتدا تب ہوئی جب 1967/68ء میں بجلی کی فراہمی بند ہو جانے سے ہوسٹلوں کے اندر بجلی ناپیدہو چکی تھی۔طلبہ مارچ کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل کھڑے ہوئے اور ان کے ہاتھ میں ایک ہی بینر ہوتا تھا جس پر صرف اتنا لکھا ہوتا تھاکہ "ہمیں بجلی دو"۔ ایلن وڈز نے 1968ء کے اپنے مضمون "چیکو سلواکیہ؛بحران سے پریشان سٹالنزم" میں لکھا"خفیہ پولیس نے طلبہ پر بے رحمانہ تشدد کیا جس کی وجہ سے کئی طلبہ زخمی ہوگئے۔مگر پھر افسرشاہی اپنے ہی جبر سے خوفزدہ ہو گئی اور زخمی ہوجانے والے طلبہ کا سرکاری خرچ پر علاج کرانے کی پیشکش کردی ،اس پیشکش کا جراتمندی سے جواب دیاگیا کہ تشددکرنے والوں کو گرفتار کر کے قرارواقعی سزادی جائے اور ذرائع ابلاغ میں اس واقعے کی تفصیلات سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔طلبہ نے خبردار کیا کہ اگر عوام کو حقائق سے باخبر نہ کیاگیا تو وہ خود فیکٹریوں میں جا کر مزدوروں کوحقائق سے آگاہ کردیں گے"۔

”حادثاتی طورپرتحریک کا قائد بن جانے والے ڈوبسک نے شروع میں دانشوروں اور طلبہ کی حمایت حاصل کرنے کو ترجیح دی جنہوں نے کھل کر اس کا ساتھ دیا ۔چیک افسر شاہی سہمی ہوئی تھی کہ کہیں مزدور طبقہ ان دانشوروں کی باتوں سے متاثر نہ ہوجائے۔ 1956ء میں ہنگری کے ”پیٹوفائی“اور پولینڈ کے ”کروکڈ سرکل“جیسے سرپھرے احتجاج نہ صرف افسرشاہی بلکہ ڈوبسک کو بھی نہیں بھولے ہوئے تھے۔چنانچہ افسرشاہی جلد ہی دانشوروں کو مراعات دینے پر تیار ہوگئی تاکہ وہ اپنی سہولتوں سے مستفیدہونے میں مگن ہو جائیں۔مگر یہ مراعات 1956ء میں گوملکا حکومت کی طرف سے دی گئی مراعات سے انتہائی کم تھیں ۔پھر سوال پیداہوتاہے کہ آخر کیوں روسی افسر شاہی نے مداخلت کی کوشش کی؟“

روس میں برزنیف اور افسرشاہی کے دوسرے لیڈروں کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ چیکو سلواکیہ میں عوامی غیض وغضب کہیں پھیل نہ جائے ۔ڈوبسک کی طرف سے جلد بازی میں کی جانے والی اصلاحات سے ایک بات ثابت ہوگئی کہ وہ مرکزی کمیٹی کی رکنیت کیلئے ایک سمجھوتے کے تحت امیدواربناتھااور وہ کمیٹی کے انتہائی ریڈیکل ارکان جیسا نہیں تھا۔ان اصلاحات نے اس بے چینی کو جو مزدوروں کے اندر پنپ رہی تھی مزید مشتعل کر دیا“۔

”افسر شاہی میں پھوٹ نے تلخ بحثوں ،مشتعل میٹنگوں اور مظاہروں کو جنم دے دیا،تلخ بحث کا یہ سلسلہ ہر فیکٹری ہر کالج‘ ہر دیہات میں شروع ہوگیا۔ہر طرف سے قراردادیں آنی شروع ہو گئیں کہ نووٹنی کو برخاست کردیاجائے اور مراعات کو یقینی بنایا جائے۔پہلی بار ایسا ہورہاتھا کہ خود کمیونسٹ پارٹی کے اندر اس قسم کی تلخ بحثیں شروع ہوگئی تھیں اورسرکاری فہرست میں شامل کئی امیدواروں کو برخاست کرنے کے مطالبات آنے لگے۔نووٹنی کے پیروکاروں نے معاملات کو اپنے اشتعال سے اور بھی ابتر کردیا۔تحریک زورپکڑتی جارہی تھی۔افسر شاہی اس سے گھبراچکی تھی اور وہ اصلاحات پر اصلاحات کیے جارہی تھی“۔

چیکوسلواکیہ کی یہ تحریک پولینڈ اور ہنگری میں 1956ء میں چلنی والی تحریکوں کے مقابلے میں کسی طور نہ منظم تھی نہ بڑی۔ہنگری کی طرح،جہاں روس کو مداخلت کرنی پڑ گئی تھی،نہ تویہاں ورکرز کونسلیں تھیں نہ ہی مزدور مسلح ہوئے تھے۔چیکوسلواکیہ کا المیہ یہ تھا کہ وہاں کے عوام قیادت سے محروم ،غیر مسلح اور اچانک ایک تحریک کیلئے ذہنی طورپر تیار نہیں تھے۔ڈوبسک اور اس کے ساتھی حکمرانوں نے مزدوروں کو متحد و منظم کرنے کی بجائے ملک کو کسی اور کے قبضے میں جانے دینے کو ترجیح دی ۔ ڈوبسک شکست ماننے کو تیار تھا مگر تحریک کو آگے لے جانے کے حق میں نہیں تھاتاہم اپنی کم شدت کے باوجود چیکوسلواکیہ میں ہونے والے واقعات نے

روس اور مشرقی یورپ کی افسرشاہی کو دہلا دیاتھا“۔

”اس کی دیکھا دیکھی مارچ میں پولینڈ میں بھی فسادات بھڑک اٹھے ۔ایک واقعے میں دس ہزار سے زائد افراد نے وزارت ثقافت کا گھیراؤ کرکے اسے تہہ وبالا کردیا ۔مظاہرین چیکوسلواکیہ زندہ باد کے نعرے لگا تے ہوئے پولیس کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ 1956ء کی تحریک کے دوران پولینڈ کے مظاہرین قومی ترانہ گا رہے تھے مگر اس بار وہ قومی نہیں بلکہ مزدوروں کا عالمی گیت انٹرنیشنل گا رہے تھے“۔

”ان سب سے بھی دلچسپ اور شاندار سلسلہ یوگوسلاویہ میں شروع ہوگیا جہاں فرانس کے ابھار اور یوگوسلاویہ کے معاشی بحران سے متاثرہونے والے طلبہ نے بلغراد میں افسر شاہی کی دولت اور مراعات یافتگی کے خلاف مظاہرے کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے اجرتوں کی برابری ، ”سرخ بورژوازی“کی طاقت کے خاتمے “،منصوبہ بند معیشت کو نقصان پہنچانے والی پالیسیوں کے خاتمے اور ریاستی ملکیت کو نجی ملکیت میں دینے کو واپس کرنے کے مطالبات پیش کیے۔ طلبہ نے کچھ مضافاتی علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لے کر کچھ عرصہ ان کو چلایا بھی۔ان کی طرف سے نکالے گئے لیفلیٹس کو مزدوروں میں بہت پذیرائی ملنے لگی۔یہ خبریں شائع ہوئیں کہ لوگ مجمع بناکران کو دلچسپی سے پڑھنے اور سننے لگے۔لوگوں کی طلبہ کے ساتھ ہمدردیاں اتنی زیادہ ہو گئیں کہ ان پر کسی قسم کا ریاستی رد عمل ہی ناممکن ہوگیا۔مطلق العنان مارشل ٹیٹو کوعاجزی اختیار کرتے ہوئے طلبہ مطالبات پر ہمدردانہ غور کرنے کا اعلان کرناپڑا“۔

”ایک طرف عمومی بے چینی میں اضافے اور دوسری طرف افسر شاہی کی بڑھتی ہوئی حواس باختگی کا اظہار صوفیہ میں ہونے والے ورلڈ یوتھ فیسٹیول میں دیکھنے کو ملا جہاں سٹالنسٹ حکومت کا روایتی ڈھکوسلا پروگرام”امن اوردوستی“پیش کیے جانے پر تلخ بحث شروع ہو گئی جو بحث سے بڑھ کر ہنگامے میں تبدیل ہو گئی۔بلغارین پولیس کو شرکا اورکیمرہ مینوں پر لاٹھی چارج کرناپڑگیا۔“۔

”چیکو سلواکیہ پر جارحیت کے ایک ہی ہفتے کے بعد مشرقی جرمنی سمیت مشرقی یورپ کے بیشتر ملکوں میں سفاک سٹالنسٹ حکمرانی کے خلاف اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے“۔

وارساپیکٹ کی حمایت میں البرخت کی جانب سے مزدوروں کو تائیدی دستخط کیلئے دی جانے والی پٹیشن کو صریحاً انکار کا سامنا کرناپڑگیا۔سینکڑوں افراد نے چیک سفارتخانے اور چیک نمائندوں کی دوسری جگہوں کا گھیراؤ کرلیا اور چیک حکومت کے خلاف نعرے بازی کی۔اس کے باوجود کہ یہ جگہیں پولیس کے حفاظتی حصار میں تھیں۔آئزن ہوٹنستادت شہر میں چارہزار سے زائد ورکروں نے چیکوسلواکیہ پر روسی تسلط کے خلاف مظاہرہ کیا ۔البرخت پریس کی تمام ترچست چالاکیوں،مغربی نشریات کو جام

کرنے اور چیکوسلواکیہ میں جرمن زبان میں شائع ہونے والے سبھی جریدوں پر پابندی کے باوجود سچائی کو مشرقی جرمنی کے مزدوروں تک پہنچنے سے نہیں روکا جاسکا“۔

”خود روس کے اندر قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی حیران کن ترقی کے باوجود پیداوار کے ضیاع کی شرح 30سے 50فیصد تک پہنچ چکی تھی۔اس راہ پر چلتے ہوئے اس سے زیادہ ترقی ممکن ہی نہیں ہو سکتی تھی۔منصوبہ بند معیشت کی اپنی ضرورتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ طفیلی پرتوں کے کردار کو ختم کیاجائے اور لوگوں کی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے پیداوار کی جمہوری منصوبہ بندی متعارف کرائی جائے۔ایسا ایک منصوبہ صرف اسی صورت قابل عمل اور کامیاب ہو سکتاتھا جب روس اور مشرقی یورپ کی ایک سوشلسٹ فیڈریشن قائم کر دی جاتی۔قدیم فرسودہ سرمایہ دارانہ قومی تقسیم نے مشرقی یورپ کی پیداواری قوتوں کوجام کردیا۔یہ ایک تباہ کن کیفیت تھی کہ ایک سوشلسٹ ملک رومانیہ کا ایک اور سوشلسٹ ملک روس کے ساتھ کچھ علاقوں پر جھگڑا شروع ہو گیاتھا“۔

”سب سے مجرمانہ اور گھنائونا خود روس اور چین کے مابین سرحدی تنازعہ تھا جو انیسویں صدی میں زار روس اور چین کے ایک بادشاہ کی جانب سے مصنوعی سرحدیں قائم کرنے پر جاری و ساری رہا“۔

”یہ فرسودہ و بیہودہ قدیم سرحدی تنازعات ہر گزمشرقی یورپ کے مزدوروں کی ”قوم پرستی“ کا نتیجہ نہیں تھے۔ان سے تو اس بارے میں کبھی پوچھنے کا تکلف بھی نہیں کیاگیاتھا۔یہ صاف اور سادہ طورپر افسرشاہی کی حرص اور خودغرضی کاہی نتیجہ تھے جو کہ اپنے علاقے کا ایک انچ بھی قربان کرنے کو تیار نہ تھے کہ کہیں ان کی مراعات‘ طاقت اور آمدنی میں دوسرے علاقے کی افسر شاہی حصے دار نہ بن جائے“۔

”1953ء سے 1956ء کے دوران سرمایہ دار اخبارات وجرائد روزانہ اپنے صفحات سیاہ کرتے رہے کہ روس کا چیکو سلواکیہ پر قبضہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کمیونزم سوائے بربریت کے کچھ بھی نہیں ہے اور یہ بھی کہ سوشلزم اور جمہوریت کبھی بھی ایک ساتھ اکٹھے نہیں ہو سکتے“۔

” ’مغربی جمہوریت‘ کے نمائندوں کے اس منافقانہ واویلے کو امریکی صدر کے مگر مچھ کے آنسو اور بھی گرمی فراہم کررہے تھے جس نے ویتنام کے خلاف سامراجی آشیرباد سے ایک وحشیانہ جنگ مسلط کی ہوئی تھی۔جب ان جیسے لوگوں کے منہ سے ’آزادی‘ اور’ جمہوریت‘ جیسے الفاظ ادا ہوتے ہیں تو ان کے منہ سے تعفن کی بدبو بھی ساتھ نکلنا شروع ہو جاتی ہے“۔

”مگر اب جس طریقے سے دنیا کے ہر خطے میں انقلابی تحریک پھر سے ابھرتی محسوس ہو رہی ہے اس کی نظیر شاید انسانی تاریخ میں ملنا محال ہے ،ویتنام‘

چیکوسلواکیہ اور فرانس میں جو واقعات ہو رہے ہیں ان سے طاقتوں کے مابین توازن میں حیران کن تبدیلی واضح نظر آرہی ہے"۔(16)

سرمایہ دارانہ نظام مغرب میں مردود ہوتا چلا جارہاتھا،پہلے جس طرح اس نے تیزی کے ساتھ عالمی سماج کو ترقی سے روشناس کرایاتھا اب اس کی گنگا الٹی بہنا شروع ہو گئی تھی ۔اورفرانس میں ہونے والے عظیم الشان واقعات اس کا عملی ثبوت تھے۔لیکن اس کے ساتھ ہی مشرقی یورپ میں بھی سٹالنزم کو بحرانوں نے گھیرلیاتھاجن سے نہ صرف طفیلی سٹالنسٹ افسر شاہی بلکہ مغرب کے سرمایہ دار بھی پریشان ہو چلے تھے۔چیکوسلواکیہ کے واقعات اس بات کا واضح اشارہ دے رہے تھے کہ آگے کیاہونے والا ہے۔یہ علامات تھے اس زوال کی جو بعدازاں 1989ء میں مشرقی یورپ کی حکومتوں کو پیش آیا۔بدقسمتی سے ایک بروقت قابل اعتماد متبادل مزدورقیادت کی عدم موجودگی سے سٹالنزم کے بعد سرمایہ داری نے وہاں اپنے پنجے گاڑ دیے جس کی وجہ سے سامراج کو سانس لینے کی مہلت میسر آگئی ۔

سامراج نے روس اور مشرقی یورپ میں سٹالنزم کے زوال اور وہاں سرمایہ داری کی بحالی کو سرمائے کے بے رحمانہ استبداد کیلئے استعمال کرکے نسل انسانی کی اکثریت کو تباہی وبربادی سے ہمکنار کردیا۔غربت' محرومی اور ذلتوں کی ایسی نظیر بھی ملنی مشکل ہے۔ان کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایسی نفرت و حقارت پروان چڑھ چکی ہے جو آنے والے عرصے میں بڑے پیمانے پراپنا اظہار کرکے رہے گی۔ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے اس وحشی نظام کو اکھاڑ پھینک کر ہی نسل انسانی اپنی بقا کا حقیقی رستہ اختیار کرے گی۔

امریکہ،ویتنام جنگ اور ریڈیکلائزیشن

1968ء کی تحریک کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ یہ خود سامراج کے اپنے بڑے مرکز امریکہ میں بھی پہنچ گئی ۔یہاں یہ سول رائٹس moovement،اینٹی وار moovement اور طلبہ بغاوت کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے انقلابی موڈ کی شکل میں سامنے آئی۔ اس جوش و جذبے میں اتنی طاقت تھی کہ 'جنگجوصدر لائنڈن بی جانسن'کواپنی فوج واپس بلانی پڑگئی۔31مارچ کو صدر پر دبائو کی یہ حالت تھی کہ اسے اعلان کرناپڑ گیا کہ وہ اپنی دوسری بار الیکشن کمپئین سے دستبردارہورہاہے اور ویتنام کی آزادی کیلئے لڑنے والوں کے ساتھ بات چیت کیلئے بھی تیار ہے۔اس اعلان کے سنتے ہی سارے امریکہ کے تعلیمی اداروں کے طلبہ خوشی سے نعرے لگاتے باہر نکل آئے۔

جیسا کہ ایلن وڈز اپنی کتاب "مارکسزم اور امریکہ" میں لکھتا ہے ویتنا م میں جاری

جنگ نے امریکہ میں صورتحال کو مکمل طورپر تبدیل کر کے رکھ دیااور یہ سب کسی سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر ہوا۔امریکہ کو جیسے ایک حادثے نے نچوڑکے رکھ دیاتھا۔اس کا آغاز ایک خفیہ آپریشن سے ہواجس میں افسروں اور مشیروں کی ایک فوج ظفرموج کو روانہ کیاگیاتاکہ وہ اپنی مرضی کی ایک بدعنوان حکومت قائم کرنے کی کوشش کر سکیں جو اپنے ہی عوام کے خلاف سرگرم ہو۔یہ امریکی سامراج کا پرانا شیوہ چلا آرہا ہے۔نوڈین ڈیم کی حکومت جنوبی ویتنام میں بدترین جبروتشدد کی ذمہ دار تھی اور ایک احساس جرم کا شکار تھی۔اس کے خلاف احتجاج کے طورپر بدھ بھکشوئوں نے خود کو زندہ جلا دیاتھا۔بالآخر ڈیم کو خود اس کے اپنے جرنیلوں نے گولی سے اڑادیا"۔

"تین ہفتوں بعدامریکی صدر جان ایف کینیڈی کو بھی ہلاک کر دیاگیا،جس کی جگہ اس کا نائب صدر جانسن صدر بن گیا۔جس نے آتے ہی اعلان کردیاکہ وہ کسی طوربھی ویتنام کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ہمیں یہ جنگ جیتنی ہے،یہ اس کا واضح نقطہء نظرتھا ۔مگراپنی بے پناہ طاقت ، دولت اور عسکری تمکنت کے باوجود امریکہ ویتنام کی جنگ جیت نہیں سکا۔اس کے برعکس یہ پہلی جنگ تھی جس میں امریکہ کو شکست ہوئی تھی جبکہ کوریا جنگ برابررہی تھی۔ویتنام کے گھنے جنگلوں میں امریکیوں کو ننگے پائوں والوں نے مات دے دی تھی"۔

ہمیشہ کی طرح سے ،ویتنام میں بھی مداخلت کیلئے امریکیوں کو کسی واقعے کی ضرورت تھی جسے جواز بنا کر حملہ کیا جاسکے۔بحیرہ ٹونکن کا واقعہ بھی اسی طے شدہ حکمت کا ہی شاخسانہ تھا ،کہا جاتاہے کہ بحیرے میں موجود ایک امریکی بحری بیڑے میڈوکس پر شمالی ویتنام کی طرف سے نیوی کے کسی جہاز سے فائر کیے گئے۔کئی سالوں تک یہ یقین کیاجاتارہا کہ کمیونسٹ جارحیت نے امریکی بحریہ کو اپنی کاروائیوں کا نشانہ بنایاہوا ہے۔یہ سراسر غلط الزام تھا۔یہاں تک کہ خود اس وقت کے میڈوکس کے کپتان نے یہ تسلیم کیا کہ اس نے یا اس کے عملے کے کسی فرد نے شمالی ویتنام سے جہاز پر کوئی حملہ ہوتے نہیں دیکھا۔کسی نے بھی اس طرف سے فائرنگ کی آوازنہیں سنی تھی۔ہنوئی سے ملنے والے ثبوتوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شمالی ویتنام سے امریکی جہازوں پر کوئی حملہ نہیں کیاگیاتھاجو اس وقت ویتنام کی حدود میں موجودتھے۔ اس کے باوجود بھی کوشش کی گئی کہ امریکی عوام کو ایک غیرملکی جنگ کی تائید وحمایت کیلئے تیار کیا جائے اور یہ کوئی آخری بار نہیں ہو رہاتھا"۔

"اگلے روز ہی صدر جانسن نے شمالی ویتنام کے نیول مراکز اور ایک آئل ڈپوپر بمباری کا حکم جاری کردیا۔یہ ایک انتہائی وحشیانہ بمباری تھی جس نے ان گنت شہریوں کو ہلاک کرنے کے ساتھ ساتھ ویتنام کی صنعت اور انفراسٹرکچر کو تہس نہس کردیا۔صدرجانسن نے ٹیلیویژن پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ'اگر کسی نے دوبارہ

امریکیوں کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھا تو اس کے ساتھ یہی سلوک کیاجائے گا۔ہم نہ صرف اپنا دفاع کریں گے بلکہ معقول جواب بھی دیں گے اور آج ہم نے،جس وقت میں یہ تقریر کررہاہوں، ایک جواب دے بھی دیاہے'۔(سرد جنگ؛جیریمی آئزک/ٹیلر ڈائوننگ)(17)

"جانسن اور اس کے ہمنوائوں کے الفاظ میں کوئی صداقت نہیں تھی۔انہوں نے اپنی فوجیں ویتنام بھیجنی تھیں اور بس۔یہی طریقہ واردات ہوتا ہے ان کا،ایسے ہی جارج بش نے نائن الیون سے بہت پہلے ہی عراق میں جارحیت کا فیصلہ کرلیا ہواتھا ،وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا واویلا اپنی عوام کو اس غنڈہ گردی کا جواز فراہم کرنے کیلئے رچایاگیا"۔"آنے والے سالوں میں ویتنام پر نیپام بموں اور کلسٹربموں کی برسات شروع کردی گئی۔ امریکی طیاروں نے ویتنام پر زہریلے کیمیکلز سپرے کیے جن میں بدنام زمانہ ایجنٹ اورنج بھی جنگلوں پر سپرے کیاگیاتاکہ ویتنامی گوریلوں کی غذا کے ساتھ ان کی کمین گاہوں کو تباہ کیا جاسکے۔کل 18ملین گیلن زہر چھڑکا گیا۔ابھی تک بھی امریکی فوجی جنہوں نے یہ زہریلا مواد استعمال کیاتھاوہ اس کے اثرات کے باعث بیمارہوکر مر رہے ہیں ۔کوئی بھی یہ انداز ہ لگا سکتاہے کہ جن مردوں' عورتوں اوربچوں پر یہ سب گر ا یا گیا تھا ان پر کیا گزری ہوگی؟ ٹیسٹوں سے پتہ چلا ہے کہ ویتنامی شہریوں کا ڈائی اوکسین Dioxinلیول امریکی شہریوں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔فضائی نظام کو اس زہریلے مواد سے پاک ہونے کوابھی کئی سال اور لگیں گے۔ویتنام کی جنگ درحقیقت ایک کیمیائی جنگ تھی جو نفرت اور وحشت کے ساتھ مسلط کی گئی"۔

"امریکیوں نے ویتنام جنگ میں جتنی مقدارمیں بمباری کی اتنی تو دوسری عالمی جنگ میں بھی مجموعی طور پر نہیں کی گئی تھی۔ایک دیہات پر بمباری کرنے کے بعد ایک امریکی افسر نے کہا 'ہم نے قصبے کو برباد کرکے اسے بچالیاہے'۔ان کے پھینکے ہوئے کیمیکلز آج بھی ویتنامیوں کو مار رہے ہیں ۔یہی حال فلوجہ ،عراق،کے شہریوں کا بھی ہے۔جبکہ کولمبیا کے جنگلوں میں آج بھی ایسے ہی زہریلے کیمیکل چھڑکے جارہے ہیں ۔وہاں منشیات کے خلاف نام نہاد جنگ کے نام پر زہر یلی برساتیں کی جارہی ہیں۔اس کا نتیجہ ویسا ہی نکلے گا جیسا ویتنام میں ہواتھا۔

مگر اس بربریت پر کوئی زبان نہیں کھول رہا"۔

"اس آپریشن کا نام 'لڑکھڑاتاطوفان'رکھاگیاتھا ،ایسا لگتاہے کہ پینٹاگا ن میں متعین کسی مفلوك الحال شاعر نے یہ ادبی نام تجویزکیاہوگا جس کی ڈیوٹی یہی ہوگی کہ اس نوعیت کی ہروحشت اور بربریت کیلئے اس قسم کے عنوان تخلیق وتجویزکرتارہے۔اس کے بعد ہم ایک اور آپریشن'آہ وبکا'ہوتابھی دیکھتے ہیں۔اس قسم کے تخلیقی صلاحیتوں کے حامل اس وقت ہوتے جب سلطنت روما زوال پذیر ہورہی تھی تو یہ تب اس قسم کے عنوان سامنے لے آتے 'مٹھاس اور روشنی سے بھرا' ۔۔۔تاہم ناموں سے کوئی فرق نہیں

پڑاکرتا،البتہ یہ سب آپریشن ناکامی سے دو چار ہوئے۔ جب کوئی قوم اپنے پائوں پر کھڑی ہوکر اپنا سراٹھاکر کہہ دے کہ ’نہیں ‘تو کوئی فوج کتنی بھی طاقتور کیوں نہ ہو،بندوقیں اور توپیں کتنا ہی بارود کیوں نہ اگلیں،بم اور کیمیکل جتنے بھی برسائے جائیں ، یہ سب کسی کام نہیں آتا۔جارج بش یہ سبق عراق سے سیکھ چکاہوگا ۔امریکی فوجی جتنے زیادہ بھیجے جاتے رہے ویتنامیوں کی مزاحمت اتنی ہی شدید ہوتی گئی اور امریکی لاشوں کی وطن واپسی میں بھی اضافہ ہوتاگیا“۔

شروع شروع میں تو امریکی حکمران امریکی شہریوں سے مزاحمت میں اضافے کے حوالے سے حقائق چھپاتے رہے۔ حسب روایت اخبارات کی بھرپور معاونت کے ساتھ جھوٹ بولے جاتے اور عوام کودھوکے دیے جاتے رہے۔ لیکن پھر جیسا کہ ابراہام نے کہاتھاکہ ’تم کچھ وقت کیلئے سب لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو اورکچھ لوگوں کو ہر وقت دھوکے میں رکھ سکتے ہو مگر تم سب لوگوں کو سارے وقت کیلئے دھوکے میں نہیں رکھ سکتے‘ دھیرے دھیرے بتدریج امریکی عوام یہ جان ہی گئے کہ کیا کیوں اور کیسے ہورہاہے!“۔

”کوئی کبھی نہیں جان سکے گا کہ ویتنام میں صحیح معنوں میں کیا کچھ ہوا۔مارے اور گم ہو جانے والے لاتعداد افراد سے ہٹ کر جنگ نے اور بھی کئی انسانی المیے جنم دیے ۔اندھا دھند بمباریوں‘گولہ باریوں اور زہر فشانیوں کی وجہ سے دیہاتوں سے بڑی تعداد میں کسان نقل مکانی کرکے شہروں کے مضافات میں منتقل ہونے پر مجبور کر دیے گئے جہاں انہیں بے رحم غربت نے گھیر لیا ۔روایتی ویتنامی دیہی زندگی برباد کر کے رکھ دی گئی۔ نوجوان ویتنامی لڑکیاں امریکی فوجیوں کیلئے عیاشی کا سامان بن گئیں ۔بربادیوں سے جو تنائو پیداہوا اس کی وجہ سے منشیات کا کلچر فروغ پاگیاجو بعد ازاں امریکی شہروں کی طرف بھی پرواز کرگیاجس نے تباہ کن نتائج پیدا کیے۔ **1971**ء میں پینٹاگان نے رپورٹ کیاکہ ویتنام میں موجود تقریباً **30%** امریکی فوجی ہیروئن یا افیون کے عادی ہو چکے ہیں جبکہ ماریجواناکے استعمال کا تو کوئی شمارہی نہیں ۔جنوبی ویتنام کی کٹھ پتلی حکومت نے منشیات کی تجارت کے خلاف کاروائی نہیں ہونے دی کیونکہ وہ خود اس کاروبار میں ملوث تھی اور یہی وہ حکومت تھی جسے امریکی سامراج کی بھرپور تائید میسر تھی “۔

”**1967**ء کے آخر تک امریکہ ویتنام جنگ پر سالانہ **20** ارب ڈالر خرچ کررہاتھاجس سے امریکی ادائیگیوں کے توازن کا خسارہ **7**ارب ڈالرکو پہنچ گیا۔ **1968**ء تک ویتنام میں امریکی فوج کی تعداد **500,000**تک پہنچ چکی تھی۔جنگ کے اختتام تک امریکی فوج ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔انہیں سمجھ آ چکی تھی کہ وہ ایک ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جسے جیتنا ممکن ہی نہیں۔جبکہ ویتنامی بجا طورپر قومی آزادی کے جذبے کے تحت جرات سے لڑ رہے تھے۔پھر امریکی فوج یعنی ایک غیر ملکی فوج کے خلاف نفرت بھی ایک فطری امر تھا جس نے جارحیت کی تھی۔ہر فوج کے اندر وحشی اوراذیت پسندعناصر موجود ہوتے

ہیں جن کی وجہ سے شہریوں پربدترین تشددہرجنگ کا معمول بن جاتا ہے۔ایسا ہی ایک دلدوز واقعہ ’مائی لائے‘میں ہونے والا قتل عام ہے۔عراق کی جنگ کی طرح ویتنام جنگ کیلئے تراشے گئے جواز بھی بالآخر پاش پاش ہو کررہ گئے“۔

”جنوری 1968ء میں صدر جانسن نے اعلان کیا کہ امریکہ جنگ جیتنے کے قریب پہنچ چکاہے۔لیکن ابھی اس اعلان کی بازگشت ہوائوں میں ہی تھی کہ ’ٹیٹ‘(Tet)حملے نے اس کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں۔ویتنامیوں نے ایک سو سے زائد شہروں میں امریکیوں پر بیک وقت حملہ کردیا۔سائیگون میں تو ایک چھاتہ بردار یونٹ امریکی سفارتخانے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔یہ سبھی مناظر امریکہ میں ششدرعوام ٹیلیویژن سکرینوں پر دیکھ رہے تھے۔اس سے امریکی عوام پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ ہم اتنی بڑی قوت رکھنے کے باوجود جنگ جیت نہیں پا رہے ہیں۔جنگ نے صدر جانسن کا کیریر ختم کرڈالا۔ریپبلکن کے امیدوار رچرڈ نکسن نے جانسن کے نائب صدر اور صدارتی امیدوارہوبرٹ ہمفرے کو شکست دے دی“۔(18)

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ مخالف تحریک سول رائٹس موومنٹ کے ساتھ اشتراك میں تھی۔ اپریل1968ء میں مارٹن لوتھرکنگ جونیر کوممفس میں قتل کردیاگیا جس کے نتیجے میں سو سے زائد شہروں کے اندر نسلی فسادات بھڑك اٹھے۔اس کے شعلے وائیٹ ہائوس میں بھی پہنچ گئے۔اس کے چھ بلاکوں میں آگ لگا دی گئی تھی۔اس تحریک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اسے سنبھالنے کیلئے 70000فوجی متعین کرنے پڑگئے۔اپریل 1968ء کی سیاہ فام بغاوت دراصل 1964ء سے رواں دواں سیاہ فام شہری بغاوت کا ہی تسلسل تھی بلکہ یہ 1950ء کی دہائی سے ہی جاری وساری تھی۔مگر1968ء میں یہ اپنے عروج پر اس طرح پہنچ گئی کہ اس نے امریکی سماج کو اس کی بنیادوں تک ہلا کے رکھ دیا۔اسی کے ساتھ ہی نوجوانوں کی ریڈیکلائزیشن بھی ابھر کر سامنے آگئی جو مزیدفروغ پاکر انقلابی سیاست کی طرف راغب ہوگئے۔انقلابی سیاست کی طرف پیش قدمی کے اس رحجان کا اظہار ہمیں اس وقت کی ایک نامور شخصیت میلکم ایکس کی ذات میں مجسم ہوتانظر آتاہے جسے 1965ء میں موت کے گھاٹ اتاردیاگیاتھا۔میلکم اپنی زندگی کے آخری سالوں میں سیاہ فام مسئلے کے طبقاتی پہلوئوں پر کام کر رہاتھا۔اور اس نے یہ نتیجہ اخذکیاتھا کہ نسل پرستی بھی دراصل سرمایہ دارانہ نظام کا ایک جزو لاینفک ہی ہے۔اوریہ کہ اس تعصب کومزدوروں کو تقسیم کرنے کیلئے استعمال کیا جاتارہاہے اور یوں یہ سرمایہ داروں کے منافعوں کیلئے خیروبرکت کا باعث بنتی چلی آرہی ہے۔

1968ء کے فرانسیسی واقعات اور پھر ٹیٹ حملے کی شدت نے اس ساری کیفیت کو مزید گہراکردیا اور یہ ثابت ہو گیا کہ” امریکی دیو کے پائوں حقیقتاً ریت کے ہی ہیں“۔اس

کی عملی شہادت طلبہ احتجاج کے ابھار کی شکل میں سامنے آئی 'مارچ 1968ء میں پہلا قبضہ ہاورڈیونیورسٹی میں ہوا جس کا نتیجہ طلبہ مطالبات کو تسلیم کر لیے جانے کی شکل میں نکلا۔دوسراواقعہ مئی میں کولمبیا یونیورسٹی میں ہواجس میں ایک ہزار طلبہ نے یونیورسٹی پر قبضہ کرلیا۔سان فرانسسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں ساڑھے چار مہینے تک کی طویل ہڑتال ہوئی اور یونیورسٹی انتظامیہ کو مجبوراًطلبہ کے بیشتر مطالبات کے آگے سرنگوں ہوناپڑا۔طلبہ کے اس ولولہ انگیز موڈ نے مزدوروں کو بھی سرگرم کرنا شروع کردیااور یوں یہ سلسلہ کہیں رکے بغیر بڑھنا شروع ہوگیا۔جب اس نے گاڑیوں کی صنعت کو اپنی لپیٹ میں لیا تو 'وال سٹریٹ جرنل'کو اعتراف کرناپڑا کہ"1960ء کی دہائی کا انقلاب امریکی معیشت کے بنیادی حصے کوچھونے میں کامیاب ہوچکاہے"۔

عام مزدوروں کی بڑی تعداد میں احتجاج میں شمولیت نے سرکاری یونینوں پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کے نتیجے میں وہ زیادہ ریڈیکل اقدامات پر مجبور ہوگئے اوریوں کئی ہڑتالیں سامنے آئیں۔اس عرصے میں ہونے والی ہڑتالیں1946ء کے بعدسے سب سے زیادہ ہوئیں۔ امریکی سماج میں جاری اس تحریک کی شدت کا اندازہ اس سے بھی لگایاجاسکتا ہے کہ کینٹ سٹیٹ یونیورسٹی کے طلبہ کے مظاہرے پر فوج کو فائرنگ کرنی پڑ گئی جس سے چار طالبعلم ہلاک ہوگئے جو سیاہ فام نہیں تھے بلکہ گورے تھے۔جبکہ جیکسن سٹیٹ یونیورسٹی میں دو سیاہ فام طلبہ جاں بحق ہوگئے۔امریکہ کے 440کیمپسوں میں ہڑتالیں ہوئیں جن میں چالیس لاکھ طلبا شریک ہوئے تھے۔ 1971ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق تیس لاکھ امریکیوں نے رائے دی کہ امریکہ کو ایک انقلاب کی اشد ضرورت ہے۔یہ 1968ء کی تحریک کے اثرات تھے جو دنیا کے سب سے طاقتور ملک کے طلبہ اور مزدوروں پر مرتب ہوئے تھے۔

دوسرے خطوں میں ہونے والے واقعات

اس کتاب کا بنیادی مقصد پاکستان کے اندر 1968ء میں شروع ہونے والے انقلابی واقعات کی تفصیل اورتاریخ بیان کرنا ہے،جو انقلاب کا سال تھا۔یہ اپنے وقت میں دنیا میں چلنے والے انقلابی ابھار کا ہی ایک تسلسل تھا۔ترقی یافتہ ملکوں کے اندر فرانس میں مئی1968ء کی تحریک اس عہد کا عہد ساز واقعہ تھی۔اٹلی اور میکسیکوکا ذکر بھی ہم کر چکے ہیں۔یہاں تک کہ دیوہیکل امریکہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکاتھا۔یہ بھی سچ ہے کہ اس انقلابی ابھار نے ان ملکوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیاتھا جہاں نسبتاً حالات بہتر اور معتدل تھے۔جیساکہ ہم برطانیہ میں دیکھ سکتے ہیں جہاں ہڑتالوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیاتھاجو 1971ء میں بدنام زمانہ صنعتی تعلقات آرڈیننس کے

خلاف بڑی تحریک کی شکل اختیار کر گیا تھا۔اس وقت عوامی موڈ اتنا ریڈیکل تھا کہ ایک عام ہڑتال کی منصوبہ بندی سوچی جارہی تھی اگر یہ ہوجاتی تو ایسا 1926ء کے بعد پہلی بارہوتا۔

یہاں تک کہ دنیا بھر کے اصلاح پسندوں کا محبوب اور ہر دلعزیز ملک جہاں'طبقاتی امن'اور' طبقاتی وحدت 'ان کے بقول ہمیشہ سے مثالی چلا آرہاہے،یعنی سویڈن بھی ابھاروں کی اس لہر سے متاثر ہوچلاتھا۔1969ء کاساراسال کئی علاقوں میں ہڑتالوں میں گزرا۔اور یہ 1945ء کے بعد کے پچیس سالوں میں ہونے والی سخت اور شدید ہڑتالیں تھیں۔جرمنی بھی طالبعلموں کی ریڈیکلائزیشن اور مزدوروں کی گرم جوش تحریکوں کے تجربے سے گزرا ۔قدرے تاخیرکے ساتھ یہ لہر سپین پرتگال اوریونان میں بھی پہنچ گئی ،اس کا سبب ان تینوں ملکوں میں سخت گیر و سفاك آمریتیں تھیں۔مگر70کی دہائی کے شروع میں ہی لاوایہاں بھی ابل پڑاتھا اور دوبڑی تحریکیں سامنے آگئیں۔پرتگال کے اندر یہ انگولا اور موزمبیق کی آزادی کی تحریک کے ساتھ جڑی ہوئی تھی جس نے آمریت کا تخت اکھاڑ پھینکا۔پرتگال کے واقعات پر ٹائمز لندن نے یہاں تک لکھ دیا کہ "یہاں اب کھیل ختم ہو چکا"۔ان کو محسوس ہوچلا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اب محفوظ نہیں رہا ہے۔ سپین میں دہائیوں سے مسلط فرانکو آمریت کا دھڑن تختہ کردیاگیا۔جبکہ یونان میں تحریک نے بدنام زمانہ کولونل حکومت کو چلتا کردیا۔ان تینوں ملکوں میں تو یہ کیفیت ہو چکی تھی کہ اگر مزدور چاہتے انہیں اور قیادت میسر ہوتی تواقتدارپر قبضہ کرسکتے تھے۔

سابقہ نوآبادیاتی ممالک پر اثرات

اسی عہد میں ہی ہم سابق نوآبادیاتی ملکوں میں ایک اور متوازی مظہر ابھرتا دیکھتے ہیں جس میں کئی ملکوں کے اندر سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہاں سٹالنسٹ روس اورمائواسٹ چین کی طرز کی حکومتیں تشکیل پائیں ۔1967ء میں جنوبی یمن میں انقلاب برپا ہوا جس پر ٹیڈگرانٹ نے 1968ء میں اپنے مضمون "جنوبی یمن میں نوآبادیاتی انقلاب اورخانہ جنگی"میں لکھا کہ"عدن سے ایک عوامی سرکشی کے بعد برطانوی سامراج کی شکست جنوبی یمن میں انقلاب کانقطہء آغازبنی۔مگر بورژواجمہوریت کی وجہ سے اور عالمی سرمایہ داری کے جاری بحران اور سب سے بڑھ کر ان نوآبادیاتی ملکوں کے اپنے شدید بحران کے باعث یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی کہ یہاں کے بورژوا ، پیٹی بورژوا ڈیموکریٹس جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لئے کوئی واضح حکمت عملی اپنانے میں نا اہل و ناکام ثابت ہوئے اور یوں بورژوا جمہوری انقلاب کرنے

میں بھی ناکام رہے“۔

انقلابی تحریکوں کے سب سے ریڈیکل عناصر اقتدار تو اپنے ہاتھوں میں لینے پر مجبور ہوگئے مگرانہیں جنوبی یمن میں جاگیرداری و زمینداری نظام کو ختم کرنے کیلئے آگے کے اور اقدامات بھی کرنا تھے ۔جنوبی یمن نے خودکو ایک مارکسی ریاست قرار دے دیا جبکہ یہ ملٹری/پولیس بوناپارٹسٹ آمریت تھی۔اس نے اپنی بنیاد ایک نیشنلائزڈ معیشت پہ رکھی لیکن اسے عوام کی اکثریت کی خصوصاًمتحرک پرتوں کی تائیدو حمایت حاصل تھی۔یمنی انقلابیوں کے سامنے کیوبا ،روس اور چین کے انقلابات کے ماڈل موجود تھے“۔(19)

اسی طرح سے ہم 1969ء میں صومالیہ میں ایسا ہی ہوتا دیکھتے ہیں جہاں سابق پولیس چیف سیاد بارے کی قیادت میں سرکشی کی گئی ۔یہاں بھی فوجی افسروں کی حکومت قائم ہوئی جو خود کو ’مارکسسٹ لیننسٹ ‘قرار دیتی تھی اور جو روسی طرز کے ماڈل پر استوار ہونا چاہ رہی تھی۔ اسی 1960ء کی دہائی میں ہی ہم برما اور شام کے اندر ایسی ہی حکومتیں قائم ہوتے دیکھتے ہیں۔ 1974ء میں ایتھوپیا میں فوجی بغاوت کی گئی جس کے نتیجے میں دریگ اقتدار پر آگیا۔اس نے بھی روسی ماڈل کاانتخاب کیا۔ 1974ء میں پرتگالی سامراج کی شکست کے بعد انگولا اور موزمبیق میں قائم ہونے والی حکومتوں نے بھی روسی سٹالنزم کی راہ اپنائی۔ 1975ء کی ٹیڈ گرانٹ کی تحریریں اس عمل کی وضاحت کرتی ہیں۔

”شام اور برما کی طرح سے ایتھوپیا انقلاب بھی فوجی افسروں کی تمنائوں اور کاوشوں کا ثمر تھا جسے ملک کے مزدوروں کسانوں کی حمایت میسر تھی،جس نے جاگیرداری کو ختم کردیاتھااور پھر مقامی بورژوازی کی ملکی معیشت کو ترقی دے سکنے کی نا اہلی کے باعث اسے بھی بے دخل کر دیاگیا۔ملک کی اپنی پسماندگی اور فوجی پرت کی محدود ذہنی صلاحیت نے اس نئی باغی حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ ’سوشلزم‘قبول کر لیں۔روس‘ چین اور کیوبا کی طرز پر قائم فوجی اورافسرشاہانہ اقتدارکو ملکی معیشت کو فوری طور پردرکار ترقی کا رستہ سمجھ لیاگیا۔چونکہ روس اور چین کی بڑی اور تیز رفتار ترقی پسماندگی کا خاتمہ کرتی جا رہی ہے، چنانچہ سمجھ لیاگیاکہ ہمارے لیے بھی یہی جادوئی نسخہ کارگر رہے گا۔سٹالنسٹ ریاستوں کی تنگ نظر قوم پرستانہ محدودیت ان کیلئے انتہائی کشش کا موجب بنی ہوئی تھی۔یہ کشش سوشلزم کی حامل تنظیم ،فوجی و افسرشاہانہ مراعات پر مبنی تھی جسے دانشور اور درمیانی فوجی پرت سماج کا فطری حصہ سمجھتی تھی“۔

نتیجتاً‘ذرائع پیداوار کی ترقی سرمایہ داری اور بڑے کاروباروں کی کمزوری کی وجہ سے رك جاتی ہے۔ چونکہ یہ سرمایہ داری سامراج کی غلام ہوتی ہے اس لئے ختم ہوجاتی

ہے۔

مسلسل انقلاب کی ایک مسخ شدہ کوشش میں چھوٹے افسروں کی یہ پرت کچھ عرصے کیلئے تاریخ کی ایک ایسی لاشعوری ایجنٹ بن جاتی ہے جو معیشت کو ریاست کے ماتحت کرنے کالازمی فریضہ سرانجام دیتی ہے“۔

یہ سبھی اقدامات اور عمل ترقی یافتہ ملکوں میں پرولتاری انقلاب کی تاخیر کی ہی پیداوار ہیں۔لیکن پھر یہ پھلانگیں عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادوں کی کمزوری اور نقاہت کو ضرور آشکار کرجاتی ہیں۔یہ کسی طور کوئی حادثہ نہیں کہ نوآبادیاتی ممالک میں موجود بورژوا بوناپارٹسٹ آمروں اورحکمرانوں نے اپنی اپنی آزاد حکمرانیاں خیالی طرز کے ’سوشلزم‘ کے نام اور نعرے کے ذریعے حاصل کی تھیں ۔یہ ان شدید اثرات کا نتیجہ تھا جو روسی اور چینی انقلابات سے متاثرہ لوگوں کے ذہنوں میں سوشلزم کے تصورات کی شکل میں موجود تھے ‘لیکن پھر اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان ملکوں میں سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے روس میں افسرشاہی کو اپنے عوام کوقابو میں رکھنے کا موقع میسر آتا رہا۔جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اس دوران ترقی یافتہ ملکوں کے اندراصلاح پسند اور سٹالنسٹ پارٹیاں مضبوط ہوتی چلی گئیں لیکن پھر یہ مضبوطی دراصل ان کی تنگ نظرقوم پرستانہ کمزوری اور تنزلی کی شکل میں آشکار ہوتی رہی“۔(20)

روس میں سٹالنزم کے خاتمے اور چین میں منڈی کی معیشت کی ا بتداکے بعد یہاں کی حکومتیں سرمایہ داری کی طرف مراجعت کر چکی ہیں۔البتہ یمن جیسے کچھ علاقوں میں داخلی تنازعات اور خانہ جنگیاں بھی شروع ہو چکی ہیں۔لیکن سرمایہ داری کی طرف واپسی سے بھی ان ملکوں میں کوئی ایک مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے ہاں البتہ ان مسائل میں اضافہ ضرور ہواہے۔جدوجہد کی ایک نئی لہر اپنے اظہار کیلئے تیار ہو رہی ہے مگر اس بار یہ لہر دنیا کو کسی اور ہی رنگ میں متاثر کرے گی۔وینزویلا اور لاطینی امریکہ سے یہ لہر اپنا آغاز کر چکی ہے۔اور ابھی جیسا کہ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ عالمی سرمایہ داری ایک ناخوشگوار بحران کی لپیٹ میں آچکی ہے جو تاریخ کا سب سے گہرا بحران ہے۔سوشلزم کا تصور ایک بارپھر ہر طرف پھیلتا چلاجارہاہے۔

نتائج

عالمی جنگ کے تقریباًپچیس سالوں کے بعدنوجوان اور مزدور تاریخ کے دھارے میں شریک اور متحرك ہوئے تھے تاکہ اپنی تقدیریں بدل سکیں اور انہیں‌اپنے قبضے میں لا سکیں۔ اس تحریک نے انہیں اپنی طاقت کے احساس سے روشناس کرادیا۔انہیں اپنے اندر کی پوشیدہ انقلابی صلاحیتوں کا ادراك ہوا کہ کمزور طبقات ہی دراصل حقیقی طاقت کے

مالک ہوا کرتے ہیں۔اس عہد کی زندہ و تابندہ تحریکوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ انقلاب اور سماج کی سوشلسٹ تبدیلی مکمل طورپر قابل عمل بھی ہے اور ممکن بھی۔

اپنی شکست کے باوجود 1968ء کا تحریکی عہد ضائع نہیں گیا نہ ہی جائے گا۔ٹراٹسکی نے درست کہاتھا کہ ”کوئی بھی جدوجہدرائیگاں نہیں جایا کرتی“۔1968/69ء کا عرصہ تاریخ کے صفحات کی ناقابل فراموش داستان کے طورپر محفوظ ہے۔اس عہد اور اس صورتحال کی بازگشت اس کے بعد کے وقت اور موجودہ عہد میں بھی گونج رہی ہے۔ایلن وڈز نے فرانسیسی انقلاب کی چالیسویں سالگرہ پر یکم مئی 2008ء کو لکھے گئے اپنے مذکورہ بالا مضمون کو ان الفاظ میں ختم کیاہے”ہمارے پاس فرصت نہیں ہے کہ ہم ان پیٹی بورژوا سابق انقلابیوں کی طرف کوئی دھیان بھی دیں جواس عہد کے انقلابی رحجان کو جذباتی اور مسخرے پن کے ساتھ کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں جیسے یہ زمانہ قدیم کا کوئی قصہ ہے اور اس کا آج کی دنیا اور اس کے موجودہ حالات سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔ جلد یا بدیر 1968ء کہیں نہ کہیں سے پھرسے ابھرنے والا ہے۔کون سا ایسا ملک ہے جہاں اس کے ابھرنے کے امکانات و آثار موجود نہیں! یہ فرانس بھی ہو سکتا ہے،یہ اٹلی بھی ہو سکتا ہے یہ پرتگال ،سپین ،یونان بھی ہوسکتے ہیں اور صرف یورپ ہی کیوں؟ہم تو اس سے آگے ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ہماری تمنا ہے کہ ایسا ہو۔ہم اس کے ہونے کے منتظر بھی ہیں اورمتمنی بھی۔ہم اس کیلئے تیار بھی ہیں اور اس کیلئے تیاری بھی کرر ہے ہیں۔تاکہ اس بار یہ کامیابی کے اور کامیابی اس کے قدم چومے۔فرانس کی مرحوم انقلاب کی سالگرہ کے جشن کے اس موقع پر ہم یہ نعرہ لگاتے ہیں؛انقلاب زندہ باد“۔(21)

انقلاب قطعی طورپر روزمرہ کا کوئی معمول نہیں ہواکرتے۔یہ اپنے اظہار کیلئے کئی سال کئی دہائیاں بھی لگا دیا کرتے ہیں۔یہ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم پچھلے گزرے واقعات سے لازمی اسباق سیکھیں،ان بڑے دیوہیکل تاریخی واقعات سے جو 1968/69ء میں سامنے آئے۔سچ تو یہ ہے کہ سب سے درست نتیجہ اور سبق ٹراٹسکی نے آج سے ٹھیک 70سال پہلے اخذ اور بیان کیاتھا ، یہ سبق آج بھی 40سال پہلے 1968ء کی انقلابی تحریک کے حوالے سے انتہائی اہم اور فیصلہ کن سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1938ء میں چوتھی انٹرنیشنل کی پہلی کانگریس کے موقع پر ٹراٹسکی نے کہا تھا ”نسل انسانی کا تاریخی بحران آج سمٹ کر انقلابی قیادت کے بحران میں ڈھل چکا ہے“۔

اس کے دو سال بعد ہی ٹراٹسکی کو 1940ء میں میکسیکو میں سٹالن کے ایک ایجنٹ نے قتل کر دیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا میں طاقتوں کا تواز ن مکمل طورپر بدل چکاتھا۔مغربی سامراج کوسوشل ڈیموکریسی اور محنت کشوں کی روایتی پارٹیوں کی سٹالنسٹ قیادت کی مصالحتوں اور غداریوں کی وجہ سے وقت اور وقفہ میسرآتا رہا۔1948ء سے 1973ء کے عرصے کاطویل ترین سرمایہ دارانہ عروج ان عناصر

میں سے اہم ترین عنصر تھا جس نے سوشل ڈیموکریسی کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا جو یورپ میں انقلاب کے ممکن نہ ہونے میں ایک عنصر بنا۔دوسری طرف روس‘ چین اور مشرقی یورپ کے اندر سٹالنزم کے ابھار اور فروغ نے ایک لمبے عرصے کیلئے ’کمیونسٹ پارٹیوں‘کی اتھارٹی کو مضبوط بنائے رکھا۔ **1917**ء کے بالشویک انقلاب نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں انسانی تاریخ میں پہلی بار منصوبہ بند معیشت کو متعارف کرایا تھا جس نے ایک بڑے عرصے تک حیران کن ترقی کے رستے کھول دیے۔سٹالنسٹ طرز حکمرانی کے باوجودبھی اکتوبر انقلاب کی بنیادوں پر استوار ہونے والی اس طرز معیشت نے سائنس ، ٹیکنالوجی اور پیداواری شعبے میں معجزانہ شرح ترقی کو جنم دیا۔جس نے ان سٹالنسٹ ممالک میں معیار زندگی کوبدل کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ سے کئی نظریاتی غلط فہمیاں اور طلسماتی خوش فہمیاں پیدا ہوتیں ور فروغ پاتی چلی گئیں۔خاص طورپر نوآبادیاتی ملکوں میں اس کی بھرمار ہوگئی۔یہ سبھی عناصر و عوامل **1968/69**ء کے انقلابی ابھار کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنے اور یوں ممکنہ سوشلسٹ فتوحات شکست میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔

تاہم سٹالنزم کے انہدام کے بعد اور وحشت و بربریت کی انتہائوں کو پہنچے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی سفاکی نسل انسانی کو جس مقام پر اورجس کیفیت میں لے آئی ہے ،اس سے یہ ثابت ہو تا ہے کہ کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت کیلئے زندہ رہنا وبال اورمحال ہو چکا ہے۔ہر گزرتا دن ا س کیفیت کو مزید بد سے بدتر کرتا چلا جارہاہے۔اور یہ کیفیت زیادہ عرصہ برقرارنہ رہ سکتی ہے‘ نہ رہے گی۔نسل انسانی کوزندہ رہنے کی جستجو سے کبھی بھی محروم نہیں کیا جا سکتا ۔ تاریخ میں کچھ بھی ضائع نہیں ہو اکرتا۔اس کا کوئی نہ کوئی مقصدضرور ہوا کرتا ہے۔پچھلی کچھ دہائیوں سے حکمران سرمایہ دار طبقات کی خونریزیاں عیاں جبکہ مزدورتحریک پر اصلاح پسندی اورسٹالنزم کی اتھارٹی اور ساکھ مکمل طورپر ختم ہو چکی ہے۔

ایک نیا عہد ہمارے سامنے دامن کشا ہو رہاہے جس میں ہم حقیقی انقلابی مارکسزم کے تناظر اور پیشن گوئیوں کی سچائی کو اپنے سامنے کارفرما ہوتا دیکھیں گے ۔ نئی تحریکیں اور ابھار ہما رے سامنے رونما ہونے والے ہیں۔طبقاتی جدوجہد پھر سے وقت اورتاریخ کا ایجنڈا بن چکی ہے۔ بدیر نہیں بلکہ جلدانقلابی تحریک ابھرے گی مگر تاریخ نے کبھی خودکو پہلے جیسے انداز میں نہیں دہرایابلکہ یہ اپنا اعادہ ہمیشہ پہلے سے بڑے اور بلند انداز میں کیا کرتی ہے۔ہم ایک نیا **1968/69**ء ہوتا دیکھیں گے جو زیادہ عمومی‘ زیادہ عوامی‘ زیادہ عالمی اندازمیں ہوگا۔اورجواپنی شدت‘ اپنی وسعت اور اپنی قوت میں کہیں بلند معیار کا حامل ہوگا۔اور اس بار ہم نے اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ جو غلطیاں ماضی میں سرزدہوئیں اس باروہ نہ ہونے پائیں ،نہ ہونے دی جائیں۔ اب غلطی یا غلطیوں

کی گنجائش نہیں ہوگی۔

ہمارا فریضہ ہے کہ ہم عالمی مارکسی رحجان کوتعمیر کرتے ہوئے اسے کرہ ارض کی قائدانہ طاقت بنائیں۔ ہمیں اسے یقینی بنانا ہے کہ سچے مارکسزم کی آواز کسی طور بھی صدا بہ صحرا بن کے نہ رہ جائے۔ہر ایک ملک میں ہمیں مارکسی رحجان کو مزدورتحریک کیلئے تسلیم شدہ قوت کے طورپر منوانا ہے۔ہمیں ہر ممکن طورپر محروموں اور نوجوانوں کے سب کچھ بدل کے رکھ دینے والے جوش وجذبے کی توانائی کو منظم کرنا ہوگا۔موجودہ حالات ایک سوشلسٹ فتح مندی اور تبدیلی کیلئے سازگار ہو چکے ہیں۔فتح کی منتظر اور تمنائی ایک طبقاتی جدوجہد سامنے آنے کو ہے۔ایک خالص کمیونسٹ مستقبل جو محروموں کو محرومیوں سے ہمیشہ کیلئے محروم کردے گا ،ہمارا منتظر ہے۔

نوٹس

1۔ ٹیڈ گرانٹ ، ان ٹوٹ دھارا(انگریزی)، صفحہ414

2۔ فرانس میں دوہری طاقت، ملیٹنٹ کا لیف لیٹ(انگریزی)، مئی 1968ء

3۔ ’انقلابی تیاریاں ‘سے اقتباس صفحہ12

4۔ لندن ٹائمز21.5.1968

5 ۔ فنانشل ٹائمز، لندن 20.5.1968

6۔ٹائمز، لندن 23.5.1968

7۔ ٹائمز، لندن 24.5.1968

8۔ ٹائمز لندن21.5.1968

9۔ صفحہ464-65

10۔ www.marxist.com

11۔ ایلن وڈز، آئرش ریپبلکنز کے نام ایک کھلا خط، ری پبلکن ازم کی انقلابی جدلیات(آٹھواں حصہ) اکتوبر 2003ء

12۔ ونسٹن چرچل، فتح اور المیہ، صفحہ227-8

13۔ ایضاً صفحہ229

14۔ ٹیڈ گرانٹ، ان ٹوٹ دھارا، صفحہ167

15۔ ٹیڈ گرانٹ، روس انقلاب سے رد انقلاب تک ، (انگریزی)، صفحہ227-228

16۔ ایلن وڈز، چیکوسلواکیہ(1968): سٹالنزم ، بحرانوں کی لپیٹ میں ، ستمبر 1968ء

17۔ جیرمی آئزکس اینڈ ٹیلر ڈاؤننگ، سرد جنگ (انگریزی)، صفحہ216

18۔ ایلن وڈز، مارکسزم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ

19۔ ٹیڈ گرانٹ، ان ٹوٹ دھارا

20۔ ٹیڈ گرانٹ، آئبیریا کا انقلاب: مارکسزم اور عالمی صورتحال کا تاریخی ارتقاء، صفحہ17، 1975ء

21۔ www.marxist.com، یکم مئی 2008ء

برصغیر کا خونی بٹوارہ
پاکستان کے جنم کی تکلیف

”لیبر اور کانگریس اپوزیشن،ان دونوں کے اضطراب میں کوئی حقیقی تعلق نہیں ‘ لیکن ان دونوں کی بیک وقت موجودگی لارڈ ارون کی لیبر مسائل کی طرف خصوصی توجہ کی درست وضاحت اوراسے جواز فراہم کرتی ہے“۔

(لندن ٹائمز،29جنوری1928ء)

”اب ایک ایسی صورتحال پیدا ہو رہی تھی جہاں ہم جناح کی نسبت بٹوارے کی زیادہ حمایت کررہے تھے۔ میں نے جواہرلال کو

خبردار کیا کہ اگر ہم نے بٹوارے کی حمایت کی تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تاریخ کا فیصلہ ہوگا کہ ہندوستان کو مسلم لیگ نے نہیں بلکہ کانگریس نے تقسیم کیا"۔

(مولانا ابوالکلام آزاد 1958-1888ء)(1)

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں وضاحت کر چکے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں دنیابھر میں انقلابی لہروں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ چل نکلاتھا۔یہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں ہی نہیں ہورہاتھا بلکہ چین جیسے پسماندہ ممالک بھی سرخ آندھی کی لپیٹ میں تھے ۔یہ واقعات عالمی سطح پر سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کیلئے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے تھے۔ حکمران طبقے میںایک خوفناک سراسیمگی ہر طرف پھیل چکی تھی۔انسانی تاریخ میں محروم طبقات کی طرف سے کی جانے والی یہ شاید سب سے بڑی سرگرمی و سرکشی تھی۔نوآبادیاتی چین،افریقہ،مشرق وسطیٰ ،انڈونیشیااور برصغیرمیں عوام کی یہ بیداری انتہائی بے مثال تھی۔اس شاندار تحریک میں غلاموں نے اپنے گلے سے طوق اتارکر مالکوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دیاتھااوروہ اپنی قومی آزادی کی لڑائی کیلئے متحرک ہو چکے تھے۔ مارکسسٹ ان نوآبادیاتی انقلابات کی اس لئے حمایت کررہے تھے کیونکہ یہ ایک انقلابی تحریک تھی جو سامراج کے لئے شکست وہزیمت کا سامان لئے ہوئے تھی اور جو محروم انسانوں کو سراٹھاکر جینے کا راستہ دے رہی تھی اور یوں طبقاتی جدوجہدکو نئی شکتی فراہم کررہی تھی۔

اگر برصغیر کی قومی آزادی کی تحریک درست طورپر اپنا عمل مکمل کر پاتی تو یہ صرف برصغیر کی ہی برطانوی سامراج سے آزادی تک خود کو محدود نہ رکھتی بلکہ یہ پیش قدمی کرتے ہوئے سرمایہ داری اور برطانوی راج کی گماشتہ جاگیرداری کو جڑوں سے اکھاڑتے ہوئے سماجی و معاشی تبدیلیوں کو بھی ممکن کر سکتی تھی۔ایساہوجاتا تو اس سے دنیا بھر میں سرمایہ دارانہ نظام کو سنجیدہ خطرے سے دوچار کیا جاسکتا تھا۔لیکن برطانوی سامراج اپنی تیار کردہ،پروردہ اور لے پالک ہندو مسلمان قیادت کے ساتھ مل کر اس قومی آزادی کی تحریک کو نسلی و مذہبی روپ دینے میں کامیاب ہوگیا ۔کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکی سٹالنسٹ قیادت نے بھی اس بدترین المیے میں انتہائی مجرمانہ کردار اداکیا۔جولائی 2001ء میں شائع ہونے والی کتاب" Partition;Can It Be Undone"کے دیباچے میںٹیڈ گرانٹ (1913/2006ء) نے لکھاتھا"برصغیر کی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم برطانوی سامراج کا جرم تھا۔برطانوی سامراج برصغیر پر اپنا قبضہ برقراررکھنا چاہتاتھا لیکن 1946/47ء میں برصغیر میں پھوٹنے والی انقلابی صورتحال نے برطانوی سامراج کی نیندیں حرام کر دیں اور ان کو یہ احساس ہوگیا کہ معاملات ان کی

گرفت سے نکلتے جارہے ہیں۔برطانوی راج کی فوج زیادہ تر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی جس پر وہ بھروسہ اور تکیہ نہیں کر سکتے تھے“۔

اس تقسیم نے جدید انسانی تاریخ کی سب سے بڑی انسانی ہجرت کے المیے کو جنم دیا۔یہ ہجرت تاریخ کی سب سے بڑی خونریز ہجرت بھی تھی۔کم از کم دس لاکھ انسانی زندگیاں اس کی بھینٹ چڑھیں جبکہ سولہ لاکھ انسانوں کو سرحدیں عبورکرکے نقل مکانی کرنی پڑی۔یہ تھابرصغیر پر دوسو سالہ برطانوی راج کاہلاکت خیزانجام و اختتام۔ جس پالیسی کے تحت اس راج نے اپنی ابتدا کی تھی،اسی پالیسی پر ہی اس نے اپنا خاتمہ بھی کیا؛یعنی تقسیم کرو اور حکمرانی کرو۔

برصغیر پر سامراجی تسلط اور اس کی ترقی کے تناظر کے حوالے سے سب سے پہلا سائنسی اور شاید سب سے سچا تجزیہ کارل مارکس نے اس وقت کیاتھا جب برطانوی سامراج نے اپنے قدم بھی نہیں جمائے تھے۔مارکس نے یہ تحریر **1857**ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھی تھی۔اس وقت کی اپنی تحریروں میں مارکس نے برطانوی راج کی معاشی و سماجی بنیادوں کی وضاحت کی تھی اور اس کے برصغیر کے مستقبل پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیاتھا۔**22**جولائی**1858**ء کی اپنی تحریر میں مارکس نے کہا:

”اگر ہم ہندوستان کی قدیم تاریخ کو نہ بھی جانتے ہوں تو بھی یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان اس وقت برطانیہ کے شکنجے میں ہے اور وہ بھی ہندوستان کی ہی فوج کے ہاتھوں ‘ اوروہ بھی ہندوستان ہی کی قیمت پر۔ انگلینڈ کے ہندوستان میں دو مشن تھے؛ایک تباہ کن تھا جبکہ دوسرا ترقی پسند یعنی قدیم ایشیائی سماج کا خاتمہ کرتے ہوئے اس کی جگہ ایشیا میں مغربی سماج کی مادی بنیادیں قائم کرنا تھا۔ عرب، ترک، تاتاری اور مغل جنہوں نے کامیابی سے ہندوستان پر حکمرانی کی تھی لیکن یہ سب سرپھرے وحشی حکمران تاریخ کے ایک آفاقی قانون کے تحت اپنے سے بہتر و برترتہذیب میں‌ضم ہوتے رہے اور جلد ہی ہندوستانی سماج اوراس کی تہذیب و ثقافت کا حصہ بنتے گئے۔برطانوی ہندوستان کے پہلے فاتح تھے جو کلچر میں ہندوستان سے برتر تھے۔اس لئے وہ ہندو تہذیب کے زیر اثر نہ آسکے۔انہوں نے یہاں کی قدیمی سماجی اکائیوں کو تہس نہس کردیا۔برصغیر کی صدیوں پرانی دستکاری صنعت کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ یوں‌ہندوستان کا سماج عرصہ دراز سے جن بنیادوں پر قائم ودائم چلا آرہاتھا،اس کو اس جدیداوربرتر کلچر نے تہہ و بالا کردیا۔برصغیر میں برطانوی حکمرانی کی ساری تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو ہمیں سوائے ایک بڑی بربادی کے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔اس قدر وسیع پیمانے کی تباہی کے بعد وہاں تعمیر نو یا بحالی نہ ہونے کے برابرہے،تاہم یہ بحالی شروع ہو چکی ہے ۔ہندوستان کی سیاسی وحدت عظیم مغلوں کے دور سے کہیں زیادہ مرتکز شکل میں سامنے آئی۔یہ بحالی کی پہلی اور ابتدائی کیفیت تھی۔برطانیہ کی مسلط کردہ یہ وحدت

اب الیکٹرک ٹیلیگراف کے ذریعے مزید مضبوط و مستحکم ہوگی۔وہ وقت دور نہیں رہا جب ریلوے اور سٹیم انجن کی مدد سے برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان زمانی فاصلہ بہت کم ہو کر رہ جائے گا۔برطانیہ کے حکمران طبقات کو حادثاتی طورپر ہندوستان کی ترقی کیلئے ایک عبوری مرحلے سے گزرناپڑرہاہے۔برطانو ی اشرافیہ اس ملک کو فتح کرنا چاہتی ہے جبکہ اس کے تاجر اس کو لوٹنا چاہتے ہیں ، اور یہاں کے کروڑ پتی اسے بیچ کے کھا جانا چاہتے ہیں۔اس کارخیر کیلئے ہندوستان سے بہتر جگہ کوئی اور کہاں ہو سکتی ہے جہاں سب کچھ اتنی بہتات میں موجود ہے کہ یہ سب مل کر آپس میں بندربانٹ کر سکتے ہیں۔بورژوا تہذیب کی کامل منافقت اوراس کی وراثتی بربریت یہاں ہمارے سامنے عیاں ہوتی نظر آتی ہے۔اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ بنی ٹھنی سجی سنوری تہذیب جب اپنی نوآدیات میں داخل ہوتی ہے تو مکمل طورپر ننگی ہوجاتی ہے“ ۔(2)

مزاحمت اور غداریاں

برطانوی راج کے سارے عرصے کے دوران اس کے خلاف مزاحمت کسی نہ کسی شکل میں ہوتی رہی۔کسان بغاوتوں میں حصہ لیتے رہے۔انفرادی عوامی ہیروبرطانوی طاقت کے ساتھ نبردآزما ہوتے رہے جنہیں مغربی مورخین ڈاکو قراردیتے تھے۔افغان جنگوں سے قطع نظر،کوئی بھی عرصہ ایسا نہیں تھا جب برطانوی راج کو چیلنج نہ کیاجاتارہاہو۔بیسویں صدی کے آغاز میں تو ہم مسلح افواج کے اندر بھی پرولتاری جدوجہدہوتی دیکھتے ہیں جب سپاہی اور جہازی براہ راست سامراجی تسلط کے خلاف بغاوت اور سرکشی کرتے ہیں۔

یہ برطانیہ سے تعلیم یافتہ ہندوستانی سیاستدان ہی تھے جنھوں نے کانگریس کی بنیاد رکھی‘کولن(Collin)اور لیپئر (Lapierre) کے مطابق”ایک معزز سرکاری اہلکار نے1895ء میں کانگریس پارٹی قائم کی۔ وائسرائے کی آشیرباد سے اوکٹاوین ہیوم نے ایک تنظیم تخلیق کرنے کا بیڑہ اٹھایا جس کا مقصد راج کے خلاف اٹھنے والی مزاحمتوں کا توڑ کرنا تھااور اس مقصد کیلئے پڑھے لکھے طبقات کی نشوونماکرتے ہوئے معتدل مزاج ،مصالحت پسنداور ذمہ دارافراد پر مبنی ایسے حضرات کی کھیپ تیار کرناتھا جو بوقت ضرورت انڈیا کے برطانوی حکمرانوں کے ساتھ خوشگوار ماحول میں مذاکرات کرنے کی صلاحیت سے مالامال ہو“۔(3)

پہلی عالمی جنگ کے دوران کانگریس پارٹی نے مکمل طورپر برطانوی سامراج کی امداد اور حمایت کی۔اس دوران کانگریس نے برطانوی راج کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والے غدر پارٹی سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو ہونے والی پھانسیوں پر مجرمانہ

خاموشی اختیار کئے رکھی۔ 1915ء اور1916ء کے عرصے کے دوران کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاسوں میں برطانوی گورنروں کی موجودگی میں ان کی عظیم خدمات کیلئے شاندار خراج تحسین پیش کیا۔روس میں 1917ء کے بالشویک انقلاب میں لینن کے ساتھ انقلاب کی قیادت کرنے والے لیون ٹراٹسکی(1879/1940ء)نے اپنی زندگی کی آخری تحریروں میں سے ایک میں ہندوستان کے بارے میں حسب ذیل لکھا؛

”ہندوستان کی بورژوازی کبھی بھی ایک انقلابی جدوجہد کی قیادت کی اہل نہیں ہو سکتی۔یہ برطانوی سرمایہ داری کی غلام ہے اور مکمل طورپر اس کی مطیع اور حاشیہ بردار ہے۔یہ اپنی جائیدادوں کے تحفظ کیلئے سبھی حدودوقیود سے گزرنے کیلئے تیاررہتی ہے۔یہ عوام سے انتہائی خوفزدہ ہے اور برطانوی سامراج سے سمجھوتہ کرنے کیلئے مری جارہی ہے خواہ اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔یہ عوام کو اصلاحات کی لوریاں سنا سناکر اسے نیند میں غرق رکھناچاہتی ہے۔اس بورژوازی کا لیڈر اورپیمبر گاندھی ہے ۔وہ ایک مصنوعی لیڈر اور جھوٹا پیامبر ہے۔(4)

گاندھی کو، 1910/1916ء تک کے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی جانب سے ”قیصر ہند “کے خطاب سے نوازا گیاتھا۔ جب 1947ء میں وائسرائے مائونٹ بیٹن نے ملکہ الزبتھ کی پرنس فلپ کے ساتھ شادی کے موقع پر‘ جسے شاہی خاندان نے اس کے بچپن سے پالاپوساتھا،گاندھی کو برطانیہ بلایاتو اس نے انتہائی بیش بہا تحفے کے ذریعے شاہی جوڑے اور شاہی خاندان کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہارکیا۔YORK MW102گاڑی‘ قدیمی زیورات،مغلیہ عہد کی نایاب تصاویر، جواہرات اور چاندی سے مزین پلیٹیں،یہ سب ایک ایسی لڑکی کیلئے شادی کا تحفہ تھا جس نے آگے چل کر ملکہ برطانیہ بنناتھا۔اس موقع پر گاندھی نے چرخے پر تیار شدہ خاص کپڑا (ٹی کوزی)بھی پیش کیا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے ہی چرخہ کات کر بناتھا۔ 15جنوری1948ء کو گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے حق ملکیت کا دفاع کرتے ہوئے کہا ”میں کبھی بھی کسی ایسی سرگرمی کا حصہ نہیں بنوں گا کہ جس میں مالکوں کو ان کی جائیدادوں سے محروم کردیاجائے۔طبقاتی جنگ کے خلاف میں اپنی ہر قسم کی اتھارٹی اور اثرورسوخ استعمال کروں گا۔اگر کوئی بھی آپ کو آپ کی جائیداد سے محروم کرناچاہتاہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے شانہ بشانہ اس کے خلاف لڑائی میں شریک ہوں گا“۔(5)

جناح کا موقف بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا ۔اس کا طرز بود وباش ،رہن سہن ،لباس اور مزاج برطانوی تھا اورانگریزوں سے ملتا تھا اور جو کسی طور بھی برصغیر کے مسلمانوں کی طرز کا نہیں تھاجن کی نمائندگی کا وہ دعویدار تھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی انگریزوں کے ساتھ اپنا ناطہ نہیں توڑا تھا۔ اپریل 1947ء میں اس نے لارڈ مائونٹ بیٹن کے ساتھ اپنی بات چیت میں کہا:

”مجھے ابھی اس کی کوئی فکر نہیں کہ آپ مجھے کتناکم دیتے ہو،جب تک کہ آپ مجھے پورے کا پورا نہیں دے دیتے ۔میں آپ کو کوئی بھی نامعقول مشورہ نہیں دیناچاہتا لیکن آپ کو یہ خیال رکھناہوگا کہ نیاپاکستان برطانوی سلطنت سے اس کا زیرنگین رہنے کا خواہشمند رہے گا“۔

تقسیم کے حوالے سے جناح کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ اس نے اگست 1946ء میں کہا: ”یا تو ہندوستان تقسیم ہوگا یا یہ تباہ ہوگا“۔یہاں ہمیں جناح ایک واضح یو ٹرن لیتانظرآتا ہے ،یہی جناح تھا جس نے 1933ء میں ایک” غیر مسلم “والڈروف ہوٹل لندن میں کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم رحمت علی کی طرف سے دی گئی دعوت میں پاکستان نام کے ملک کی تجویز پر طنزیہ قہقہہ لگایا تھا بعد ازاں اس نے برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکشن کمیٹی میں بات کرتے ہوئے ایک الگ ملک کے تصور کو ایک بچگانہ خیال اور ناقابل عمل قراردیاتھا۔ (6)

80 کی دہائی میں کرسٹینا لیمب نے اپنی مشہور کتاب”اللہ کا انتظار “میں کہا‘ ”اگر جناح زندہ ہوتا تو پاکستان کے سخت گیر اسلامی قوانین کے تحت سزا پا چکاہوتا،وہ ایک ایسا سردمزاج قوم پرست تھا جو مذہب اور سیاست کو بہرصورت ایک دوسرے سے منسلک یا نتھی کرنے کے خلاف تھااور جو 1930ء کی دہائی کے وسط سے ہی اس بات کو فخر سے بیان کرتارہا کہ وہ پہلے ہندوستانی ہے اور بعد میں مسلمان ۔ جناح نے بعد ازاں ملائوں کے نعروں کو خود اپنے مستقبل سمیت مسلمان کاروباریوں اورزمینداراشرافیہ کے محفوظ مستقبل کا رستہ سمجھ لیا“۔

کانگریس سے جناح کی علیحدگی کی بنیاد مذہبی نہیںتھی بلکہ طریق کار کے اختلافات تھے۔مذہب کی بنیاد پر جدائی ایک دہائی بعد کا معاملہ ہے۔نوآبادیاتی ریاست اس کیلئے ہوشیاری سے دھیرے دھیرے حالات اور رستے ہموار کر رہی تھی۔لندن میں جب ہندوستان میں جاری مزاحمتوں کے اثرات سنجیدگی سے محسوس کئے جانے لگے تو یہ سوال ابھرا کہ وہاں کوئی مقامی حکومت کی قسم کا منصوبہ عمل میں لانا ضروری ہوگیاہے تاکہ وہاں سماجی بے چینی اور بغاوت کے رستے محدود اور مسدود کئے جاسکیں۔ 1932ء میں سر تھیوڈور موریسن جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا سابق پرنسپل رہ چکاتھا،نے مذہب کی بنیاد پر علیحدگی کے حق میں ایک متاثرکن مضمون لکھا۔اس مضمون میں اس نے ایک صوفیانہ خاکہ پیش کیا جو آگے چل کر مسلمانوں کے ایک الگ قوم کے تصور کی بنیاد بنا۔

”ہندو اور مسلمان ویسی ہی دو مختلف قومیں ہیں جیسی کہ دو مختلف یورپی قومیں۔مسلمان قوم کسی طور بھی ایک بیگانی حکومت کے تحت زندگی نہیں گزار سکتی۔خاص طورپر ایک ایسی نام نہاد جمہوری حکومت کے تحت جو اپنے شہریوں کے

ساتھ امتیاز برتتی ہو۔مسلمانوں کو اس بات کی ضمانت دی جانی چاہئے کہ وہ اپنی تہذیبی صفات وخصوصیات کے تحفظ کیلئے خود کو تنہانہ سمجھیں "۔(7)

مسلمانوں کیلئے الگ طریق انتخاب کا اصول قبول کیاجاچکاتھا جس سے ہندوستان میں کمیونل سیاست کو پروان چڑھانے کا عمل شروع ہوتاگیا ۔لیکن ایک الگ مسلم ملک کے طورپر پاکستان کا معاملہ ، مسلم لیگ اور مسلم عوام دونوں کیلئے 1944/46ء کے عرصے میں زیادہ توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن کرسامنے آیا۔آج وہ مورخ یا مفکر جو یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا تصور اس حقیقت کی غمازی کرتاہے کہ مسلمان ایک الگ قوم تھے ،وہ محض تاریخ کو دہرانے کا مظاہرہ کر رہے ہیں ،ان سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمان کب ایک الگ قوم کے طورپر سامنے آئے تو ان مذہبی مورخین و مفکرین سے اس سوال کا کوئی متفقہ و مصدقہ جواب ملنا محال ہے۔

شیعہ سنی تفریق کو ایک طرف رکھتے ہوئے ،مسلمانوں میں کئی ایسے رحجان تھے جو خود کو ریفارمر یا پھرحقیقی مذہب کا صحیح اور سچا علمبردار وپیروکار گردانتے تھے۔اور یہ سب رحجان ایک دوسرے کی حقانیت کو چیلنج کرتے رہتے تھے۔ان میں سے کچھ سقہ بند علماء باقاعدہ طورپر انگریزوں کے تنخواہ دار بھی تھے اور برطانیہ کے حکم پر فتوے اور احکامات بھی صادر کیاکرتے تھے۔کئی علماء نے کانگریس کا ساتھ دیتے ہوئے ایک متحدہ و مخلوط نیشنلزم کے تصور کی حمایت کی۔کچھ علماء البتہ مسلم امہ کی عالمگیر حکومت کے لئے نعرہ زن تھے ' یہاں تک کہ وہ ایک ملک میں اسلام کے تصور کے ہی سخت مخالف تھے۔یہ تصور ابوالاعلی مودودی کا تھا جس نے 1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تھی تاکہ سیکولر نیشنلزم کے علمبردار اپنے حریفوں ،دیو بندگروپ اور مسلم لیگ کے مقاصدکا کھلے عام مقابلہ کر سکے۔ مودودی نے جناح پر الزام عائد کیا کہ وہ "اسلام کی بجائے مسلمانوں کے 'دنیاوی 'سماجی و معاشی مفادات کے "زیراثر سب کچھ کر رہاتھا۔اس نے برملا اعلان کیا کہ" جناح سے لے کر معمولی عہدے کا حامل مسلم لیگ کا کوئی بھی ایک لیڈراسلامی ذہنیت یا اسلامی شعار سے قطعی طورپر بے بہرہ ہے اورنہ ہی ان میں سے کوئی سماجی و معاشی مسائل کو اسلامی نقطہء نظر سے دیکھنے کا اہل اور حامل ہے۔ان کا گھنائونا کردار بس اتناہے کہ کسی نہ کسی حیلے بہانے یا سازباز سے ہندوستانی مسلمانوں کے مادی مفادات کا تحفظ کر سکیں"۔(8)

ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کا فیصلہ کن مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب 1917ء میں روس میں بالشویک انقلاب کا تاریخ ساز واقعہ رونماہوا۔ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کے کئی سرگرم کارکن اور راہنما روس میں ہونے والے اس انقلاب سے انتہائی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔اقبال جیسے شاعر نے کارل مارکس کے بارے میں قرار دیاکہ" اس کے پاس کتاب (داس کیپٹل) تو ہے لیکن وہ پیغمبر نہیں ہے"۔روس کے

انقلاب نے سب سے زیادہ نوجوانوں کو متاثر کیا۔ہندو سوشلسٹ ریولیوشنری آرمی Hindu Socialist Revolutionary Armyکا قیام اس تبدیلی کا ہی عملی اظہار تھا۔بھگت سنگھ ،راج گرو،سکھ دیو اوربی کے دت کے کارہائے نمایاں اپنے الٹرا لیفٹ ہونے کے باوجود انتہائی جاندار تھے اور برطانوی راج کے جبرو استحصال کے خلاف نوجوانوں کے اعلان بغاوت کی شاندار مثال ہیں۔آزادی اور انقلاب کیلئے درست مارکسی رہنمائی دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ مسلح جدوجہد کا رستہ اختیارکرنے پر مجبورتھے۔HSRAکے کچھ سرپھروں نے 8اپریل1929ء کے دن ایک اسسٹنٹ پولیس سارجنٹ جے پی سانڈرس کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔دو نوجوانوں کو دہلی میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے اندر بم پھینکنے کے الزام میں گرفتار کیاگیا ان میں سے ایک بھگت سنگھ تھا۔نوجوانوں کی اکثریت نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی ان میں سے ایک نوجوان جیتن داس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اس وقت زبردستی کھانا کھلا نے کی کوشش کے دوران ہلاک کر دیا گیا جب وہ اپنی بھوک ہڑتال کے 63دن پورے کرچکاتھا۔

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی نوجوانوں کے مقدمے نے سارے ہندوستان میں شہرت حاصل کرتے ہوئے گہرے اور شدید اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے اور سماج میں بائیں بازو کا ایک عمومی رحجان مرتب اور متحرک ہونے لگا۔یہ مقدمہ سماج کی ہر پرت میں بحث و تمحیص کا محور بنتا چلاگیا۔ملزمان کے ساتھ یہ سماجی ہمدردی اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ گواہان استغاثہ کے خلاف سر چڑھ کر بولنے پر اتر آئے۔ یہاں تک کہ ایک برطانوی سپاہی نے بھی بھگت سنگھ کو شناخت کرنے سے انکار کردیا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بھگت کو قتل کے وقت دیکھا تھا۔بھگت سنگھ کا مقدمہ پانچ ماہ تک چلا۔اس کا فیصلہ 7 اکتوبر1930ء کو سنایاگیا۔ان سچے اور سرپھرے نوجوانوں کی مقبولیت اور ان کی سرخ انقلاب کی طرف رغبت نے اس قدر جوش ولولہ پیداکیا کہ ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کو ایک نیا جذبہ ملا اور تحریک کی بورژوا قیادت کو اپنے پائوں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہونا شروع ہو گئی۔ ہندوستان میں سفر کرنے والے ایک برطانوی سیاح سی ایف اینڈریوزنے 1932ء میں لکھا کہ"اس وقت انڈیا میں وہی کیفیت نظر آتی ہے جو آج سے انیس سو سال پہلے سلطنت روم میں پائی جاتی تھی۔بظاہر ہر طرف حکمرانوں کی عملداری نظر آتی تھی اور سب اچھا معلوم ہوتا تھا لیکن اس بظاہر خاموشی کی تہہ میں ایک ایسا اضطراب موجود تھا جو کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح پھٹنے کو بیتاب ہورہا تھا۔ یہاں کے لوگ اس اضطراب کو قومی آزادی کی تڑپ قرار دے رہے ہیں"۔

برطانوی حکمرانوں نے گاندھی سمیت سبھی کانگریسی رہنمائوں کی تواتر کے ساتھ گرفتاریوں اور پھر رہائیوں کا سلسلہ جاری رکھا تاکہ ان بورژوالیڈروں کی عظمت،

جرات، قربانیوں اور جدوجہد کی داستانیں تراشی اور مقبول کی جاسکیں ۔برطانوی حکمرانوں نے گاندھی کو خاص طورپر قومی آزادی کی تحریک کو بائیں بازو کے اثرات سے بچانے اور اس کے طبقاتی رنگ اختیار کرجانے کے خدشے سے محفوظ رکھنے کیلئے بھرپور استعمال کیا۔تاہم خود کانگریس کے اپنے اندر اس کا رد عمل خاصا شدید تھا۔ڈاکٹرسبھاش چندربوس جو کہ کانگریس کے ایک معروف وموثر بائیں بازو کا رہنماتھا،نے کانگریس کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”ہمارے اور برطانویوں کے درمیان خون کے سمندراور لاشوں کے پہاڑ حائل ہیں۔گاندھی نے برطانیہ کے ساتھ جو معاہدے کئے ہیں ،دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مجبور نہیں کر سکتی ہے کہ ہم اسے تسلیم کر لیں“گاندھی جہاں کہیں بھی جاتاتھا غصے سے بھرے نوجوان سرخ جھنڈوں کے ساتھ اس کا سواگت کرتے اور اس پر سوالوں اور طنز و تشنیع کی بوچھاڑکردیتے ۔ وہ بعض اوقات اس کے ساتھ بدتمیزی سے بھی پیش آتے ۔کراچی میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کی کانفرنس کے دوران یہ نعرے لگائے گئے کہ گاندھی کا معاہدہ ہی بھگت سنگھ کو پھانسی چڑھائے جانے کا موجب بناہے۔19مارچ1931ء کو جب گاندھی لارڈ ارون سے ملنے جارہاتھا،بھگت سنگھ اور اس کے کامریڈز نے اپنے ساتھیوں کے صلاح مشورے سے وائسرائے کے نام ایک خط روانہ کیا۔اس خط میں رحم کی اپیل نہیں کی گئی تھی بلکہ وائسرائے سے کہا گیا تھا کہ حکومت انہیں جنگی قیدی سمجھتے ہوئے اس کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کرے اور ان کو پھانسی دینے کی بجائے گولی مار کر ہلاک کیا جائے۔

چار دن بعد ان کو لاہور سنٹرل جیل کے اندر پھانسی دے دی گئی۔بھگت سنگھ کی جیل کی ڈائری دلچسپ اور قابل مطالعہ مواد سے بھرپورہے جس میں بھگت نے جیل میں اپنی موت کی کوٹھڑی میں اپنے خیالات و نظریات کے ارتقاء کے بارے میں لکھاہے۔اس نے نوجوانی کے جوشیلے پن کو نامناسب قراردیاہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس نے گاندھی کے عدم تشددکے فلسفے” اہنسا “کی شدید مذمت بھی کی ہے۔بھگت یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایک سوشلسٹ انقلاب ہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی کی ضمانت بن سکتاہے۔یہ ذمہ داری اور فریضہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا تھا کہ وہ قومی آزادی کی جدوجہد میں شامل لیفٹ کے سبھی حصوں‘ پرتوں اور رحجانات کوہر حال میں یکجا‘ متحد‘ منظم اور متحرک کرتی ۔ اگر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسی طورطریقوں اور تناظر پر عمل پیراہوتی تو آج تاریخ کا دھاراہی مختلف ہوتااور ہندوستان کی تقسیم کے المیے کا سامنا بھی نہ کرناپڑتا۔

کمیونسٹ پارٹی

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکی بنیاد 26/28دسمبر1925ء کوکانپور میں ہونے والی کمیونسٹ کانفرنس میں رکھی گئی تھی۔اس کا کنوینر ستیہ بھکاتا تھا جبکہ اس کی

استقبالیہ کمیٹی کے چیئر مین حسرت موہانی تھے۔کامریڈ سنگاراویلو نے صدارتی خطبہ دیاتھا۔اس پارٹی کا اولین مرکز 1919ء میں برلن جرمنی میں قائم ہوا جسے بعد ازاں تاشقند روس میں 1920ء میں انڈین کمیونسٹس کے نام سے تشکیل دیاگیا۔مانابندرا ناتھ رائے 'جو کہ پارٹی کا مرکزی نظریہ ساز تھا اور جو جلاوطن تھا ،نے پارٹی کو تیسری انٹرنیشنل کے ساتھ وابستہ کرنے میں انتہائی اہم کردار اداکیا۔کانپور کی یہ کمیونسٹ کانفرنس ہندوستان بھر سے مختلف بائیں بازو کے گروپوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب رہی۔اس میں شریک مرکزی رہنمائوں میں بنگال سے مظفر احمد، یوپی سے شوکت عثمانی،بمبئی سے ایس اے ڈانگے ،لاہور سے عبدالمجیدسمیت سارے برصغیر سے نمائندے شامل تھے۔اس کانفرنس سے تقریباًتین سال پہلے 27اپریل1923ء کو "انقلاب" آفس ریلوے روڈ لاہور کی جانب سے ایک خط کے ذریعے بائیں بازو کے 25مہان رہنمائوں کو ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کرنے کی تجویز اور دعوت دی گئی تھی۔یہ خط کامریڈغلام حسین اور شمس الدین حسن کی جانب سے لکھا اور بھیجا گیاتھا۔ مزدوروں کی طرف سے جدوجہد کی بڑھتی ہوئی رغبت اور سماج کی وسیع پرتوں کی کمیونسٹ نظریات کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی وابستگی نے برطانوی راج کو دہلا کر رکھ دیاتھا۔کمیونسٹوں کو ابتدا سے ہی انتہائی سخت اور جانگسل حالات کا سامنا کرنا پڑ گیاتھا جبکہ اس کے مقابلے میں بورژوا سیاستدانوں اور پارٹیوں کوبرطانوی راج کے دوران موزوں اور کم مشکل حالات دستیاب رہے۔راج نے کمیونسٹوں کے خلاف کئی مقدمات قائم کئے جن میں سے دو کو عوامی مقبولیت میسر آ گئی۔ ان میں سے ایک کانپور بالشویک سازش کیس تھا جو کہ 1924ء میں ہوا۔اس کا مرکزی ملزم ایم این رائے تھاجسے اس کی غیر حاضری میں سزا سنا دی گئی جبکہ کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے آٹھ دیگر ارکان شوکت عثمانی،سنگاراویلوچیٹائر،ایس اے ڈانگے،آر سی ایل شرما،نیلینی داس گپتا،مظفر احمد،مولابخش اور پروفیسرغلام حسین کو گرفتار کرلیاگیا۔استغاثہ کی طرف سے درج کیاجانے والا مقدمہ تاج برطانیہ کی طرف سے دائر کیاگیاجس میں ملزمان پر برطانوی جمہوری اقدار کو سبوتاژ کرنے کی تہمت عائد کی گئی؛فیصلے میں کہا گیا کہ "ملزمان سیکشن121Aکے تحت سازش کے مرتکب پائے گئے ہیں' سازش یہ ہے کہ انہوں نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایک برانچ کوسارے برطانوی ہندوستان میں پھیلانے کی کوشش کی ہے ۔اس سازش کا مقصد ہے کہ تاج برطانیہ کے تحت قائم برطانوی ہندوستان کی خود مختاری کو ختم کردیاجائے"۔(9) اس مقدمے میں صرف چار ملزمان کو ہی سزا سنائی گئی۔ان میں نیلینی گپتا، ڈانگے، مظفر احمد اورشوکت عثمانی شامل تھے(ایم این رائے برلن میں تھا)ان چاروں کو چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

تاشقند روس میں ایک مرکز قائم کیاگیاجس میں ہندوستان میں کمیونسٹ نظریات

کے فروغ کیلئے کیڈروں کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی۔ان میں سے اکثر کو،جن کو” مہاجروں“کے نام سے پہچانا جاتا تھا، 1922ء کے آخر میں شمال مغربی سرحدسے ہندوستان داخل ہوتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔جبرو تشدد کی اس کیفیت میں سوائے چندایک کے باقی کمیونزم سے تائب ہوتے چلے گئے۔ان تمام تر کٹھن حالات کے باوجود کمیونسٹ گروپ ہندوستان کے بڑے شہروں میں پھلتے پھولتے اور پھیلتے رہے۔ان میں مدراس،بمبئی،لاہور،کراچی،کلکتہ اور یوپی کے شہر شامل تھے۔بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں برطانوی راج کے خلاف دوبڑی عوامی بغاوتیں سامنے آئیں۔بغاوت کی پہلی لہر 1919/1922ء تک چلی جبکہ دوسری اس سے بھی شدید لہر 1926/1927ء کے دوران ابھری تھی۔ہندوستانی پرولتاریہ کی طرف سے یہ پہلی بڑی کوشش تھی اور یہ اس کا جدوجہد کی تاریخ میں پہلا قدم تھا۔ جب فروری 1928ء میں سائمن کمیشن نے بمبئی میں قدم رکھا تو اس کا سارے ہندوستان میں احتجاجی مظاہروں کے ذریعے استقبال کیا گیا۔صنعتی پرولتاریہ کے اندر بے چینی اور اضطراب مسلسل بڑھتا چلا جارہاتھا۔1927ء کے دوران اس شعبے میں129ہڑتالیں کی گئیں جبکہ اس سے اگلے سال ہڑتالوں کی یہ تعداد بڑھ کر 209ہوگئی۔بمبئی میں ٹیکسٹائل ورکروں کی طرف سے ایک بڑی عام ہڑتال کی گئی۔اس ہڑتال میں پچاس کارخانے بند کر دیے گئے اور جو 26اپریل سے لے کر6اکتوبر1928ء تک بند رکھے گئے۔بمبئی ریاست کے ضلع بڑدولی میں کسانوں نے ٹیکس کی ادائیگی روکنے کا اعلان کردیا۔ٹاٹا لمیٹڈ کے سٹیل کے کارخانے میں سٹاف کی برطرفیوں اور اجرتوں میں کمی کے خلاف پانچ مہینوں تک کام بند رکھا گیا۔لیلولہ کے مقام پر ایسٹرن ریلوے کمپنی میں چارماہ تک کام روک دیا گیا۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے سے لے کر سائوتھ انڈین ریلوے میں ریل کے مزدوروں کے شعبے میں ہڑتال کر دی گئی جس نے سارے سسٹم کو جام کر کے رکھ دیا۔اس دوران مسلح جدوجہد میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔دسمبر میں اس ریل کو ایک دھماکے سے اڑا دیاگیا جس میں وائسرائے ارون سفر کر رہاتھا۔اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ کانگریس،گاندھی اور نہرو نے اس حملے کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ہولناک بے روزگاری اور بد سے بدترہوتے حالات زندگی مزدوروں‘کسانوں اورنوجوانوں کے اندر بے چینی گھٹن اور غم وغصے کو بھڑکاتے چلے جارہے تھے۔ شمال مغربی علاقے میں تو یہ تشدد انتہائوں کوپہنچ چکاتھا۔سائمن کمیشن رپورٹ کے مطابق 1858ء سے 1922ء تک برطانوی فوج کو باغی قبائل کے خلاف 72مہمات سرانجام دینی پڑیں۔جون کے آخر میں گجرات میں کرائے اور ٹیکس نہ دینے کی تحریک شروع ہوگئی جبکہ بنگال کے اندر ایک طلبہ تحریک پھوٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی مسلح سرکشی میں اضافہ ہوگیا۔کمیونسٹ پارٹی ان تمام واقعات میں قائدانہ کرداراداکررہی تھی۔برطانوی سامراجی اس سرخ خطرے سے ڈرگئے تھے۔انہوں نے ایک

طرف تو بورژواسیاستدانوں کوتحریک کو متاثر کرنے کی ذمہ داری سونپی دوسری طرف انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے خلاف سختیوں میں اضافہ کردیا۔**1929**ء میں"میرٹھ سازش کیس" میں یہ جبر کھل کر سامنے آگیا۔کانپور بالشویک سازش کیس کی طرح سے اس کا بھی مقصد یہی تھا کہ کمیونسٹ قیادت کا قلع قمع کیاجاسکے۔**20**مارچ**1929**ء کو کمیونسٹ پارٹی کے **31**لیڈر سرکاری ایجنسیوں کی جانب سے سرگرم کمیونسٹ افرادکے بارے میں پیش کی جانے والی رپورٹوں کی روشنی میں گرفتار کر لئے گئے۔اس مقدمے کی سماعت جون **1929**ء میں شروع کی گئی جبکہ **16** جنوری **1933**ء کو عدالت نے اس مقدمے کو باقاعدہ سننا شروع کیا۔اور سب ملزمان کو سزا سنائی جس میں تین سال سے عمر قید تک کی سزا شامل تھی۔فلپ سپراٹ اور بنجمن فرانسس بیڈلے جو کہ انگلینڈ سے کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے کیلئے آئے تھے ،کو دس سال کی سزا دی گئی۔الہٰ آبادہائیکورٹ کے چیف جسٹس نے سبھی اپیلیں مسترد کر دیں البتہ سزا میں تخفیف کر دی گئی اور **1935**ء کی خزاں تک سبھی رہاکر دیے گئے۔مقدمے کی سماعت کے دوران نامزد ملزمان قومی آزادی کی تحریک میں برطانیہ مخالف جذبات ابھارتے ہوئے عوام کی ہمدردیاں اپنی طرف جیتنے میں کامیاب رہے۔جس پر ہندوستانی بورژوازی مشتعل ہو گئی اور اس نے ایک ڈیفنس کمیٹی قائم کردی جس کا چیئر مین موتی لال نہروجبکہ جواہر لال نہرو اس کا ممبر تھا۔ملزمان اپنے مقدمے کو کمیونسٹ نظریات کے فروغ کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔چیف جسٹس نے اپنے فیصلے میں لکھا"یہ لوگ جان بوجھ کر پہلے سے تیار کردہ بیانات لکھ کر لاتے اور انہیں پڑھتے ہوئے خاصا وقت لگا دیتے ہیں۔عدالت کو اس کا ایک ایک لفظ سننا پڑتاہے۔زیادہ تر بیانات اور کچھ بھی نہیں ہوتے تھے سوائے اس کے کہ ان میں کمیونزم کاپرچارکیاجاتاتھا۔اس کے ہی لوازمات اور پروگرام ان بیانات میں پیش کئے جاتے ہیں۔میرٹھ کیس کی سماعت شروع ہوتے ہی بمبئی ٹیکسٹائل کی گیرین کام گر یونین کے خلاف ایکشن شروع کردیاگیا۔حکومت نے نہ صرف کمیونسٹوں بلکہ یونین رہنمائوں کو گرفتار کر نا شروع کردیا ،اس دوران فسادات اور ہڑتال کی انکوائریوں کیلئے کمیٹیاں بھی قائم کر دی گئیں۔ان کمیٹیوں کا مقصد اور ہدف ہندوستان بھرکی ٹریڈیونین قیادت میں سے کمیونسٹوں کو برطرف اور الگ کرناتھا۔اکتوبر **1929**ء میں وائیٹلے رائل کمیشن قائم کر کے ہندوستان روانہ کیاگیا۔اخبار "مانچسٹرگارڈین"کی رپورٹ کے مطابق اس کمیشن کو قائم کرنے اور بھیجنے کا حقیقی مقصد کمیونسٹوں پر جبر اور دبائو میں اضافہ کرناتھا۔**25**اکتوبر**1929**ء کو اس اخبار نے لکھا:

"پچھلے دو سالوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کے سبھی بڑے کارخانوں کے صنعتی مزدوروں کی یونینوں کے سرگرم راہنما کمیونسٹ منتظمین کے زیراثر آئے ہوئے ہیں۔ان حالات کی روشنی میں ہی ہندوستانی مزدوروں کے حوالے سے اس قسم کے کمیشن

کو تشکیل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی "۔اگرچہ گیرین کام گر یونین کو ہڑتال ختم کرنے پر مجبور کر دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں مزید ہڑتالیں پھوٹ پڑیں۔جمشیدپور میں ٹن پلیٹ ورکرز،کلکتہ میں آئل اینڈ پٹرول ورکرز اور کراچی میں ڈاک ورکرز نے ہڑتال کرکے برطانویوں کے جبرو تسلط کے خلاف اعلان بغاوت کردیا۔

سوال یہ ابھرتاہے کہ آخر کیونکر کمیونسٹ پارٹی اس قدر اثر ورسوخ ،تائید وحمایت اور مزدوروں کی بے مثال جدوجہداور قربانیوں کے باوجودصحیح معنوں میں قیادت نہ سنبھال سکی؟زیادہ تر سٹالنسٹ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جبرکی کیفیت ہی اتنی سخت تھی کہ پارٹی قیادت نہیں سنبھال سکی۔اس حوالے سے میرٹھ سازش کیس کو حوالے کے طورپر پیش کیاجاتاہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جبر وتشدد تنظیموں کو توڑ کے رکھ دیتا ہے اور ان کو شدید پسپائی کا سامنا کرپڑجاتاہے۔ایک مارکسی تنظیم کو اس جبر وتشدد سے نمٹتے ہوئے سماج میں اپنے لئے حمایت اور یکجہتی حاصل کرنی پڑتی ہے نہ صرف اپنے ملک کے اندر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی۔اس وقت کچھ کمیونسٹ رہنمائوں نے اس پوزیشن کو قبول بھی کیاتھا۔سوامی ایندراناتھ ٹیگور نے اپنے پمفلٹ ’’تاریخی ارتقا‘‘میں لکھاہے ’’میرٹھ سازش کیس سے بڑھ کر کسی اور شے نے کمیونزم کیلئے اتنا بھرپور پروپیگنڈہ نہیں کیا۔سارے ملک کی سیاست اس کیس پر توجہ مرکوز کئے ہوئے تھی۔اس کیس کی وجہ سے ہزاروں نوجوان کمیونسٹ پارٹی کی طرف راغب ہوئے۔اس حوالے سے عالمی ذرائع ابلاغ میں بھی کافی تشہیر ہوئی۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سازش کیس نے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو اپنے قدم جمانے میں اہم کردار اداکیا‘‘۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کے پروگرام میں جسے ستمبر **1920**ء میں دوسری کانگریس کے موقع پر پیش اورشائع کیاگیا،حسب ذیل لکھا گیا’ ’’مذہبیت ،عاجزی وانکساری سے بھرپور گاندھی جیسے رحجانات کو سماجی زندگی کے انتہائی پسماندہ اور انتہائی رجعتی عناصر اپنا ہیرو بناتے چلے گئے۔ایسے عناصر اپنے مسائل کا حل پرولتاری سوشلزم میں نہیں سوچتے اور دیکھتے ،بلکہ اس کی بجائے یہ صبر وشکر' راضی بہ رضاجیسے قدیم رویوں کے ذریعے اپنی سماجی محرومیوں کو طفل تسلی دیتے رہتے ہیں۔گاندھی ،عوامی انقلاب کی مخالفت کیلئے ایک نظریے کے طورپر ترویج اور فروغ پارہاہے ۔اس کا مقابلہ، لامحالہ طورپر ،کمیونزم کے ذریعے کرنا ہوگا۔‘‘

موقف اور نقطہء نظر میں باربار تبدیلی اور کبھی دائیں توکبھی بائیں کی طرف راغب ہونے کی وجہ سے سٹالنسٹ کمنٹرن نے کئی انقلابات کو زندہ درگورہونے پر مجبور کردیا۔نہ صرف انقلابوں کو بلکہ کئی سچے انقلابیوں کو بھی اور یہ دنیا بھر میں ہوا۔**1927**ء میں اپنے چائنہ مشن سے واپسی پر ایم این رائے سٹالن کی نظروں سے گرگیا اور اسے **1929**ء میں کمنٹرن سے نکال دیاگیا۔پے در پے غلطیوں کے باوجود اب بھی کمیونسٹ پارٹی آف

انڈیا کی سماجی بنیادیں موجود ہیں۔خاص طورپر اس کی ” 4اکتوبر“کے تاریخی ورثے کے ساتھ نسبت کی وجہ سے۔1936ء میں ریلوے کی عام ہڑتال نے برطانوی راج کو مفلوج کر کے رکھ دیاتھا۔اس ہڑتال نے ہندوستان کی نوخیز صنعت کے ہر شعبے کے پرولتاریہ کو شدید متاثرکیاتھا۔ 1938ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ورکرز سوشلسٹ ریپبلک کے نعرے کے تحت کلکتہ میں 50000 مزدوروں کو متحرك و منظم کرتے ہوئے ایک بڑی ہڑتال کرائی۔یہ اس قابل تھی کہ مزدوروں اور غریب کسانوں کی حکومت کے نعرے کے تحت اس سے بھی بڑی عام ہڑتال کر اسکتی تھی۔اس طرح طبقاتی جدوجہد کی ایک اور لہر نے کمیونسٹ پارٹی کو مزید لیفٹسٹ ہونے پرمجبورکردیا۔1938ء میں کمیونسٹ پارٹی کی کسان سبھا(کسان کانفرنس)میں 50000غریب کسانوں نے خود کو شرکت کیلئے رجسٹر کرایا۔1939ء میں اس کانفرنس کی ایک قراردادمیں حکومت میں کانگریس کی وزارتوں پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔قرارداد میں مکمل سیاسی نجات اور آزادی کا مطالبہ کیاگیا جو کہ قرارداد کے مطابق عوامی راج کے تحت ہی ممکن تھا۔1937ء تک کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی ۔ مہاراشٹرا اور یوپی میں پارٹی کے ہزاروں کارکنوں کو جیلوں میں ڈال دیاگیا۔بنگال اور پنجاب میں کمیونسٹوں پر تشدد بھی کیاگیا ۔شعلہ پور میں پارٹی کے چار لیڈروں کو پھانسی دے دی گئی ان میں ایک اہم مرکزی ٹریڈیونین لیڈر بھی شامل تھا۔ مالابار میں کمیونسٹ ورکروں کو مسلسل قید وبنداور تشدد کا نشانہ بنایاجاتارہا ۔جبکہ مدراس میں کئی کمیونسٹوں کو سولی چڑھادیاگیا۔

ماسکو کی افسرشاہی کی طرف سے وقتاًفوقتاً پالیسیوں میں تبدیلیاں اور اتارچڑھائو،انڈین کمیونسٹ پارٹی پر اثراندازہوتے رہے۔”فادرلینڈکے تحفظ “کی پالیسی نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے کئی سرگرم کارکنوں کے انقلابی جدوجہدکیلئے درکارطبقاتی شعور کو کنداور مجروح کر کے رکھ دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے آغازپر پارٹی نے ایک بھرپورجنگ مخالف مہم شروع کی ،اسے سامراجی جنگ قراردیاگیا،جس کی مخالفت میں پارٹی نے بڑھ چڑھ کر جنگ اور برطانیہ کی مخالفت کی ۔یہ ایک ایسا سنہرا موقع تھا کہ کمیونسٹ پارٹی خود کو عوام کے سامنے ایک متبادل کے طورپر پیش کرسکتی تھی۔جنگ کے آغاز پر پارٹی نے جنگ کی مخالفت میں جرات کے ساتھ انتہائی موثر ہڑتالیں منظم کرائیں۔22اکتوبر1939ء کے دن ،دنیا میں جنگ کی مخالفت میں محنت کشوں کی طرف سے سب سے پہلا مظاہرہ ہندوستان میں ہوا جس میں ایک دن کی عام ہڑتال کی گئی،اس احتجاج میں لگ بھگ 90000لوگوں نے حصہ لیا۔”نسل انسانی کے خلاف اس قتل عام کی سازش کو شکست دی جائے“”سامراجی جنگ مردہ باد“”ہندوستان کی آزادی زندہ باد“جیسے نعرے اس احتجاج کا عنوان تھے۔برطانوی سامراجیوں نے اس احتجاج میں حصہ لینے والے ہزاروں کارکنوں پر جبر وتشدد کی انتہا

کردی اور ان کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔اس کیفیت نے کانگریس پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے اور اس میں دوررس پولرائزیشن ہوئی۔اس میں بائیں بازو کے گروپ تشکیل پا چکے تھے جن میں سے کچھ ڈاکٹر سبھاش چندربوس کے ساتھ منسلک تھے اور جن کو کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستہ سمجھا جانے لگا تھا۔ 1939ء میں کانگریس کی صدارت کیلئے ہونے والے الیکشن میں ڈاکٹر سبھاش نے گاندھی کو شکست دے دی تھی۔یوں امکانات روشن ہوگئے تھے کہ کانگریس کے لیفٹ ونگ کے ساتھ یونائٹڈفرنٹ تشکیل دے دیا جاتا۔یوں کمیونسٹ پارٹی ،لیفٹ کی ایک ایسی ناقابل تسخیر طاقت قائم کر لیتی جو کہ ایک مارکسی پروگرام اور طریقوں کے ساتھ قومی آزادی کی تحریک کو سوشلسٹ نتیجے تک پہنچا سکتی تھی۔

بائیں بازو کی زوال پذیری

اس وقت جب کمیونسٹ پارٹی کی جنگ اور برطانیہ مخالف پالیسی تیزی کے ساتھ موثر پیش قدمی کر رہی تھی،عین اسی وقت ماسکو کی پالیسی میں اچانک تبدیلی نے تباہ کن اثرات مرتب کرنے شروع کر دیے۔سٹالنسٹ روس کی امریکی و برطانوی سامراج کے ساتھ ہونے والی مصالحت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو بھی برطانوی راج کے خلاف اپنی پالیسی کو یکسر بدلنے پر مجبور کردیا۔ 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی کا ایک رہنما کامریڈ خوشی محمداعظم گڑھ (یوپی)میں ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے سامراج کے خلاف جوش وجذبے سے بھرپور تقریر کر رہاتھا۔اس تقریر کے دوران ہی اسے ایک چٹ دی گئی جو پارٹی کی ہائی کمان کی طرف سے ایک قاصداس کیلئے لایاتھا۔یہ پیغام سٹالن کے نئے حکمنامے پر مبنی تھا۔یہ برطانیہ کے خلاف جدوجہدترک کرتے ہوئے ،اس کے ساتھ مصالحت کا حکم تھا۔خوشی محمد نے پیغام پڑھا اور فوری طورپر اپنے جوش وجذبے کو سنبھالتے ہوئے یوٹرن لیا۔اس نے سامراج مخالف جذبات کو ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ برطانیہ نے فادر لینڈ روس کے ساتھ اتحاد کرلیاہے۔چنانچہ اب ہماری جدوجہد اور مزاحمت کا محور فاشسٹ (جاپان اور جرمنی)ہوں گے۔ہماری اب برطانیہ سمیت اپنے جمہوری اتحادیوں سے کوئی مخاصمت نہیں ہے۔کمیونسٹ پارٹی کو اپنے اس یو ٹرن کی انتہائی بھاری قیمت چکانی پڑی۔انہوں نے صرف برطانیہ کے ساتھ ہی خوش اخلاقی سے پیش آنا شروع نہیں کیا بلکہ قومی بورژوا قیادت کے ساتھ بھی مصالحت واتفاق کا وطیرہ اپنالیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پارٹی کا سبھاش چندربوس سمیت کانگریس اور دیگر بائیں بازو کے رہنمائوں کے ساتھ تنازعہ شروع ہوگیا۔پارٹی کے کانگریس میں کام کرنے والے کیڈروں نے نہرو جیسے لبرل سوشلسٹ اور جے پرکاش نارائن جیسے

سوشل ڈیموکریٹس کے ساتھ بلاک قائم کرلیا۔نہرو بھی گاندھی کی طرح سے برطانیہ کا تیارکردہ وہ پرزہ تھا جس کے ذمے تھا کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی سرکشیوں اور نوجوانوں کی ریڈیکلائزیشن کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔بعض مواقع پر تو پارٹی نے تحریک کے عین عروج کے وقت بورژوا لیڈرشپ کے ساتھ انتہائی تعاون کا مظاہرہ کیا حالانکہ ان موقعوں پر یہ ممکن تھا کہ تحریک کو طبقاتی بنیادوں پر استوار کیا جاتا اور اسے بورژوا قیادت سے پاک صاف کیا جاتا۔28جولائی1920ء کو کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس کے ایک خصوصی سیشن میں قومی اور نوآبادیاتی سوال پر لینن کا تیارکردہ ڈرافٹ پیش کیا گیا تھا جس میں حسب ذیل کہا گیا تھا۔

”کمیونسٹ انٹرنیشنل کو نوآبادیاتی اور پسماندہ ملکوں کے اندر بورژوا جمہوریت کے ساتھ لازماً عارضی اتحادوں میں جانا چاہئے لیکن کمیونسٹوں کو ان میں کسی طور بھی ضم نہیں ہوجانا چاہئے۔خواہ مزدورتحریک اپنی انتہائی ابتدائی حالت میں ہی کیوں نہ ہو!“۔کمیونسٹ پارٹی کے کیڈروں کو ہر حال میں گاندھی اور نہرو کے طبقاتی کردار اور مفادات کو محروم عوام کے سامنے عیاں کرنا چاہئے تھا۔ان کو چاہئے تھا کہ وہ کانگریس میں موجود سوشلسٹ یوتھ اور دیگر پرجوش کارکنوں کو کمیونسٹ پارٹی میں ریکروٹ کرتے اور اس طرح مزدوروں اور کسانوں کی ایک ایسی تحریک کو منظم و متحرک کرتے جو سامراجی تسلط کے خاتمے کا باعث بنتی۔اور یہی جدوجہد کا سچا اورحقیقی کردار ہو سکتا تھا یعنی ایک طبقاتی جدوجہد۔

پارٹی کی جنگ کے بارے میں پالیسی میں اس اچانک تبدیلی نے نہ صرف عوام بلکہ خود پارٹی کے اندر عہدیداروں اور کارکنوں کو تذبذب ، بے دلی اور مایوسی میں مبتلا کردیا۔

8اگست1942ء کو گاندھی نے ’ہندوستان چھوڑ دو“مہم شروع کر دی۔اس کی پرانی چالوں اور مکاریوں کی طرح سے یہ بھی اس کی ایک اور عاجزانہ پیشکش تھی جس سے برطانوی راج اور نوآبادیاتی کردار میں کوئی فرق نہ پڑنا تھا اور نہ ہی پڑا۔اس کا مقصد بیک وقت طبقاتی تحریک کے جوش وجذبے کو ماند کرنا اور قومی بورژوازی کو متحد اور منظم کرکے تحریک کو قومی جمہوری تقاضوں تک محدود رکھنا تھا ۔اگرچہ سٹالن نے روزویلٹ اور چرچل کو خوش کرنے اور راضی رکھنے کیلئے تیسری انٹرنیشنل کی تنظیم کے ڈھانچوں کو ختم کردیا تھا مگر وہ انڈین کمیونسٹ پارٹی کو ہدایات دینے سے باز نہیں آرہا تھا اور اس کی پالیسیوں اور حکمت عملیوں کو متعین کررہا تھا۔جیلوں میں بند پارٹی لیڈروں نے برطانوی حکمرانوں سے خفیہ رابطے شروع کر دیے۔وہ اپنے نوآبادیاتی حکمرانوں کو ماں دھرتی میں رضاکارانہ خدمات پیش کرنے پررضامند ہو گئے۔یہاں تک کہ وہ کانگریس میں سرگرم راج مخالفین اور” غدار“ کہلائے جانے والے سچے کارکنوں کے خلاف

مزاحمت کیلئے بھی کام کرنے کو تیارہوگئے۔اس وقت پارٹی کے جنرل سیکرٹری ڈانگے نے وائسرائے ہندوستان لارڈ ویول کو خط لکھا اور جنگ کیلئے کمیونسٹ پارٹی کی خدمات پیش کیں۔یوں پارٹی نے نہ صرف خودکو مسلسل سرگرم ہوتی ہوئی قومی آزادی کی تحریک سے الگ تھلگ کرلیا بلکہ اس نے اپنے کیڈروں اور کارکنوں کو مایوسی' بیزاری اور بد دلی کی پاتال میں دھکیل دیا۔ایک ایسے وقت میں جب پارٹی کے ہزاروں کارکن پھانسی لگائے جارہے تھے،جیلوں میں ڈالے اور بدترین تشدد کی بھینٹ چڑھائے جارہے تھے،اس وقت پارٹی پر عائد پابندی ہٹا لی گئی یہی نہیں بلکہ نوآبادیاتی برطانوی حکومت کی طرف سے پارٹی مطبوعات کیلئے فنڈزکی فراہمی بھی شروع کر دی گئی۔

بدقسمتی سے پارٹی کی پہلی کانگریس 1943ء میں ایک ایسے ماحول میں ہوئی جب پارٹی کا برطانیہ کے ساتھ مصالحت کا عمل زوروں پر تھا۔اس عرصے میں پارٹی ہڑتالیں روکنے،نوجوانوں کو مظاہروں سے دور رکھنے اور فوجیوں کو فوج سے بھاگنے سے منع کر رہی تھی۔اس غداری و مصالحت کے رد عمل میں عوام کی طرف سے شدید غم وغصہ سامنے آیا۔کئی علاقوں میں کمیونسٹ پارٹی کے دفاترپرحملے کئے گئے اور ان کو نذرآتش کردیاگیا۔ 1940/1950ء کے دور کے کمیونسٹ پارٹی کے نظریہ دان رانا دیو نے لکھا ہے کہ"ان دنوں کمیونسٹ پارٹی کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھی۔پارٹی عوام سے کٹ کر رہ گئی تھی"۔پارٹی کیلئے زیادہ کڑا وقت دوسری عالمی جنگ کے دوران آیا۔جنگ کے آغازپر ہندوستانی کمیونسٹوں نے برطانیہ اور فرانس کی حمایت کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ ہندوستان کی آزادی کو کسی بھی قابض قوت کے ساتھ سمجھوتے کی بھینٹ نہیں چڑھایا جائے گا۔جنگ کی مخالفت کایہ موقف مقامی 'صوبائی اور ملکی سطح پر کمیونسٹوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا باعث بن گیا۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ موقف کانگریس کے لیفٹ ونگ عناصر کے ساتھ ان کی قربت ورفاقت کا بھی باعث بن گیا۔

پارٹی کے اندر کچھ لیڈروں نے روس کے اس موقف کی مخالفت کی کہ جنگ کا کردار بدل چکا ہے اور یہ کہ یہ اب ایک "عوامی جنگ" میں بدل چکی ہے اس لئے دنیا بھر کے کمیونسٹوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس میں اتحادیوں کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیں۔ان مخالفت کرنے والوں میں کیرالہ سے کامریڈ کے دامودرن بھی شامل تھے۔مگر پارٹی نے ماسکو کی فرمانبرداری کرتے ہوئے برطانیہ کیلئے عسکری بھرتی کرنا شروع کردی۔جبکہ ماسکو موقف کی مخالفت کرنے والے کمیونسٹ کافی عرصے تک پابند سلاسل رکھے گئے اور بہت بعد میں رہا کئے گئے۔ 1942ء میں جب کانگریس نے "ہندوستا ن چھوڑدو"مہم کا اعلان کیا تو وائسرائے نے سختیوں اور جبرمیں اضافہ کردیا۔جو قیدخانے پہلے کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں سے آباد تھے اور حال ہی میں خالی ہوئے تھے،وہاں اب کانگریس کے کارکنان قید کردیے گئے۔کئی برسوں بعد دامودرن نے لکھا کہ پارٹی کی طرف سے سٹالن کے

موقف کی اندھی تقلید اور فرمانبرداری نے کیا کیا تباہ کن اثرات مرتب کیے:

"یہ موقف ان معذرت خواہوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ "عوامی جنگ" (people,s war)کا ساتھ دے کر اگرچہ ہم عوام کے دھارے کے برعکس چلے مگر ہمیں اس سے حاصلات بھی بڑی ملی ہیں۔میں اس وضاحت سے کسی طور اتفاق نہیں کرتا۔بلاشبہ پارٹی کو اس سے فائدے ہوئے اور اس پربرطانوی راج کی طرف سے عائد پابندی ختم ہونے سے یہ قانونی قرار پاگئی۔جس سے پارٹی کی رکنیت سازی اور ٹریڈ یونین کی طاقت میں بڑھوتری ہوئی۔لیکن معاملہ یہ ہے کہ پارٹی عوام کی تحریک کے خلاف چلنا شروع ہو گئی تھی اور اس کے سبھی اغراض و مقاصد برطانوی راج اور سامراج کے ساتھ وابستگی سے وابستہ ہوچلے تھے۔کمیونسٹ ہونا ایک عزت دارانہ وصف قرار پاگیا۔کئی نوجوان کمیونسٹ برطانوی فوج میں شامل ہوگئے اور" سوویت روس کے تحفظ"کا آدرش لے کر اٹلی اور شمالی افریقہ کے محاذوں پر بھیج دیے گئے۔ان میں سے کئی سوشلزم پر قائم رہنے اورپارٹی کیلئے انقلابی کام کرنے کی بجائے جنگ کے بعد بھی فوج کا ہی حصہ بنے رہے۔یہ بھی درست ہے کہ جولائی **1942**ء میں پارٹی کی ممبرشپ جو **4500** تھی،پارٹی کی پہلی کانگریس کے موقع پرمئی **1943**ء میں**15500**کو پہنچ گئی تھی مگران نئے ارکان میں سے اکثریت کو نہ تو تحریک کا اور نہ ہی ریاستی جبروتشدد کا تجربہ تھا۔پارٹی کا سارا زور اور مصرف صرف ایک ہی قرار پایا کہ پارٹی کیلئے محض نئی فصل تیار کی جائے اور بس؛جس سے پیداوار میں اضافہ ممکن ہوتا رہے ؛مطالبہ بھی بس یہاں تک محدود رہ گیا کہ قومی قیادت کو رہا کیاجائے؛ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے؛اور یہ کہ مادر وطن روس کو جاپان کے قبضے میں نہیں آنے دینا جو کبھی ہوا بھی نہیں۔ہڑتالوں اور مظاہروں کو سازش اور سبوتاژقرارد ے دیاگیا۔دوسری جانب **1942**ء میں کانگریس کی طرف سے کی جانے والی" ہندوستان چھوڑ دو"جدوجہد نے وہ زور پکڑا کہ جس کی نظیر نہیں تھی۔لاکھوں مرد وزن خاص طورپر نوجوان نسل جوق در جوق اس کے گردجمع ہو کر ریڈیکلائزہوتے چلے گئے۔اس کانگریسی تحریک کوسامراج کے خلاف ایک انقلاب سمجھ لیاگیا۔"کانگریسی سوشلسٹوں"سبھاش چندر بوس اور اس کے ساتھیوں کو جنہوں نے جوانمردی سے ریاستی جبروتشددکا مقابلہ کیے رکھا "غدار""سازشی"اور"ففتھ کالمسٹ"قرارد ے دیاگیا۔سچ تو یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی قومی آزادی کی تحریک کے دوران،ایک دہائی میں دوسری بار عوام کے دھارے سے بالکل کٹ رہی تھی۔ میرا نقطہء نظر یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنی پالیسیوں کی وجہ سے عملی طورپر سامراج مخالف تحریک کو پلیٹ میں سجا کر کانگریس اور اس کی بورژوا قیادت کو پیش کردیا۔اگر پارٹی درست حکمت عملی پر توجہ دیتی تو کانگریس کی ممبرشپ کے بڑے حصے کو متاثر کرتے ہوئے ان کو کمیونزم کی طرف مائل اور قائل کر سکتی تھی۔جب میں

رہاہواتو میں نے کئی ایسے مایوس و بددل لیفٹ ونگ کارکنوں کو دیکھا جو ہمارے جلسوں اور مظاہروں میں ”سامراج کے حمایتی مردہ باد“ کے نعرے جوش جذبے کے ساتھ لگانے آتے تھے۔

ایک ایسے وقت میں جب عوام کا دھارا زوروں سے بہہ رہاہو اور وہ بھی درست سمت میں بہہ رہاہو' دھارے سے یکسر منہ موڑ لینا یہ سیدھا سادہ نہ صرف یقینی آزادی بلکہ سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کے موجود امکان کو زندہ ڈبودینے کے سوا کچھ نہیں ہواکرتا“۔ (10)

کمیونسٹ پارٹی کی جنگ کے دوران کے موقف کی کسی توضیح کوکسی حوالے سے بھی درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس کی وجہ سے پارٹی کے سرگرم کارکن اور قومی آزادی کی تحریک میں واضح تقسیم اور علیحدگی پیدا ہوگئی۔جنگ پر پارٹی کا موقف اسے مسلم لیگ کے نزدیک لے آیا۔مسلم لیگ کے فروغ نے کمیونسٹ پارٹی کیلئے ایک اوربڑی سٹریٹجک غلطی کرنے کے حالات پیداکردیے۔ بجائے اس کے کہ اپنے حمایتیوں کے سامنے مذہبی سیاست کا درست تنقیدی تجزیہ کرکے ان کو درست متبادل فراہم کیاجاتا،معروف نظریہ دان ادھیکاری کے الفاظ میں ”کمیونسٹ پارٹی نے ان خودساختہ کمیونل مسائل خصوصاًہندو مسلم مسئلے کو ایک حقیقی قومی مسئلہ سمجھنا شروع کر دیا۔یہ سب” عوامی جنگ“کے عرصے کے دوران (1942/45ء) ہورہاتھا،مسلم لیگ کی طرح سے کمیونسٹ پارٹی بھی قومی مسئلے کے سیاسی کیمپ میں داخل ہو رہی تھی۔کمیونسٹ پارٹی کی ستمبر 1942ء میں ہونے والی سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ میں ”پاکستان اور قومی یکجہتی “کے نام سے ایک قراردادمنظور کی گئی جونظریاتی ابہام اور موقع پرستانہ سیاست کا مرقع تھی۔اس کی ا بتداسٹالن کے غلط نظریہ ء قوم کی تعریف سے کی گئی اور یہ قرار دیاگیا کہ مسلمان ایک قومی اقلیت ہیں لہذا انہیں حق خودارادیت دے دیا جانا چاہئے “۔(11)

کمیونسٹ پارٹی مکمل طورپر” قوم “کی مارکسی روایت کی روشنی میں تعریف پیش کرنے اوراس پر اکتفا کرنے سے قاصر رہی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ان کے اورعوام کے درمیان سیاسی دوری اس حد تک نہ بڑھتی ۔ مارکس اور لینن کے نزدیک کبھی بھی ایک مشترکہ زبان اور ثقافت بورژوا قوم اور ریاست کی بنیاد نہیں رہے۔ مذہب تو صرف ایک فرد کی انفرادیت کی وضاحت کرتا ہے اور کسی معاشرے کی بنیاد نہیں ہوتا۔

یہ وہ وقت تھا جب کمیونست پارٹی کی قیادت کو مذہبی سیاست کے خلاف واضح موقف رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اس نازك وقت میں وہ” طاقتور اور ظالم دشمنوں “ (جاپانیوں)کے خلاف مادر وطن کے تحفظ کے نظریے کی تبلیغ کرتے رہے جس کے بعد مارکسی سیاست کو لاگو کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ اس غلط نظریے کو اپنانے کے بعد غلط

نظریاتی سیاست ہی کی جاسکتی تھی۔ صرف جنگ کے خاتمے کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنے موقف کو تبدیل کیا اور وہ بھی برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے راہنما آرپالمے دت کے کہنے پر۔ دت نے 1946ء میں موقف اختیار کیا کہ پاکستان کی بنیاد قومیت پر نہیں بلکہ مذہب پر ہے۔ CPI نے اس موقف کو مانتے ہوئے پاکستان کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ برطانوی سامراج اور مسلمان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک مشترکہ سازش ہے جس کا مقصد ان کے مفادات کا تحفظ ہے۔ بہت سے "مسلمان کمیونسٹ" اس موقف کی تبدیلی کو جلدی نہ سمجھ پائے اور 1947ء تک وہ مسلم لیگ میں ہی رہے۔ جہاں وہ سٹالنسٹ قیادت کے حکم پر ہی گئے تھے تاکہ وہاں جاگیرداروں کے خلاف "ترقی پسند" عناصر کی مدد کرسکیں۔

سندھ کے ایک پرانے "کمیونسٹ" اور CPI کے سابقہ ممبر سوبھوگیان چندانی نے ایک حالیہ انٹرویو میں اس موقف کی تبدیلی کے بعد پیدا ہونے والی دلچسپ صورتحال کے متعلق بتایا۔

" 1943ء میں کمیونسٹ پارٹی نے یوٹرن لیا اور برطانیہ کی حمایت شروع کردی۔ پوری دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں نے جنگ پر اپنا موقف تبدیل کرلیا تھا۔ ان کے خیال میں ایک سامراجی جنگ سے اب یہ عوامی جنگ بن چکی تھی۔ اس نئے خیال کو طلباء میں پھیلانے کے لئے ایک میٹنگ بلائی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے اس کام کے لئے مقیب الدین فاروقی ' سجادظہیر اور میاں افتخار کو ہمارے پاس بھیجا' فاروقی جو کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری اور دہلی یونیورسٹی سے اس میٹنگ میں شرکت کے لئے آیاتھا'اس نے طلباء سے خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ طلباء اس فیصلے کو غداری نہ کہیں کیونکہ دنیاتبدیل ہورہی ہے اور ہم (کمیونسٹ پارٹی) بھی اس کے ساتھ تبدیل ہورہی ہے۔ سندھی کامریڈ جو انقلابی عہد میں بالغ ہوئے تھے حیران رہ گئے کہ انہیں برطانیہ کی حمایت کرنے کے لئے کہا جارہا ہے۔

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس موقف پر ڈٹی رہی لیکن وہ کچھ طلباء کو اپنی پسند کی ذہانت پر قائل نہ کرسکے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب ہزاروں طلباء جیل جانے کیلئے تیار ہیں تو میں کیسے پیچھے رہ سکتا ہوں۔ لہذا میں نے برطانوی راج کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا"۔(12)

مزاحمت اور انقلاب

1940ء کی دہائی ایشیاسمیت دنیا بھر میں انقلابات کی دہائی تھی۔1946ء ہندوستان میں انقلاب کا سال تھا۔اس سال تحریک اتنے زوروں پر تھی کہ برطانوی

حکمرانوں کو انڈین نیشنل آرمی INA کے ان سبھی لیڈروں کو رہا کردینا پڑگیا جن کو غداری کے الزام میں گرفتار کیاہواتھا۔ اس وقت INA کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ لوگ کانگریس کے عدم تشدد اور عاجزی کے نظریے سے سرا سر بے نیاز ہوچکے تھے۔دوسری عالمی جنگ کے بعد سے برطانوی فوج کے اندربے چینی اور اضطراب حددرجہ بڑھ گیا تھا،برطانوی افسر اورجوان جنگ سے اکتاچکے تھے۔ہانگ کانگ سے لے کر مصر تک بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔عوام کی یہ سرکشی کسی سے روکے نہیں رک رہی تھی اور اس کی شدت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جارہاتھا۔قصبوں اور دیہاتوں میں نسلوں سے خاموش مخلوق نہ صرف جاگ اٹھی بلکہ اتنی متحرک ہوئی کہ سامراجی تسلط کے قدم اکھڑتے چلے گئے۔

یکم مارچ 1946ء کو جبل پور کی بیرکوں میں سپاہیوں کی بغاوت پھوٹ پڑی جبکہ 18مارچ کو ڈیرہ دھون کے اندر گورکھا رجمنٹ نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔جبکہ کئی واقعات میں آرمی اور ایر فورس کے ہندوستانی افسروں کا غم وغصہ پھٹ کر سامنے آگیا۔برطانوی راج کے خلاف سب سے بڑا احتجاج برٹش انڈین نیوی کے جہازیوں کی طرف سے ہوا، 18فروری 1946ء کوجنگی جہاز ”HMSتلوار“ پرجو کہ بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز تھا ،جہازیوں نے ناقص خوراک اور بدتر حالات کے خلاف احتجاجاً ہڑتال کر دی۔اگرچہ یہ ایک پر امن بھوک ہڑتال تھی تاہم برطانوی راج کے خلاف بڑی اور موثر بغاوتیں ابھی آگے منتظر تھیں۔ 19فروری کو جہازیوں نے ہڑتال کو قلعے اور بیرکوں میں لے جانے کا اعلان کردیا۔انہوں نے نیوی ٹرکوں پر قبضہ کرتے ہوئے ان کو بند کر کے کھڑا کردیااوران پر سرخ پرچم لہرا دیے اور پھر ان پر بمبئی شہر کی سڑکوں پر مارچ شروع کر دیا۔ انہوں‌نے ٹرکوں‌پر سوار ہوکر بمبئی کے عوام سے اس ہڑتال میں ان کا ساتھ دینے کی اپیل کردی جس کے نتیجے میں‌برطانیہ اور سامراج مخالف جذبات جنگل کی آگ کی طرح سارے علاقے میں پھیل گئے۔19فروری1946ء کی شام تک نیوی کے افسروں اور جوانوں کی بڑی تعداد اس ہڑتال میں شامل ہو چکی تھی۔بمبئی کے ساحل پر لنگرانداز رائل انڈین بحریہ کے جہازوں پر لگے یونین جیک کے پرچم اتار کر پھاڑدیے گئے۔اور ان کی بجائے جہازیوں نے سرخ رنگ کے جھنڈوں سمیت ان پارٹیوں کے پرچم جہازوں‌پرلگا دیے جو آزادی کی جدوجہد میں سرگرم تھیں۔ 48گھنٹوں کے اندر اندربرطانوی راج کواپنے بحریہ کے یونٹس کی جانب سے سب سے بڑی بغاوت کا سامنا کرناپڑگیا۔پہلے بغاوت سرگوشیوں کے ذریعے اور پھر ریڈیو کے ذریعے یونٹس کے اندر پھیلی جس پر ان باغیوں نے اس دوران قبضہ کرلیاتھا۔یوں‌یہ بغاوت سارے ملک کی گیریژنوں‌اور بیرکوں تک پھیل گئی۔باغی جہازیوں کے کچھ لیڈروں نے باغیانہ پیغامات کے ساتھ انقلابی نظمیں اور گیت پڑھنے اور سنانے شروع کر دیے اور یوں یہ سلسلہ دن رات چلنے لگا۔یہ بغاوت سبھی ساحلوں‌پر

موجود 74بحری جہازوں، 20بیڑوں اور22بیرکوں تک سرایت کر گئی۔ان نیول سٹیشنوں میں بمبئی،کلکتہ ،کراچی ،مدراس،کوچن اور وشاکاپٹنم شامل تھے۔20فروری کوہونے والی مکمل ہڑتال میں صرف 10جہاز اور2نیول سٹیشن شریک نہیں ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ سب خودرو اور اچانک ہی ہواتھا مگر یہ مکمل سچ نہیں ہے۔19فروری کی شام کو ایک ہڑتالی کمیٹی کا قیام عمل میں لایاگیا ؛سگنل مین ایم ایس خان اور پیٹی افسر ٹیلی گراف آپریٹر مدن سنگھ کو اس کا اتفاق رائے سے صدر اور نائب صدر چنا گیا۔ایک سکھ دوسرا مسلمان اور دونوں کی عمریں 25سال سے کم تھیں۔یہ ایک شعوری فیصلہ تھا جس کا مقصد قومی آزادی کی تحریک میں مذہبی تعصب کو پھیلانے کی کوششوں کو مسترد کرناتھا۔جو تحریک کے بورژوا لیڈراپنے برطانوی آقائوں کے اشارے پر کرتے جا رہے تھے۔

اس ہڑتالی کمیٹی کے ایجنڈے میںیہ بھی شامل تھا کہ قومی آزادی کی تحریک میں شامل پارٹیوں کے ساتھ رابطے اوربات چیت کر کے ان کی تائیدوحمایت حاصل کی جائے۔کمیونسٹ پارٹی اپنی برطانوی سامراج کی حمایت کرنے کی تباہ کن پالیسی کے باعث آزادی کی تحریک سے باہر ہو چکی تھی۔انہی دنوں ہندوستان کی بورژوازی اور ان کے نمائندہ لیڈر برطانیہ کے ساتھ مصالحت اور سمجھوتے کیلئے مذاکرات میں مصروف تھے۔تاریخ کے ایسے فیصلہ کن مرحلے پر یہ لوگ بھی برطانیہ کی طرح ہر قسم کی سرکشی اور بغاوت کے دشمن تھے۔گاندھی نے تو کھل کر جہازیوں کی سرکشی کی مخالفت کر دی جبکہ کمیونسٹ پارٹی بحریہ کے سپاہیوں کی اس بغاوت کو ٹیکسٹائل ریلوے اور صنعتوں کے دوسرے شعبوںمیں ان دنوں ہونے والی ہڑتالوں کے ساتھ جوڑنے میں ناکام رہی جو سارے ملک میں ہو رہی تھیں۔اسی طرح سے سبھاش چندر بوس جیسے لیڈر بھی ا س ضمن میں کوئی کردار ادانہیں کر سکے۔سبھاش چندر تو برطانیہ مخالفت میںحد سے زیادہ آگے نکل گیاتھا اور وہ انڈین نیشنل آرمی پر زوردیتارہاکہ وہ برطانیہ کی فوج کے ساتھ لڑیں اور یوں وہ جاپان کی رجعتی حکومت کاساتھ دیتارہا۔

کانگریس اور مسلم لیگ خوفزدہ ہو گئیں کہ انقلاب اور طبقاتی جدوجہد کے نظریات اس تحریک میں گہرائی میں سرایت نہ کر جائیں جسے وہ مذہبی تعصب کے ذریعے تقسیم اور کمزورکرچکے تھے۔بورژوا قیادت کی پیہم غداریوں اور سازشوں کے باوجود انقلابی سرکشی کا سلسلہ کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہاتھا۔سارا ملک انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج رہاتھا۔ا ن نعروں کے حوالے سے پیدا ہونے والے جوش وجذبے اور سرگرمی نے سارے بمبئی کی کیفیت کو ہی بدل کے رکھ دیاتھا۔اس دور کے ایک معروف شاعرجوش ملیح آبادی نے یہ مقبول عام ترانہ لکھا:

میرا نام شہید، میرا کام آگے بڑھنا،

21فروری کو برطانوی فوج نے اس وقت جہازیوں پر فائر کھول دیا جب وہ بمبئی قلعے میں سے اپنی بیرکوں سے باہر نکل رہے تھے۔اس اشتعال انگیزی نے پر امن سرکشی کو پر جوش بغاوت میں بدل کر رکھ دیا۔سارا دن جہازیوں اور برطانوی ایلیٹ فورس کے مابین مسلح جھڑپیں ہوتی رہیں۔پہلے دن بمبئی میں ایک جہازی اور دوسرے دن کراچی میں 14جہازیوں کی شہادت واقع ہوئی۔برطانوی ایلیٹ فورس نے جہازیوں کے ساتھ یکجہتی کرنے والے صنعتی مزدوروں کے خلاف بھی ایسا ہی جبر وتشدد شروع کر دیا۔ 22اور23فروری کو برطانوی فوج کی وحشت سے 250جہازی اور مزدور شہیدکردیے گئے۔کچھ چشم دید گواہوں کے بقول 21فروری کو یوں لگ رہاتھا کہ جیسے سارا برصغیرہی سامراجی تسلط کے خلاف انقلابی جوش اور ولولے سے لیس ہوکر سرگرم ہو چکا تھا۔اس تحریک کے دوران انقلابی ہڑتالی کمیٹی نے اپنی کمان ”نابرا بحری بیڑے“پر منتقل کر دی تھی۔ جہازیوں نے اپنے جہازوں پر موجود بندوقوں کا رخ برطانوی نیول تنصیبات اورساحلوں پر موجود مراکز کی طرف کر دیا۔سبھی جہازوں سے سائرن بجائے گئے، جہازیوں نے لائوڈسپیکروں سے اعلان کئے کہ اگربرطانوی حکومت نے شہروں میں یا ساحلوں پرجدوجہد کرنے والے ان کے ساتھیوں پر حملہ کیا تو وہ اپنے اوپر ہونے والی ہر زیادتی اور حملے کا بھرپور جواب دیں گے۔اور وہ برطانوی فوجی تنصیبات اور مراکز کو تہس نہس کر دینے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

لندن میں برطانوی حکومت اس اعلان سے دہل کر رہ گئی۔لیبر پارٹی کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے سر اٹھانے والوں کے سر کچل دینے کے احکامات جاری کر دیے۔برٹش انڈین نیوی کے سربراہ ایڈمرل گوڈفرے نے باغی جہازیوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ ہتھیار ڈال دیں یا پھر مرنے کیلئے تیار ہو جائیں۔انڈین کانگریس کے ایک معروف لیڈرولابھ بائی پٹیل نے کھل کربرطانیہ کے اس اعلان کی تائید کرتے ہوئے اور جہازیوں کی مذمت کرتے ہوئے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کردیا۔اس سرکشی کے دوران ہندوستان کی دونوں معروف ہندو اور مسلم قیادتیں کھل کر برطانوی سامراج کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔اس سے ان کا طبقاتی کردار عیاں ہوتاہے اور برصغیر کی تقسیم کے ضمن میں ان کا برطانوی سامراج کے ساتھ میل ملاپ اور گٹھ جوڑکھل کر سامنے آجاتاہے۔

اس وقت جب برطانوی لڑاکاطیارے باغی جہازیوں کے سروں پر سے پرواز کر رہے تھے ،ایسے حالات میں سردار پٹیل نے بدنام زمانہ بیان جاری کیا؛”چند بدقماش جوشیلے اور غنڈہ قسم کے نوجوان خواہ مخواہ اپنی سرگرمیوں سے سیاست چمکانے کی کو شش کر رہے ہیں ،حالانکہ ان کو سیاست کی قطعاً کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے“۔(13)

اپنی قومی و ملکی قیادت کے اس مایوس کن،حوصلہ شکن اور روح فرسا رد عمل

سے دلبرداشتہ ہوکر ایم ایس خان نے ہڑتالی کمیٹی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی تجویز رکھ دی۔36رکنی کمیٹی نے اس تجویز کو مسترد کردیا۔کئی گھنٹے اس جان لیوا کیفیت میں گزرے ۔ملکی و قومی قیادت نے سر دھڑ کی بازی لگا ئی کہ جہازیوں کی اس تحریک کوبرصغیر میں پھیلی قومی آزادی کی تحریک کے ساتھ کسی طور بھی نہ جڑنے دیا جائے۔اور یوں اسے تنہا کر دیا جائے۔ہڑتالی کمیٹی کے ارکان اس کیفیت سے بددل ہو ناشروع ہو گئے۔24فروری کی علی الصبح"HMSتلوار"پر ہڑتالی کمیٹی کی میٹنگ شروع ہوئی۔جوصورتحال بن چکی تھی، اس سے یہی لگتا تھا کہ ہتھیار ڈالنے کے سواکوئی رستہ نہیں بچا۔چنانچہ صبح 6بجے جہاز پر سیاہ جھنڈے لہراکرہتھیار ڈالنے کا اعلان کردیاگیا۔اپنی اس آخری میٹنگ میں ان باغی ہڑتالی جہازیوں نے جنوبی ایشیا کے محروم و مقہور عوام کے نام ایک قرارداد پیش اورمنظورکی:

"ہماری یہ سرکشی اور بغاوت ہم محروم لوگوں کی زندگی کا سب سے بڑا ،سب سے اہم تاریخی واقعہ تھی۔پہلی بار یہ ہوا کہ وردی اور بغیر وردی کے مزدوروں کاخون ایک ہی مقصدکیلئے ایک ساتھ ہی سڑکوں پر موجزن ہوا۔ہم وردی کے مزدور کبھی بھی اسے فراموش نہیں کر پائیں گے۔ہم یہ بھی سمجھتے اور جانتے ہیں کہ آپ بغیر وردی والے محنت کش بھی اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ہمیں یقین ہے ہماری آنے والی نسلیں اس واقعے سے سبق سیکھیں گی اور ہم جو حاصل کرنے میں ناکام رہے وہ اسے ہر حال میں حاصل کر کے چھوڑیں گی۔محنت کش طبقہ زندہ باد۔انقلاب زندہ باد"۔(14)

بغاوت کے بعد

ہتھیار ڈالنے کے باوجود سرکشی کرنے والوں کی اکثریت کو گرفتار کر کے ان میں سے کئی کوموت کے گھاٹ اتاردیاگیا۔ 15مارچ کو رائل انڈین نیوی کے سرکش سپاہیوں نے' جو ابھی تک جیلوں میں قید تھے، بھوك ہڑتال کر دی۔تحریک آزادی کی قومی قیادت نے اس کے حق میں کسی قسم کے ساتھ اور احتجاج سے یکسر انکارکردیا۔یہی حالت قومی آزادی کی علمبردار پارٹیوں کی بھی رہی اورانہوں نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا۔

1980ء کی دہائی کے اوائل میں بھارت میں سبالٹرن سٹڈیزSubaltern Studiesکے نام سے تاریخ کا ایک سکول قائم کیاگیا۔اٹلی کے مارکسسٹ انتونیو گرامچی کی تحریروں سے متاثرہوکر کام کرنے والے ان مورخین نے کہا کہ ہم کیمبرج اور قوم پرستوں کے اس نقطہء نظر کو یکسر مسترد کرتے ہیں کہ نیشنلزم صرف اشرافیہ کی ہی کاروائی و کارکردگی تھی اور ہندوستان کے سبالٹرن طبقے(دیہی کسانوں اور شہری مزدوروں)کے کسی آزاد سیاسی عمل کا اس کی تعمیر وتشکیل میں کوئی عمل دخل ہی نہیں تھا۔اس

ادارے کی طرف سے سامنے آنے والی دستاویزات کا مقصد ہندوستان کے سبالٹرن طبقے کی سرگرمیوں اور نومبر 1945ء سے لے کر فروری 1946ء تک کی ان کی برطانوی راج و سامراج کے خلاف کی جانے والی زندہ جاوید جدوجہد کو اجاگر کرنا تھا۔انڈین نیشنل آرمی INA کے پابند سلاسل ورکروں کے ٹرائل کے خلاف اور رائل انڈین نیوی کے جہازیوں کی مثالی جدوجہد کے حق میں ہندو اورمسلمان اتحادکا اظہارکرتے طلبہ اور محنت کشوں کے کلکتہ بمبئی اور کراچی میں ہونے والے احتجاج ،وسیع پیمانے پر یکجہتی کی ہی علامت تھے۔بمبئی کے اندرتوعمومی نظم و نسق اس وقت قائم کیا جاسکا جب وہاں بغاوت کے بعد مظاہروں میں 248احتجاجیوں کو ہلاك اور 1046 کو زخمی کردیاگیا۔رائل انڈین نیوی میں ہونے والی بغاوت نے برطانوی راج کی بنیادیں ہلا کے رکھ دیں۔برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے 19فروری1946ء کو انڈیا میں ایک کیبنٹ مشن روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔بغاوت کا یہ واقعہ ہی سب سے اہم ترین عنصر تھا جس نے برصغیر کی آزادی کے فیصلے کو ممکن العمل کردیا۔

یہی بغاوت تھی جو سامراجی اتھارٹی کو تہس نہس کرنے کی بنیاد بنی مگر المیہ یہ ہے کہ اس واقعے کو تاریخ کے صفحات سے ہی غائب کر دیاگیا۔آزادی کے بعد ان باغیوں میں سے کئی ہجرت کر کے پاکستان آئے کہ شاید یہاں انہیں ایک نئی شناخت 'نیا تشخص میسر آجائے لیکن ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور انہیں رائل پاکستان نیوی میں کام کرنے کا اہل ہی نہیں سمجھا گیا۔کچھ ایسی ہی بدقسمتی بھارت میں رہ جانے والے ان کے ساتھیوں کا مقدر بھی بنی۔ تاہم بہت بعد میں 1973ء میں بھارتی حکومت نے انہیں سرکاری طور پر RIN کا سابق ملازم تسلیم کرلیااور بغاوت میں حصہ لینے پر ”آزادی کے مجاہد“قرار دے کرپنشن دینے کا اعلان کیا۔

یہ بات حیران کن ہے کہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی سرکاری تاریخ سے اس عظیم واقعے کو کھرچ دیاگیا ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی قیادت کا اس کی طرف رحجان اگر دشمنانہ نہیں بھی تھاتو کراہت آمیز ضرور تھا۔ایس کے پٹیل اور آئی آئی چندریگر جو ا س وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے سربراہ تھے ،نے کمال اتفاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرکارکو پیشکش کی کہ” ہم اپنے رضاکار ،پولیس کی مدد کیلئے فراہم کرنے کو تیار ہیں“۔پٹیل کی دلیل تھی کہ فوج میں کسی قسم کی دراڑیاخراش کسی طور بھی قابل برداشت نہیں ہونی چاہئے۔اور ایک مضبوط و متحد فوج ہم سب کی ضرورت ہے جو ہمیں ایک آزاد ہندوستان میں بھی چاہئے ہوگی۔گاندھی نے کہا کہ اس قسم کے واقعات سے دنیا بھر میں بھارت کی بدنامی ہوئی ہے اور ہماری ساکھ متاثر ہوئی ہے۔ہندو' مسلمان اور دیگر کی طرف سے اس قسم کی پرتشدد کاروائیاں سراسر ”غیر مقدس“ ہیں۔محمد علی جناح نے RIN کے نمائندوں سے بات کرتے

ہوئے کہا کہ ہم اسی صورت میں آپ کی مدد کرسکتے ہیں اگر آپ آئینی ‘قانونی اور پر امن طورطریقوں سے اپنے مسائل و مطالبات پیش کریں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ ان پرغور کیاجاسکتا ہے“۔ (15)

ارونا آصف علی ،گاندھی کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ مسلمانوں اور ہندوئوں کو آئینی فرنٹ کی نسبت ایک مزاحمتی مظاہرے میں متحد کرنا کہیں زیادہ آسان کام ہوتاہے۔سومیت سرکار، ارونا کے اس موقف کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نہ تو برطانویوں کو آئینی طریقوں سے ہندوستان سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کیا جاسکا اور نہ ہی کوئی بہت بڑی عوامی انقلابی تحریک کے ذریعے ایسا ممکن بنایا جاسکا۔

دستاویزات کا وہ حصہ جو 14رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے کیپٹن عبدالرشید ڈے کے موقع پر ہونے والی گڑبڑ اور رائل انڈین نیوی کی سرکشی سے متعلق ہے،مکمل واضح کرتاہے کہ ہندوستانی نیشنل لیڈرشپ کا رویہ کس قدر محتاط تھا۔سیاسی پارٹیوں کے پاس گڑبڑ اور سرکشی کو روکنے کی ایک انتہائی دلکش اور جامع دلیل یہ تھی کہ چونکہ اب اقتدار ان کو منتقل ہونے والاہے اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ ان کوورثے میں ایسی فوج ملے جو باغیانہ رحجانات کا ریکارڈ رکھتی ہواورڈسپلن سے باہرہوجاتی ہو۔اگرچہ دستاویز کے جس حصے کا ہم حوالہ دے رہے ہیں ،اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کی ہندو اور مسلمان قیادت کے بیانات مختصراً درج کیے گئے ہیں۔تاہم ان کے تفصیلی نقطہ ہائے نظر ہمیں دیگر دستاویزات میں باآسانی مل جا تے ہیں۔یہ دستاویزات ،غالباًپہلی بار،مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کے حوالے سے ایک منفرد بصیرت اور نایاب مواد ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ سال 1946ء مزدورتحریک کی بے چینی کے حوالے سے بے مثال اور یادگار سال ثابت ہوا۔یہی نہیں بلکہ اس کی کوکھ سے کئی نئی طاقتور تحریکوں نے جنم لیا ۔جس کتاب سے یہ مواد اخذ کیاگیا ہے اس میں 250دستاویزات کسانوں اور مزدوروں کے معاملات سے متعلق ہیں جو کہ بے شمار مختلف ذرائع اور پرائیویٹ اخبارات سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔جن کو پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے ،یہ دیکھ کر کہ کس طرح خاکروبوں سے لے کر کان کنوں تک ،ریل کے مزدوروں سے لے کر سفید پوش پوسٹل ورکروں اور بینک ایمپلائز تک یہاں تک کہ فوجی اداروں کی انتظامیہ کے ملازمین تک ان مظاہروں اور ہڑتالوں میں شریک ہوئے۔ریلوے اور پوسٹل ورکرز تو سارے ہندوستان میں ہڑتال پر چلے گئے تھے جبکہ اس دوران الہ آباد میں 80000مظاہرین نے دفاتر کا گھیراؤ کرلیاتھا۔یہ سبھی ہڑتالیں اور مظاہرے سختی کے ساتھ کچل دیے گئے ۔ یہ دستاویزات اس سال کی مزدورتحریکوں میں کمیونسٹوں کے کردار کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔ تاہم دستاویزات میں کسانوں کی تحریکوں سے متعلق جو مواد ہے ،وہ اپنے وقت اور کردار کے حوالے سے انتہائی اچھوتا ہے۔پنجاب سے متعلق کچھ منتشر واقعات سے قطع نظر،دستاویزات کا

ایک بہت بڑا حصہ تنجور،رامنااور مالابار کے علاقوں سے متعلق ہے جبکہ بمبئی کے وارلی قبائل کے احتجاج اور پھر بنگال میں تیبھاگا تحریک کی شروعات جو کہ مزارعین نے شروع کی تھی اور جس میں ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے امیر مالکان ان کو فصل کا دوتہائی حصہ دیاکریں جو پہلے انتہائی کم(یعنی آدھا) ہوتاتھا۔

اس مقام پر مصنف لکھتا ہے کہ ”مزدوروں کے مقابلے میں ان تحریکوں کے اندر کمیونسٹوں کی مداخلت زیادہ نمایاں تھی اور یوں بائیں بازو کی قیادت کا حامل ایک اور طاقتور احتجاج ہمارے سامنے آتاہے جسے کبھی پوری طرح نہ تو محسوس اور نہ تسلیم کیاگیا۔اور جو ابھی تک یاد کیے جانے کے قابل اور ایک کمیونسٹ تحریک کے متحرک متبادل کے طورپر موجود ہے۔تاہم مرکزی قیادت کا مصالحت کرنے کا انتخاب کرلینااور پھراس انتخاب کے نتیجے میں برصغیر کی تقسیم کو ایک لازمی معاوضے کے طور پر قبول کرلینا،یہ سب لاکھوں بے سروسامان اور خانماں خراب انسانوں کی بے شمار قربانیوں کی قیمت پر کیاگیا۔

یہ سب کچھ گزر گیالیکن یہ سب کچھ برطانوی راج سے آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کے عظیم ترین باب ہیں۔بلاشبہ اس بغاوت اس سرکشی کو کچل دیاگیا مگر اس سے قابض برطانیہ کو یہ سمجھ آگیاکہ اس کا مستقبل کیا ہوگا!اسی کے براہ راست نتیجے میں ہی برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ کو اعلان کرنا پڑگیاکہ برطانیہ جون 1948ء سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ دے گا۔یہ کیفیت تھی کہ ایک تحریک کو شکست دیتے اور اسے کچلتے ہوئے برطانوی حکمرانوں کا اعتماد کس قدر کھوکھلا اور شکستہ ہو چکا تھا!برطانوی سامراجی ،مقامی بورژوا قیادت کے ساتھ ساز باز کرکے نسلی اور مذہبی بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم کا منصوبہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ان واقعات کے بعد برطانویوں نے طے کر لیاتھا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑدیں گے مگر ایسے نہیں چھوڑیں گے ،انہوں نے فیصلہ کرلیاتھاکہ وہ اپنی اس راجدہانی کو متحد حالت میں نہیں بلکہ منقسم کر کے ہی روانہ ہوں گے ،خواہ اس کی کوئی شکل ہو اور کچھ بھی کرناپڑجائے۔اس کوکسی کنفیڈریشن کی شکل دے دی جائے یا کوئی اور سیاسی روپ بہروپ ،جس کا ارادہ شایدوہ ان تاریخی واقعات سے پہلے ہی کر چکے تھے ۔یہ طے ہوگیاکہ برطانیہ” تقسیم کرو اور راج کرو“کی پالیسی پر عمل کا فیصلہ کرچکاتھا۔بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کی مروجہ سیاسی تاریخ میں ایسے عظیم الشان واقعات کا سرے سے ریکارڈ نہ ہونا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ایسے کئی بڑے زندہ و پائندہ واقعات اور بھی ہیں جنہیں ابھی عوام کے سامنے آنا اورمنظرعام پر لایا جانا ہے۔نوجوانوں اور مزدوروں کی نئی نسلوں کو فروری 1946ء کے جہازیوں کی ہڑتالی کمیٹی کے پیغام اور ان کے ولولے کو پڑھنا‘ سمجھنا اور محسوس کرنا ابھی باقی ہے۔اس بغاوت کی شدت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو دہلا کے رکھ دیاتھا اور

اس کے انتہائی گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے تھے۔کمیونسٹ قیادت شدید دبائو میں تھی اور نیچے سے اس کے کارکنوں، عہدیدار وں،فل ٹائمروں اور نوجوانوں میں تذبذب بڑھتا ہی چلا جارہاتھا۔کمیونسٹ پارٹی نے بمبئی میں ایک عام ہڑتال کی کال دی جس نے سارے شہر کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ جب ریاست کے مسلح جتھے احتجاج کرنے والوں کو کچلنے کیلئے نکلے تو مزدوروں نے سارے رستے اس طرح سے بند کر دیے کہ وہ کوئی نقل وحرکت ہی نہ کر پائیں۔شہر کی سبھی گلیاں اور رستے کارزار بن گئے۔تین دنوں تک جاری رہنے والی،ریاستی اداروں کے ساتھ ان جھڑپوں کے نتیجے میں 400سے زائد افراد ہلاک جبکہ سینکڑوں زخمی ہوگئے۔19مارچ1946ء کو ملک کے سبھی اہم شہروں میں موجود پولیس کے مراکز میں ایک ہڑتال پھٹ پڑی۔الٰہ آباد میں توپولیس نے بھوک ہڑتال کر دی۔دہلی پولیس 22مارچ کو ان کے ساتھ شریک ہوگئی۔3اپریل کو بہار میں 10000پولیس اہلکار ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔اور پھر ورکرز بھی جلد ہی ہڑتالوں کے اس سلسلے میں شامل ہوگئے۔2مئی 1946ء کو نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ہڑتال ہوگئی۔پھر 11جولائی کو پوسٹل ورکرز نے سارے ملک میں ہڑتال کا اعلان کردیا۔اس کے ساتھ ہی صنعتی ورکروں نے بھی ہڑتال کے اس عمل میں بھرپور شریک ہونے کا اعلان کردیا۔یوں سارا ہندوستان ان سرکشیوں'بغاوتوں اور ہڑتالوں کا حصہ بن گیا۔برطانیہ اپنے ریاستی مسلح اداروں پر کنٹرول سے ہی محروم ہوتا جا رہاتھا۔اس کڑے اور کٹھن وقت میں سامراجی راج کو ہزیمت سے بچانے کیلئے سب سے پہلے ، ہندوستان کی ہر مذہب کی سیاسی قیادت کومیدان میں اترناپڑا۔

کانگریس کی قیادت اس انقلابی کیفیت سے لرز کر رہ گئی۔خطرے کی گھنٹیاں تیزی سے بج رہی تھیں۔ 1939ء سے 1946ء تک کانگریس کے سربراہ مولانا ابوالکلام آزادکا کہنا تھا کہ یہ ابھی براہ راست عمل کا وقت نہیں ہے۔اس کے بقول ”ابھی ہمیں واقعات کے تسلسل کو دیکھنا چاہئے اور تب تک برطانوی حکومت کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے“۔جبکہ نہرو کاموقف تھا کہ ”جو کچھ ہو رہاہے اور ہو چکاہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح سے سماج دشمن عناصر بمبئی جیسے بڑے شہروں میں صورتحال کو خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ہماری آزادی کا دن زیادہ دور نہیں اور ایسے اشارے موجود ہیں جن سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی جیتنے کے نزدیک پہنچ چکے ہیں مگر میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ہم میں اس نظم و ضبط کا شدید فقدان ہے جو کہ ایک آزاد ملک کیلئے ضروری ہوتا ہے“۔(16)

فروری1946ء میں کلکتہ اور مدراس بھی پھٹ پڑے جبکہ کراچی میں کیفیت کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئی کہ اسے انتہائی بے رحمی سے کچلنا ضروری ہوگیاجس کے نتیجے میں بہت سے انقلابی جہازیوں اورسپاہیوں کو ہلاک کردیاگیاجبکہ سینکڑوں زخمی

ہوگئے۔ لندن وائیٹ ہال کومسٹر آچنلیک Auchinleck کی طرف سے ایک ٹیلیگرام بھیجا گیا ،جس میں کہا گیا کہ 'اگر تم نے ان کو تین دنوں میں آزادنہیں کیاتویہ لوگ زبردستی تم سے اپنی آزادی چھین لیں گے'۔ 1940ء سے 1945ء تک سر ونسٹن چرچل کے چیف آف سٹاف رہنے والے جرنیل اور جو اس وقت ہندوستان کا چیف آ ف سٹاف اور برٹش انڈین آرمی کا ایک جہاندیدہ جرنیل تھا،نے برملا بیان دیا کہ " ہندوستان ،بیچ سمندر موجود ایک ایسا بحری جہاز بن چکاہے ،جسے آگ لگ چکی ہے اور جو گولہ بارودسے لداہواہے "۔ اس کا لارڈ مائونٹ بیٹن سے سوال تھا کہ کیا ہم اس آگ پر قابو پاسکتے ہیں اس سے پہلے کہ یہ بارود کے ذخیرے تک پہنچ جائے؟

چونکہ سارا برصغیر ہی انقلابی ابھار سے لبریز ہوچکاتھا ،لہٰذا یہ ناگزیر ہو چکاتھا کہ برطانوی جاتے جاتے اپنے پیچھے متحدہ ہندوستان نہیں بلکہ منقسم و منتشر ہندوستان ہی چھوڑکر جائیں ۔اسے تقسیم ہونا تھا۔ایک بارپھر ہند واور مسلمان سپاہی1946ء کی تحریک میں ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر لڑے۔مسلح افواج میں نصف سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔مذہبی تفریق کو مسترد کرتے ہوئے بری' بحری اور فضائی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے اپنے ہندو اور یگر مذاہب کے سپاہی بھائیوں کے ساتھ مل کرجدوجہد کی۔بمبئی کی ہڑتال کے دوران ہندو مسلم ورکروں نے باہم مل کر محاصرے ترتیب و تشکیل دیے تھے۔کلکتہ اور دوسرے کئی شہروں میں ہند وئوں اورمسلمانوں نے انڈین نیشنل آرمی کے گرفتار شدہ سیاسی کارکنان اور عہدیداروں کی رہائی کیلئے بے شمار مظاہرے اور احتجاج منظم کیے ۔ ان گرفتارشدگان کا تعلق ہر مسلک و مذہب سے تھا۔سارے برصغیر میں پھیلی ہوئی اس عوامی تحریک کا نشان سرخ پرچم ہوا کرتاتھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے متذبذب اور ڈانواڈول ہونے کے باوجود پارٹی کے ہزاروں ورکراور نوجوان فل ٹائمرز سوشلسٹ انقلاب برپاکرنے کی آرزو میں تڑپ رہے تھے۔ا س دور کی ادبی تحریروں میں ہمیں اس ناآسودہ تڑپ کی بے شمار واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔لبرل ناول نگار اور معروف تنقیدنگار خوشونت سنگھ نے برصغیر کی تقسیم کے حوالے سے اپنے مشہور ناول "ٹرین ٹو پاکستان"میں کمیونسٹ پارٹی کے نوجوان فل ٹائمر اقبال سنگھ کی ذہنی و قلبی کیفیت کو بیان کیا ہے ،جسے ایک جدید شہری علاقے سے پاک و ہندکی نئی سرحدکے نزدیک ایک دیہی علاقے منومرجا بھیجا جاتاہے :

"گائوں کے گردوارے کے صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ،آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھتے ہوئے اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سوچا کہ ہر کوئی ہندو،مسلمان ،سکھ،کانگریسی،لیگی،اکالی یاکمیونسٹ سب اس میں ڈوبے ہوئے ہیں،ضروری تھا کہ قوموں' مذہبوں کے ان سبھی جذبوں کو پاش پاش کردیاجاتا اوران کو مراعات یافتہ طبقات

کے خلاف کام میں لایا جاتا۔یہی پرولتاری انقلاب ہوتا اور یہی آسان رستہ تھا۔اس وقت اقبال کی قیادت میں سے کوئی اس کے پاس موجود نہیں تھا جو اس چاندنی میں اس کے چہرے پر موجود سرخی کو محسوس کرسکتا"۔(17)

طبقاتی بنیادوں سے پیوستہ پرولتاریہ انقلاب کی طرف مائل ایک مزدور تحریک ہی واحد رستہ تھی جس سے تقسیم کیلئے درکار متعصبانہ جذبوں اورمنافرانہ رویوں سے محفوظ رہاجاسکتا تھا۔ پرولتاری انقلاب کیلئے درکار سبھی عوامل و عناصر موجود تھے مگر یہ قیادت ورہنمائی سے محروم تھے۔ جب پرولتاریہ کے نام لیوا اور علمبردار ایسے موقعوں پر غلطی کریں تو اس کی سزا صدیوں تک کئی نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔

کوئی بھی انقلابی یا قبل از انقلابی کیفیت زیادہ لمباعرصہ قائم نہیں رہاکرتی ۔عوامی تحریکوں میں اتار چڑھائو آتے ہیں۔لیکن جونہی کوئی تحریک ناکام ہوکر پلٹتی ہے تو ناگزیر طورپر ردانقلاب سماج پرغلبہ حاصل کرلیاکرتاہے۔برصغیر میں جونہی تحریک کمزور پڑی اورایک ممکنہ انقلاب کو مصالحت وغداری کی بھینٹ چڑھادیاگیا تو پھر انہی محروم و مقہورانسانوں کوہی اس کے تباہ کن نتائج بھگتنا پڑ گئے۔قومی آزادی کی تحریک کی قیادت سے کمیونسٹ پارٹی کے الگ تھلگ ہوجانے سے انڈین بورژواقیادت معاملات اورحالات پر حاوی ہوتی چلی گئی۔اگر پورا سچ بیان کیا جائے تو انڈین بورژوازی نے کبھی آزادی کی لڑائی لڑی ہی نہیں ہاں البتہ یہ عوامی جدوجہد کو بروئے کار لاکر برطانوی حکمرانوں سے لین دین اور سازباز ضرورکرتے رہے۔وہ براہ راست اپنے ہاتھوں میں اقتدار لینے کے آرزومند تھے۔برطانیہ طاقت سے محروم ہوتا جارہاتھا۔تحریک جتنی مشتعل ہوتی گئی بغاوتوں کی شدت اور برطانوی فوج سے بھاگنے والے سپاہیوں کی تعداد میں اوربھی اضافہ ہوتاچلاگیا۔

ونسٹن چرچل اور اس کی کنزرویٹو پارٹی کو دوسری عالمی جنگ کے بعد ہونے والے انتخابات میں بدترین شکست سے دوچارہوناپڑاتھا۔جنگ مخالف جذبات اس الیکشن میں انتہائی مضبوط عنصر ثابت ہوئے ۔ 26جولائی1945ء کو برطانوی پارلیمان کے نتائج کا اعلان کیاگیا ۔کلیمنٹ کی سربراہی میں لیبر پارٹی نے 388نشستیں جیتتے ہوئے واضح اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل کرلی۔برطانوی حکومت کے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں رہاتھا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیتی۔ اپنے اصلاح پسندانہ چہرے کے باوجود لیبر پارٹی بھی اپنی نوآبادیوں میں ٹوری پارٹی کی طرح سرمایہ دارانہ حکمرانی کی ہی خواہشمند تھی۔کلیمنٹ ایٹلی کی لارڈ مائونٹ بیٹن (جوملکہ وکٹوریہ کا پوتاتھا)کو انڈیا کا آخری وائسرائے نامزدکرنا اس بات کا اقرارتھا کہ نئی لیبر حکومت پرانی پالیسیوں کو ہی جاری و ساری رکھے گی۔برطانوی راج اور اس کے سیاسی نمائندوں کے پاس کسی طورکوئی طے شدہ منصوبہ نہیں تھاکہ وہ ہندوستان کیسے 'کب اور کس طرح چھوڑیں گے۔ دنیا بھر کے ہر

حکمران کی طرح یہ حکمران بھی انقلاب سے خوفزدہ تھے اور دوسری طرف وہ کسی بھی قسم کے انتشار سے بھی بچنا چاہتے تھے۔کیونکہ ہر دو کیفیتیں جب سامنے آتی ہیں تو منافعوں کا نظام اتھل پتھل ہوجاتاہے جبکہ جائیدادیں اور حکمران طبقات کے اثاثے خطروں کی زد میں آتے ہیں ۔چنانچہ ان حکمرانوں نے ایک موثراور پرامن تبدیلی کی کوشش کرنی چاہی۔وائیٹ ہال سے کئی مشن ہندوستان روانہ کیے گئے تاکہ سرمایہ دارانہ اقتدار کو برقراراور سامراجی لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کی کوئی حتمی شکل نکالی جاسکے۔انہی میں سے ایک کابینہ مشن بھی تھا جو1946ء میں ہندوستان روانہ کیا گیا۔

کابینہ مشن پلان

کابینہ مشن مئی کے اوائل میں انڈیا پہنچا۔ 16مئی کو ''کیبنٹ مشن پلان''شائع کیاگیا۔اس کے مطابق مرکزی حکومت ہی دفاع،خارجہ امور اور مواصلات کی مکمل ذمہ دار ہوگی۔اس کے تحت برصغیر کو تین علاقوں A,B,Cمیں تقسیم کیاگیا۔Bزون میں پنجاب' سندھ،این ڈبلیو ایف پی (پختونخواہ) اور برٹش بلوچستان شامل تھے۔ Aمیں مسلمانوں کی اکثریت اس علاقے میں ہوگی۔ Cسیکشن جس میں بنگال اور آسام بھی آتے تھے مسلمان اقلیت میں ہوں گے۔یہ تصورکیاگیا کہ ایک تو اس سے مسلم اقلیت مطمئن ہوجائے گی دوسرا اس سے مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیے جانے والے قانونی تقاضوں کی بھی تسلی وتشفی ہو جائے گی۔پہلے پہل جناح نے اس منصوبے کو یکسر مستردکردیا ۔مسلم لیگ تو بہت آگے چلی گئی اور ایک الگ آزادملک کا مطالبہ کر دیااور وہ اس سے پھر کبھی پیچھے ہی نہ ہٹی۔کانگریس کے صدرمولاناآزاد نے اس منصوبے کو تسلیم کرنے کا اعلان کردیا۔مسلم لیگ کونسل نے حتمی فیصلے کیلئے تین دن کی مہلت مانگ لی۔ آخری دن جناح اس منصوبے کو تسلیم کر لینے کے موڈ میں تھا۔اس نے کونسل کو بتایا کہ یہ سب سے اچھا ممکنہ منصوبہ ہے جسے سوچا جاسکتاتھا۔دوسرے الفاظ میں اس نے کونسل پر زوردیا کہ وہ اس منصوبے کی حمایت کرے۔کونسل نے متفقہ طورپر اس کی منظوری دے دی۔کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے کابینہ مشن پلان کی منظوری ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم واقعہ تھا۔

26اپریل1946ء کومولاناآزاد نے ایک بیان جاری کیا جس میں نہرو کا نام کانگریس کی صدارت کیلئے تجویز کیاگیا اور کانگریس کے سبھی ارکان سے اپیل کی گئی کہ وہ سب متفقہ طورپر نہرو کوصدارت کے منصب کیلئے منتخب کر لیں ۔چنانچہ نہرو متفقہ طورپر کانگریس کا نیاصدر بن گیا۔کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرح سے مسلم لیگ کونسل بھی متفقہ طورپر کیبنٹ مشن پلان کو قبول کر چکی تھی۔تاہم ابھی تک اسے آل انڈیا

کانگریس کمیٹیAICCکی طرف سے حتمی منظوری ملنا ضروری تھا۔یہ سوچا جارہاتھا کہ یہ محض ایک رسمی کاروائی ہی ثابت ہوگی کیونکہ AICCشروع سے ہی ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی تائید کرتی چلی آرہی تھی۔ 7جولائی کو بمبئی میں اس کااجلاس طلب کرلیاگیا جس میں کافی تلخ بحث مباحثے کے بعدرائے شماری کرائی گئی اور کثرت رائے کے ساتھ منصوبے کو قبول کرنے کی ایک قرارداد منظور کرلی گئی۔ مگر 10جولائی کو نہرو نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں اس نے حیران کر دینے والا بیان دے دیا۔کچھ اخباری نمائندوں نے اس سے سوال پوچھا کہ AICCکی طرف سے قراردادکی منظوری کے بعدکیا یہ سمجھ لیا جائے کہ AICCکانگریس نے کابینہ مشن پلان کوعبوری حکومت کی تشکیل سمیت مکمل قبول کرلیا ہے ۔ اس کے جواب میں نہرو نے کہا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی کا حصہ بنے گی۔اس نے کہا کہ ہم کسی بھی معاہدے کے پابند نہیں ہیں اور ہم صورتحال کے مطابق حکمت عملی اور نقطہء نظر اپنانے کیلئے آزاد ہیں۔ایک اور سوال کے جواب میںنہرو نے واضح کیا کہ کانگریس نے صرف آئین ساز اسمبلی ہی میں شریک ہونے پر اتفاق کیا ہے ۔اور ہم نے طے کیا ہے کہ ہم کیبنٹ مشن پلان کے بہترین ہونے کے باوجود اپنے موقف میں ترمیم یاتبدیلی کیلئے آزاد ہیں۔

نہرو کی طرف سے نقطہء نظر کی اس اچانک تبدیلی نے بورژوا بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم سے بچنے کے امکانات کو ہمیشہ کیلئے ناممکن بنادیا۔نہرو کے اس اچانک بدلائو نے ہندو بورژوازی کی تنگ نظری کو عریاں کردیایہی نہیں بلکہ وہ نادیدہ قوتیں بھی عیاں ہوکر سامنے آگئیں جو اس سارے کھیل میں اب تک پس پردہ کارفرما چلی آرہی تھیں۔ اور جو برصغیر کی تقسیم کیلئے سرگرم عمل اور سرگرداں تھیں۔اور یہ کوئی حادثہ بھی نہیں تھا کیونکہ یہ قوتیں جانتی تھیں اور ڈری ہوئی تھیں کہ ایک متحدہ برصغیر میں سرمایہ دارنہ نظام اور سامراجی تسلط کے خلاف طبقاتی جدوجہد اور انقلابی سرکشی کے خطرات زیادہ ممکن' زیادہ موثر اور زیادہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔لیڈی ایڈوینا مائونٹ بیٹن نے اس سلسلے میں نہرو پر کس قدر محنت کی اور اپنے سحر میں قابو کیا ،یہ بات تاریخ میں اب تک ایک سربستہ راز ہے۔اب جا کر ایلکس وان تنزلمین **Alex von Tunzelman** کی 2007ء میں شائع ہونے والی کتاب ”انڈین سمر“ **IIndian Summar** میں اس معاشقے کااحوال بیان کیاگیا ہے۔اس کتاب پر ایک فلم بنائی جارہی ہے جس میں کیٹ بلانچٹ ایڈویناماﺋونٹ بیٹن کا کردار اداکررہی ہے،یہ فلم 2009ء میں ریلیز ہوگی۔

مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان کو دبائو میں آکر قبول کیاتھا۔ذاتی طورپر جناح اس سے خوش نہیں تھا۔اس نے لیگ کونسل میں واضح طورپر کہاتھا کہ وہ محض اس لئے اس کی تائید کا کہہ رہاہے کیونکہ اس سے بہتر کچھ حاصل ہی نہیں ہو سکتاتھا۔اس کے سیاسی مخالفوں نے الزام تراشی شروع کر دی کہ وہ اپنے کیے گئے وعدوں پر قائم نہیں

رہا۔انہوں نے الزام عائد کیا کہ اس نے اپنے ایک آزاد اسلامی ریاست کے نظریے کو ترک کردیاہے۔نہرو کے بیان نے سبھی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیاتھا۔جناح نے فوری طورپر ساری صورتحال پر نظرثانی کرنے کا مطالبہ کردیا اور لیاقت علی خان سے کہا کہ وہ اس مطالبے پرغور کیلئے لیگ کی کونسل کا اجلاس طلب کرے۔کانگریس کے صدر نے واضح طورپراشارہ کر دیاتھا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ساری سکیم کو بدل کر رکھ دے گی،اس سے سبھی اقلیتیں اکثریت کے رحم وکرم پر آجاتیں۔ جناح نے یہ سوچا کہ چونکہ کانگریس نے کابینہ مشن پلان کو مستردکردیا ہے اس لئے وائسرائے اب مسلم لیگ کو بلائے گا اور کیونکہ مسلم لیگ منصوبے کو تسلیم کر چکی ہے لہٰذا وہ اسے حکومت سازی کی دعوت دے گا۔جناح ایک حددرجہ خود پسند انسان تھا اور اس نے کانگریس کے عمل کو ذاتی تضحیک تصورکیا۔یوں ہندو مسلم اتحاد کا اب تک ایک مہان علمبردار چلا آنے والاجناح ایک الگ مسلمان ملک پاکستان کا غیر متزلزل وکیل بن کر سامنے آگیا۔

کولنز اورلاپائرے اپنی کتاب ”**Freedom at Midnight**“میں جناح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ” ہندوستان کے مسلمان عوام کا ایک ایسامشکوک رہنما جس کا تصور بھی مشکل سے کیا جاسکتاہے۔محمد علی جناح کا اسلام بس یہاں تک تھا کہ یہ اس کے والدین کا مذہب تھا اور بس۔وہ شراب پیتا،سورکھاتاجو روزانہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے اپنی داڑھی منڈواتااور مکمل کلین شیو کرتا ہے۔وہ کبھی جمعہ نماز کیلئے مسجد نہیں جاتا،خدا اور قرآن کا جناح کے دنیاوی حساب کتاب اور نقطہ ء نظر میں کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔جناح کا سیاسی دشمن گاندھی اس سے کہیں زیادہ قرآنی آیتیں جانتا ہے۔اور تو اورجناح مسلمانوں کی عوامی زبان اردومیں مسلسل دوچار فقرے بھی اداکرنے سے قاصر ہے مگر اس کے باوجود بھی یہ امر حیران کن ہے کہ یہ جناح ہی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کا نمائندہ بننے کا اعزازحاصل کرنے میں کامیاب رہاہے“۔(18)

جناح ہمیشہ اپنے مخالفوں کے ساتھ نخوت سے پیش آتا۔وہ نہرو کو **Peter Pan** کہتاتھا۔ ایک ایسا ادیب جسے سیاستدان کی بجائے انگریزی کا پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔یاپھریہ کہ نہرو ایک ایسا معزز برہمن ہے جس نے اپنی ہندوانہ مکاری کو اپنی مغربی تعلیم کے غلاف میں چھپارکھاہے۔گاندھی ،جناح کے نزدیک ایک چالاک و عیار لومڑی ہے۔وہ ہندوازم کے احیاء کاپرچارک ہے۔جناح مہاتما گاندھی کو کبھی نہیں بھولا جو ایک بار اس کے گھر ملنے آیا تواپنے مٹی سے بھرے جسم سے اس کے انتہائی بیش قیمت ایرانی قالینوں کا ستیاناس کرگیاتھا۔ **27**جولائی**1946**ء کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔جناح نے اپنے ابتدائی کلمات میں پاکستان کے مطالبے کو دہرایا اوراسے مسلم لیگ کیلئے واحد راستہ قراردیا۔تین دن تک کے بحث مباحثے کے بعد کونسل نے

کابینہ مشن پلان کو مسترد کردیا۔اس نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کے حصول کیلئے براہ راست ایکشن کا رستہ اختیار کیا جائے گا۔

مولانا آزاد سمیت کانگریس کے کئی ایک رہنما اس نئی صورتحال سے پریشان ہو کر رہ گئے۔ 8اگست1946ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ بلائی گئی جس میں آزاد نے موقف اختیار کیا کہ صورتحال کو بچانے کیلئے ہمیں چاہیے کہ ہم یہ قرار دے دیں کہ بمبئی پریس کانفرنس میں کہی جانے والی باتیں نہرو کا ذاتی موقف تھااور اس سے کانگریس کے فیصلے کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ۔لیکن اس پر نہرو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اگر کانگریس ورکنگ کمیٹی ایسی قرارداد منظورکرتی ہے کہ کانگریس کے صدر نے جو کہا اس کا کانگریس کی پالیسی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے تو اس سے نہ صرف کانگریس کا کچھ باقی نہیں بچے گا بلکہ خوداس کا بھی ۔اپنی کتاب India Wins Freedomمیں جو اس نے اپنے دیرینہ کامریڈ اوردوست جواہر لال نہرو کے نام انتساب کی ہے،ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولاناآزادنے کہا ”یہ ہندوستان کی تاریخ کے بدقسمت ترین المیوں میں سے ایک المیہ ہے۔اور میں انتہائی کرب اوردکھ کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتاہوں کہ اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری نہرو پر ہی عائد ہوتی ہے۔اس کے المناک بیان نے کہ کانگریس کابینہ مشن پلان کے بارے میں کوئی بھی کاروائی کرنے میں آزاد ہے،سبھی گم گشتہ کمیونل اور سیاسی مسائل کو ازسرنو سامنے لاکھڑاکردیا۔مسٹر جناح نے اس(نہرو) کی غلطی سے بروقت فائدہ اٹھایا اوروہ کابینہ مشن پلان کی منظوری سے دستبردارہو گیا جسے پہلے مسلم لیگ کی طرف سے تسلیم کیا جاچکاتھا“۔(19)

آزادایک بارپھرنہرو کے بارے میں لکھتا ہے ”مائونٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے کے ایک ماہ کے اندر اندربرصغیر کی تقسیم کایہ سخت گیر مخالف نہ جانے کیوں اورکیسے اسی تقسیم کا، اگرعلمبردار نہ بھی کہیں ، تو اس کا حمایتی بن کر سامنے آگیا ۔میں انتہائی حیران و پریشان تھا کہ کیونکرلارڈ مائونٹ بیٹن نہرو کا اس قدر مداح بن گیا۔نہرو بلاشبہ ایک بااصول لیڈر ہے لیکن وہ ایک ایسا بے صبرا شخص ہے جو کسی ذاتی ترغیب پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتاہے۔ میرے خیال میں نہرو کے بدلنے کی ایک اہم وجہ لیڈی ایڈوینا مائونٹ بیٹن کی شخصیت ہے جونہ صرف انتہائی ذہین بلکہ انتہائی پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دوستانہ مزاج کی بھی حامل ہے“۔(20)

اپنی اسی کتاب میں ہی آزاد گاندھی کے بارے میںلکھتا ہے کہ” میں جب دوبارہ گاندھی سے ملنے گیا تو مجھے اپنی زندگی کے سب سے شدید صدمے اورحیرانی کا سامناکرنا پڑگیا۔مجھے محسوس ہوا کہ اگرچہ وہ ابھی کھل کر تقسیم کے حق میں نہیں بول رہاتھا مگر وہ اس کے خلاف بولنے سے بھی کتراربہاتھا۔جس بات نے مجھے سب سے زیادہ حیرت اورصدمے سے دوچارکیا ،وہ یہ تھی کہ گاندھی وہی دلائل دہرارہاتھا جو سردارپٹیل

پہلے پیش کرتا چلاآرہاتھا۔میں نے دو گھنٹوں تک گاندھی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری ایک بھی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھا"۔(21)

پٹیل کے کردار کے بارے میں آزاد لکھتاہے "یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ والابھائی پٹیل ہی برصغیر کی تقسیم کا بانی مبانی ہے"میں حیران ہوا جب پٹیل نے کہا کہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر میں دو قومیں آباد ہیں ۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسلمان اور ہندو اب یہاں ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے۔بہتر یہی ہے کہ ہم اس واضح لڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے بخوشی الگ ہوجائیں بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتے رہیں۔مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پٹیل جناح سے کہیں بڑھ چڑھ کر تقسیم کے نظریے کی وکالت پر اترا ہواتھا۔جناح نے بلاشک وشبہ تقسیم کا پرچم لہرایامگر اس پرچم کی سربلندی کیلئے پٹیل زیادہ جوش جذبے کے ساتھ سرگرم ہوچکاہے"۔(22)

14جون1947ء کو کانگریس کی AICC کی میٹنگ ہوئی ،کانگریس جو اپنی ابتدا سے ہی ہندوستان کی وحدت اور آزادی کی لڑائی لڑتی آرہی تھی،یہی کانگریس اس میٹنگ میں ہندوستان کے بٹوارے کی قرارداد منظورکرنے جا رہی تھی۔گاندھی نے بحث میں مداخلت کرتے ہوئے ورکنگ کمیٹی کے ارکان سے اپیل کی کہ وہ پنڈت پانت کی طرف سے پیش کی جانے والی قرارداد کی منظوری دے دیں۔ جب قرارداد پیش کی گئی تو تقسیم کے حق میں 29جبکہ اس کی مخالفت میں 15ووٹ آئے۔یعنی گاندھی بھی کمیٹی کے تمام ممبران کوملک کی تقسیم کیلئے راضی نہیں کر سکا۔اس میٹنگ میں سندھ سے تعلق رکھنے والے ارکان نے شدت کے ساتھ تقسیم کی قراردادکی مخالفت کی۔انہیں ہر قسم کی یقین دہانیاں کرائی گئیں، انہیں‌نجی بحثوں‌میں کہا گیا کہ اگر تقسیم کے بعد ان کے ساتھ کوئی مسئلہ 'کوئی زیادتی کی گئی' ان کی عزت نفس کا احترام نہ کیاگیاتو اس کا بدلہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیاجائے گا۔اس سے واضح ہوگیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اگر اقلیتوں کے خلاف کچھ ہوا تو اس کا انتقام دوسرے ملک میں رہنے والی اقلیت سے لیا جائے گا۔یہ ایک وحشیانہ سوچ تھی جو کہ پروان چڑھائی جارہی تھی اور جس کا مقصد محض منافرت کوفروغ دیناتھا۔

معصوموں کا قتل عام(بٹوارے کے بعد)

اچاریہ کرپپالانی جو اس وقت کانگریس کا صدر تھا ،نے اس قسم کے خیالات کی تباہ کاریوں کو محسوس کرلیا تھاکہ اس کے کیا بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں۔اگر ان خیالات کو پھیلایا گیا اور پھلنے پھولنے کا موقع دیاگیا تو اس سے ہندوستان میں مسلمانوں اور

پاکستان میں ہندوئوں پر جبر وتشدد اور ان کے قتل عام کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔برصغیر کے بٹوارے کے بعد نئی سرحدوں کے آرپار خون کے جو دریا بہائے گئے ،یہ ساراخونی کھیل انتقام کی اسی منافرانہ سوچ اور نظریے کا ہی شاخسانہ اور نتیجہ تھا۔

یہ طے پایا کہ بھارت 15اگست کو جبکہ پاکستان اس سے ایک دن قبل وجود میں لایا جائے گا۔14اگست کو مائونٹ بیٹن کراچی آیا جہاں اس نے پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا۔وہ اگلے دن واپس آیا اور نصف شب کو بھارت وجود میں آگیا۔مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ ''اگرایک متحدہ برصغیر آزادہوتا تو اس بات کے امکانات انتہائی کم ہوتے کہ برطانیہ یہاں کی معاشی اور صنعتی زندگی پر اپنا پہلا سا کنٹرول قائم رکھ سکتا''۔(23)

ان دونوں نئی ریاستوں نے آگ اور خون' قتل و غارتگری سے بھری کوکھ سے جنم لیا۔ہزاروں سالوں سے چلی آرہی مذہبی ،نسلی اور علاقائی ہم آہنگی کو کچھ دنوں کے اندر اندر منافرتوں اور خونریزیوں کی بھینٹ چڑھادیاگیا۔خاندانوں کے خاندان اپنے اپنے آبائی شہروں' قصبوں' دیہاتوں اور گھروں سے نکل جانے یا نکال دیے جانے پر مجبور کردیے گئے۔انسانوں سے لدی ہوئی ریلوں کی ریلیں تہہ تیغ کر دی گئیں۔ 14اگست کی صبح انسانی خون سے سرخ اور فضاانسانی چیخوں سے لبریز ہوچکی تھی۔یہ انقلاب کی ناکامی کا انتقام تھا ،لاکھوں معصوم انسانوں کے خون میں لت پت آزادی کی صبح۔مذہبی تعصب کے رجعتی پاگل پن کی وحشت وبربریت کی طرف سے خونریزی کی انتہاکر دی گئی اور اس کی شدت اتنی تھی کہ خود تقسیم کی وکالت کرنے والے ششدرو شرمسار ہو کر رہ گئے۔

سب سے زیادہ وحشت اور بربریت کا مظاہرہ بنگال اور پنجاب میں کیاگیا۔المیہ یہ ہے کہ یہی وہ علاقے تھے جہاں سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیانے سب سے پہلے اپنے دونوں اخبارشروع کیے تھے۔امرتسر سے پنجابی زبان میں''کرتی''(worker)جبکہ کلکتہ سے بنگالی میں لنگال (plough) نکالا گیاتھا۔اس کے باوجود پھر یہی پنجاب اور بنگال کے مزدور کسان ہی تھے جنہوں نے اس تقسیم کے آدم خور المیے میں سب سے زیادہ جانیں دیں۔تقسیم کے اس خنجرکو منافرت وتعصب کے زہر میں ڈبو یاگیا اور اسے دوقوموں کے مشترکہ سینے میں گھونپا گیا اوراسے بیچ سے چیر کر رکھ دیاگیا۔

اگست 1947ء سے لے کر ستمبر تک کا ساراعرصہ پنجاب جہنم کا منظر پیش کرتارہا،یہ اتنا ہولناک تھا کہ جس کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا ،یہ اتنا المناک تھا کہ جس کی شدت کا شمار ہی ناممکن تھا،یہ ایسی وحشت تھی کہ وحشت بھی پشیمان ہوگئی ،یہ ایک ایسی خونریزی تھی کہ جس کا نہ جواز تھا نہ کوئی وضاحت۔

کولنز اور لاپائرے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں''لاہور کے گٹروں سے انسانی خون ابل رہاتھا۔مشرق کا خوبصورت پیرس تباہی و بربادی کا منظر پیش

کررہاتھا۔لاہور سے کچھ ہی فاصلے پرواقع امرتسر کے بیشتر علاقے،خاص طورپر اس کے مسلمان علاقے ، میں مکان اور گھروں کی جگہ اینٹیں اور ملبے ہی باقی بچے تھے۔جل چکے اورجلتے ہوئے گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں ہر طرف سے آسمان کی طرف جاتا نظر آرہاتھا۔اور یہ صرف امرتسر ہی نہیں تھا بلکہ سارے کا سارا پنجاب ہی خاک وخون سے لتھڑ چکا تھا"۔(24) اس وقت کے ایک جید صحافی رابرٹ ٹرمبل نے "نیویارک ٹائمز" میں 12ستمبر1947ء کو لکھا کہ "یہاں گولی کے ذریعے مارے جانے کو رحمدلی سمجھا جارہاہے کیونکہ تشدد لاٹھیوں' پتھروں اور اینٹوں سے مارے جانا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے' زخمی ہونے والے بے یار ومددگار پڑے رہتے ہیں اور پھر گرمی اور مکھیاں ہی ان کا خاتمہ کرتی ہیں۔سفاکی کا کوئی رنگ ونسل کوئی حسب نسب نہیں ہواکرتا۔اگست کے یہ سارے دن پنجاب میں اس قدیم مذہبی قانون کی نمائندگی کر رہے ہیں جس کے مطابق آنکھ کے بدلے آنکھ کاحکم ہے۔یہی ہورہاہے،قتل عام کے بدلے قتل عام،زنا کے بدلے زنا،بے رحمی کے مقابلے میں بے رحمی۔ٹرینیں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی قبریں بن گئی ہیں۔ ریلوے لائنیں لاشوں سے اٹی ہوئی ہیں اور ٹرینیں ایسے ان بے گوروکفن لاشوں پر سے گزررہی ہیں جیسے کوئی بحری جہاز گہرے سمندر کے بیچ میں سے جارہاہو۔یہ ٹرینیں ان لاشوں کو کچلتی کاٹتی ہوئی اپنی اپنی منزل مقصودکی طرف گامزن ہیں۔ڈبوں میں سوار ہوتے ہی چیخوں اور سسکیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتاہے۔کوئی بھی ،ٹرین لاہور یا امرتسر پہنچنے کیلئے تین سے چار دن لگا دیتی ہے اور وہ بھی اس کیفیت میں کہ جو زندہ سوارہوتے ہیں ان میں سے بیشتر کوزندہ یا سلامت اترنانصیب نہیں ہوتا۔

سڑکوں پر جو قافلے رواں دواں ہیں،وہ سست روی کے ساتھ لنگڑاتے ،گھسٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور عالم یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اور گلے مٹی سے بھرے ،پائوں زخموں سے چور ،بدن بھوک اور پیاس کے ہاتھوں نحیف ونزار ہو چکے ہیں۔ پیشاب' پسینے اور پاخانے کی بدبو قافلے کی ہم سفروہمرکاب ہوتی ہے"۔

یہ ہند و مسلمان اور سکھ عام معصوم کسان تھے ،جن کی زندگیاں کھیتوں کھلیانوں میں کام کرنے کے علاوہ کہیں بھی نہیں گزریں۔ان کی اکثریت کو تو پتہ ہی نہیں تھا کہ وائسرائے کیا ہوتا ہے ،کانگریس کیا ہے اور مسلم لیگ کیا،نہ ہی ان کو یہ سدھ بدھ تھی کہ تقسیم کیوں ہورہی ہے اور سرحدیں کیوں بنائی جارہی ہیں۔انہیں تو اس کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ جس آزادی کے نام پر یہ کھلواڑہورہاہے اس سے انہیں زندگی رزق اور عزت سمیت ہرحق سے محروم کردیاجائے گا۔یہ تو وہ معصوم تھے کہ جب ساون کے بادل برسے بنا گزرتے تھے تو یہ کسان اپنے تھکے ہارے چہرے آسمان کی طرف اٹھااٹھا کراپنے کسی خدا' کسی بھگوان کسی گرونانک کو مخاطب کرتے،اور اس سے برسات کی بھیک مانگتے تھے۔اس انسانی المیے نے اپنے پیچھے بربادیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو

جنم دیا۔لاہور سے امرتسر کے مابین45میل کا راستہ ایک طویل انسانی قبرستان میں تبدیل ہو کے رہ گیا۔

معلوم تاریخ کے آغازسے چلے آتے ہر تنازعے کی طرح سے تقسیم کے اس المیے اوربربادی میں بھی جنسی وحشت اور زنا کے واقعات وباکی طرح پھوٹ پڑے۔سکھوں کے دسویں گرنتھ میں گرو نے اپنے ماننے والوں کو سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے ساتھ جنسی مباشرت نہ کریں تاکہ پنجاب میں جو کچھ ہورہاہے اس سے بچا جا سکے۔سکھوں نے اپنے گرو کے حکم کو صریحاً نظرانداز کردیاانہیں‌جہاں بھی کوئی مسلمان عورت نظرآتی تھی،وہ اس پرٹوٹ پڑتے ۔اسی آبروریزی کے طفیل یہ کہاوت بنا دی گئی کہ مسلمان عورتوں میں جنسی شہوت زیادہ ہوتی ہے۔

تقسیم کے اس خونی عمل کے دوران عام ہندوئوں‘ مسلمانوں اور سکھوں کی حالت زار کی بجائے ،پاکستان اور ہندوستان کے حکمرانوں کی فکر اور توجہ کا مرکز ومحور اثاثوں کی تقسیم تھی۔افواج ،اثاثوں اور دولت کی تقسیم کے موقع پر ان حکمرانوں نے بدترین لالچ اوراوچھے پن کا مظاہرہ کیا۔دونوں ریاستوں نے ہرممکن کو شش کی کہ ویساہی سامراجی طرز حکمرانی ا ختیار کیا جائے جو نسلوں تک ان پر مسلط رہا۔بٹوارہ اس کرہ ارض کی ایک سب سے قدیم اور زندہ تہذیب کے جسم پر لگنے والا ایک کاری زخم تھا،ایک ایسی تہذیب جو فن میں‘تعمیرات میں‘ موسیقی میں‘ لٹریچر میں اور انسانی ثقافت کے دوسرے کئی شعبوں میں اپنی بلندیوں اور مہارت کو پہنچی ہوئی تھی اور جس کی ثقافت کی رنگارنگی اس کا سب سے خوبصورت پہلو تھی۔

تقسیم کا یہ درد ابھی تک کروڑوں انسانوں کی روحوں کو مضطرب کیے ہوئے ہے،یہ ان کیلئے ایک ناسور بن چکاہے۔یہ تقسیم حالیہ انسانی تاریخ کے بڑے ردانقلابی واقعات میں سے ایک واقعہ ہے۔تقسیم کے ساٹھ سالوں بعد بھی سارے برصغیر میں یہی سوال پوچھا جاتاہے کہ کیااس تقسیم کو ختم کیا جا سکتا ہے؟

پنجابی زبان کے معروف شاعر استاد دامن نے اس بٹوارے کے کرب کو کچھ ان الفاظ میں ڈھالا ہے-----

بربادا انہاں آزادیاں توں ہوئے تسی وی او ہوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی صاف پئی دسدی اے روئے تسی وی او روئے اسی وی آں

نوٹس

1۔ مولانا ابو الکلام آزاد، ہندوستان کی آزادی، (انگریزی ایڈیشن، اورئینٹ لانگ مین)، صفحہ202

2۔ 8اگست 1853ء کے ”نیو یارک ڈیلی ٹریبیون “ نمبر 3840 میں شائع ہوا

3۔ کولن اینڈ لیپئیر،فریڈم ایٹ مڈ نائٹ، صفحہ58

4۔ ٹراٹسکی، تصنیفات1939ء ، صفحہ169

5۔ ٹائمز آف نڈیا، 16جنوری 1948ء

6۔ لال خاں، بٹوارہ: کیا یہ ختم ہو سکتا ہے؟(انگریزی)، صفحہ26

7۔ سر جان کمنگ، پولیٹکل انڈیا، (آکسفورڈ)، 1932ء

8۔ پی۔ ہارڈی ، برطانوی ہندوستان کے مسلمان(انگریزی)، (کیمبرج)، 1972ء

9۔ لال خاں، بٹوارہ: کیا یہ ختم ہو سکتا ہے؟(انگریزی)، صفحہ34

10۔ کے۔ داموداران، ہندوستانی کمیونزم کی یادداشتیں(انگریزی)، نیو لیفٹ ریویو نمبر 93، لندن ، 1975ء

11۔ پاکستان اور نیشنل یونٹی، بمبئی ، 1944ء

12۔ نیوز لائن(کراچی)، اکتوبر 2008ء ، صفحہ82

13۔ مزدور مورچہ ، فرید آباد، جولائی 1978ء

14۔ ایضاً، صفحہ12

15۔ لال خاں، بٹوارہ: کیا یہ ختم ہو سکتا ہے؟(انگریزی)، صفحہ57

16۔مولانا ابو الکلام آزاد، ہندوستان کی آزادی، (انگریزی ایڈیشن، اورئینٹ لانگ مین)، صفحہ61

17۔ خشونت سنگھ، ٹرین ٹو پاکستان، صفحہ 50

18۔ کولن اینڈ لیپئیر،فریڈم ایٹ مڈ نائٹ، صفحہ127

19۔ مولانا ابو الکلام آزاد، ہندوستان کی آزادی، (انگریزی ایڈیشن، اورئینٹ لانگ مین)،

صفحہ170

20۔ ایضاً، صفحہ 198

21۔ ایضاً، صفحہ203

22۔ ایضاً، صفحہ201

23۔ صفحہ 209 ,224

24۔ کولن اینڈ لیپئیر،فریڈم ایٹ مڈ نائٹ،صفحہ359,360

بورژوا جمہوریت کی نااہلی ... ایک ناکام آغاز
فوجی اقتدار اور ابھرتا طوفان

"میں کسی اور خطے کے کاروباری لوگوں کے بارے میں تو
نہیں جانتا لیکن اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں کہ ہمارے کاروباری
اور سرمایہ دار انتہائی کمینے ہیں ، انہیں تھوڑا سا بھی موقع مل
جائے تو یہ عوام کا خون تک چوس لینے سے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا
مظاہرہ نہیں کریں گے۔میں پریشان ہوں کہ کب تک ہم اس لٹیرے
نجی شعبے کو عوام سے بچاتے رہیں گے!ایک دن آئے گا جب عوام
اس سے اپنا انتقام لیں گے"

(فیلڈ مارشل ایوب خان) (1)

سرکاری ذرائع ابلاغ کے مطابق پاکستانی ریاست کی نظریاتی اساس فلسفی و شاعر علامہ سر محمد اقبال کی طرف سے دیکھا گیا خواب ہے۔لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ خود اس پراسرار نظریے کا خالق اس بات پر تحفظات رکھتا تھا کہ کیسے اس کے نظریے پر عملدرآمد کیا جاسکتا ہے؟نظریہ پاکستان کا یہ خالق پاکستان کے قیام سے تقریباً دس سال پہلے 1938ء میں فوت ہو گیا تھا۔اپنی موت سے ایک سال قبل اس نے جناح کو ایک خط لکھا اور اس میں اس نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ کس طرح اس کا خواب برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک بھیانک حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ 28مئی 1937ء کو لکھے گئے اپنے اس بصیرت افروز مکتوب میں اقبال نے مسلم لیگ کو درپیش سیاسی مسائل کی طرف توجہ دلائی"جہاں تک مسلم ہندوستان کا تعلق ہے مجھے اس پر کوئی شک نہیں ہے کہ تم اس بارے میں صورتحال کی نزاکت کو بخوبی سمجھتے ہو۔مسلم لیگ کو اس بات کا حتمی طور پر فیصلہ کن تعین کرنا ہوگا کہ یا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اشرافیہ طبقے کی نمائندہ ہے یا عام مسلمانوں کی !شاید اسی وجہ سے یہ عام مسلمان اس میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں اور یہ بات معقول بھی نظر آتی ہے۔ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی اکثریت سے ان کے حالات بہتر کرنے کا وعدہ نہیں کرتی وہ ہمارے عوام کو کسی طور متاثر اور اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی۔نئے آئین کے مطابق اعلیٰ ترین عہدے بالا دست طبقے کی اولادوں کیلئے مختص کر دیے گئے ہیں جبکہ ان سے چھوٹے عہدے وزیروں کے رشتہ داروں یا دوستوں کیلئے مخصوص کر دیے گئے ہیں ۔ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عام مسلمانوں کی عمومی بہتری کیلئے سوچا تک بھی نہیں ۔روٹی کا مسئلہ روز بروز حساس ہوتا چلا جارہا ہے"۔(2)

پاکستان کا پہلا پلاننگ کمیشن 1948ء میں قائم کیا گیا تھا جس کے 15ارکان

میں سے 11امریکہ اور سامراجی اداروں سے تعلق رکھتے تھے۔اس کمیشن کی ساخت ہی سے صاف واضح ہوجاتاہے کہ یہ نوخیز ریاست، سیاسی اور معاشی ترقی کیلئے کیا قدم اٹھانا اور کس طرف جانا چاہ رہی تھی۔بہت سے ”مسلمان “کاروباری اداروں کو ہندوستان میں انتہائی سخت مقابلے کا سامناتھا بلکہ وہ ٹاٹا اور برلا سمیت دیگر بڑے ”ہندو“اداروں کی برتری اور سبقت تلے دبے ہوئے تھے۔ان کے ذہن میں یہ غلط خیال راسخ ہوگیا کہ ایک الگ ”آزاد“ریاست اور منڈی حاصل کر لی جائے تو اس سے ان کیلئے بے پناہ منافعوں کا رستہ ہموارہوجائے گا ۔چنانچہ حبیب ،ولیکا،آدم جی،سہگل اور اصفہانی سمیت دوسرے مسلمان کاروباری گھرانوں نے جناح اور مسلم لیگ پر نچھاور ہونا شروع کردیا،بھاری رقوم اس سلسلے میں پیش کی گئیں تاکہ نئی منڈی اور نئی اسلامی جمہوریہ میں ان کو خاطرخواہ اور مناسب مقام میسر آسکے۔

پاکستان میں نئی ابھرنے والی بورژوازی کوایک سنہرا موقع میسرآگیا کہ وہ اپنی صلاحیت اوراہلیت کو ثابت کرتی۔کیونکہ ایک ریاست ،ایک وسیع منڈی ، بے پناہ قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ اور افرادی قوت کا بے شمار ذخیرہ ان کی دسترس میں آگیاتھا۔

تشخص کا بحران

جناح پاکستان کو ایک جدید صنعتی سیکولر سرمایہ دارانہ ریاست کے طورپر بنانا اور تشکیل دینا چاہتاتھا۔وہ مضبوط نظم و نسق اور مستحکم طریق کار کا خواہشمند تھا۔اس کے ایک قریبی دوست کے مطابق”جناح گلیڈسٹون کے انداز فکر کا حامل پارلیمنٹیرین تھا“۔پاکستان کی افتتاحی تقریب کے وقت وہ خاصانحیف ونزار اور بیمار تھا جو پہلے ہی پچھلے تین سالوں سے اپنے فزیشن کے الفاظ میںاپنی قوت ارادی کو‘ وسکی اور سگریٹوں کے سہارے سے زندہ رکھے ہوئے تھا۔پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کے بعد جناح نے اپنے نئے اے ڈی سی سید احسن سے کہا ”کیا تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی میں ہی پاکستان کو بنتا دیکھ سکوں گا“۔(3) وہ ستمبر1948ء میں پراسرارحالات میں وفات پاگیا۔اپنی ابتدا سے ہی پاکستان ایک اندرونی خلفشار کی زد میں آچکاتھاجو جناح کی موت کے بعد اور بھی شدید ہوگیا۔جاگیردار اشرافیہ اور نیم سرمایہ دار امراء کے مابین اختلافات نے سیاسی انتشار پیدا کردیا۔1951ء میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو کمپنی باغ راولپنڈی میں اکبر خان نے گولی مارکر قتل کر دیا۔

1950ء کی دہائی میں ہونے والے داخلہ اور خارجہ پالیسی سے متعلق فیصلے انہی

تنازعات اور تضادات کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔پاکستان کو ایک مذہبی ریاست کے طورپر قائم کیاگیاتھا ،اس مصنوعی نظریے کو پاکستان کے نئے ابھرنے والے حکمران طبقے نے ایک ایسے سماج پر مسلط کرنے کی کوشش کی جو کثیر نسلی،کثیر زبانی اور کثیر قومیتی تھا۔جناح نے جس سیکولرازم کا وعدہ اور اعلان کیاتھا وہ تیزی کے ساتھ کمزوراورختم کیا جارہاتھا۔تعلیمی نصاب کو مکمل طورپر ریاست کے سرکاری مذہبی نظریے کے مطابق تشکیل دے دیاگیا۔سرکاری نقطہء نظرکورائج کرنے کیلئے تاریخ کے چہرے کو مسخ کردیاگیا۔اردوکو قومی زبان قرار دے کر مسلط کردیاگیا،یہ اور بات ہے کہ ریاستی افسر شاہی ،کامرس ،تجارت اور اشرافیہ نے انگریزی زبان کو ہی اختیار کیے رکھا۔پاکستان کے پہلے دو نوں کمانڈرانچیف انگریز تھے۔اگرچہ مسلم لیگ نے لارڈمائونٹ بیٹن کو پاکستان اور بھارت کے مشترکہ گورنر جنرل کے طور پر قبول کرنے سے انکار کردیاتھا مگر فوج ایک برطانوی کمانڈر کومسلح افواج کے سربراہ کے طورپر قبول کرنے کیلئے دیدہ ود ل فر ش راہ کرنے جار ہی تھی تاکہ نوآبادیاتی ڈھانچوں کو جاری رکھنے کو یقینی بنایا جا سکے۔پاکستان کا پہلا کمانڈرانچیف جنرل میسروی تھا جس کے بعد میجر جنرل ڈگلس گریسی کمانڈرانچیف مقررہوا۔لینڈریونیو سسٹم،ملٹری چین آف کمانڈ،سول انتظامیہ،قانونی ضابطے اورعدالتی نظام یہ سب برطانوی طرز اورمرضی سے تشکیل دیے گئے۔سچ تو یہ ہے کہ برطانوی برصغیرکی اپنی سبھی نوآبادیوں کے ساتھ ان کے آزادہونے کے بعد اور باوجود بھی جڑے ہوئے تھے۔یہاں تک کہ سڑکوں پر اور ریلوے میں ”لیفٹ ہینڈ ڈرائیونگ“پر ابھی تک عمل ہورہاہے۔

پاکستان کے حکمران طبقے نے اپنی پالیسیاں امریکہ کے ساتھ وابستہ کرلیں اوریوں یہ شروع سے ہی اس کی کٹھ پتلی بن گئے۔امریکہ اور اس کی سنٹرل انٹیلی جنس ایجنسی CIAابتدا سے ہی پاک فوج کے معاملات میں شریک ہوگئے۔اس بدنظمی ،انتشاراورپاکستان کے نوزائیدہ بورژوا طبقے کی بدحواسی کی بنیادی وجہ خود اس طبقے کا تاریخی اعتبار سے تاخیرزدہ(B elated)ہوناتھا۔تاریخ میں اس کا ظہور اس وقت ہوا جب سامراج ،عالمی منڈی پر فیصلہ کن غلبہ و تسلط حاصل کرچکاتھا۔دوسری عالمی جنگ کے دوران جب ساری دنیا اس جنگ کی تباہیوں اور بربادیوں سے اتھل پتھل اور تہس نہس ہوچکی تھی،تو یہ صرف امریکہ ہی تھا جس کی سرزمین جنگ کی چیرہ دستیوں سے مکمل طورپر محفوظ رہی۔تاہم اس جنگ کے دوران امریکہ کے اندر ایمرجنسی‘ جنگی حکومت اور قوانین پوری طرح سے نافذ اور سرگرم عمل رہے۔جس کے باعث امریکی حکمران طبقات کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے محنت کش طبقے کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرکے اپنی دولت و طاقت میں اضافہ کر سکیں۔اس کے نتیجے میں امریکی صنعت کو مثالی عروج ملااور وہاں بھاری مقدارمیں قدر زائد کا ارتکاز ہوگیا۔اس بھاری اور

بے تحاشا قدر زائد کی وجہ سے امریکہ کو تحقیق اور تکنیک کے شعبے میں ترقی اور تنوع کیلئے مرضی کی سرمایہ کاری کرنے کی عیاشی میسر آگئی جس سے پیداواری صلاحیت اور منافعوں میں اور بھی اضافہ ہوتا چلاگیا۔یوں امریکی بورژوازی کوتب تک کا سب سے بڑا مالیاتی ارتکاز میسر آگیا۔اس کے اثرات یہ ہوئے کہ بعد از جنگ امریکہ نے ساری دنیا پر ٹیکنالوجی میں برتری،مالیاتی تسلط اور عسکری غلبہ حاصل کر لیا۔یوں اسے عالمی سرمایہ دارانہ معیشت اور عالمی منڈی پر انتہائی موثر کنٹرول میسر آگیا ۔عالمی بینک ،بریٹن وڈ ٹریٹی جو بعد میں آئی ایم ایف،گیٹ GATTجو پھر ورلڈٹریڈ آرگنائزیشن ہوگیا، جیسے ادارے امریکی مالیاتی تسلط کو قائم کرنے کاذریعہ بن گئے۔ادھر سیاسی اور سفارتی سطح پر اقوام متحدہ،ناٹوNATO،سینٹو CENTOاور سیٹوSEATOسمیت دیگر معاہدے ‘ ادارے اور اتحادامریکہ کی سیاسی‘ سفارتی اور عسکری اجارہ داری قائم کرنے کیلئے استعمال میں لائے گئے۔اسی دوران یورپی سامراج جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے مالیاتی طورپر کمزورپڑچکاتھاجس کی وجہ سے وہ براہ راست نوآبادیاتی کنٹرول کو برقرار رکھنے کی اہلیت سے محروم ہوگیا۔یورپی پرولتاریہ کی انقلابی تحریکوں کی ناکامی اوردوسری عالمی جنگ سے بیزار اور تھک ہار کے محاذوں سے واپس آنے والے فوجیوں کے رد عمل نے یورپی سامراج کی کمزوری کو اور بھی نحیف ونزارکردیا۔یورپی سامراج کوبراہ راست نوآبادیاتی حکمرانی سے دستبردار ہونا پڑگیا۔پھر ان ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکوں کے ظہوراور ابھار نے یورپی سامراج کی شکست کو اور بھی تیز کردیا۔

لیکن تیسری دنیا کے نوآبادیاتی انقلابات بھی سرمایہ دارانہ سامراجیت کے اس نئے ڈھانچے کی گرفت سے بچنے کیلئے وقتی نجات ثابت ہوئے۔ان انقلابات کے نتیجے میں پرولتاری بوناپارٹسٹ حکومتیں سامنے آئیں جو اپنی ہی طرز اور اپنے ہی طورطریقوں سے چلنے والی انقلابی تحریکوں کے نتیجے میں قائم ہوئیں۔ یہ حکومتیں پیٹی بورژوا دانشوروں کی قیادت میں گوریلا افواج کے ذریعے یا پھر ان انقلابی فوجی افسران کے زیر اثر فوجی بغاوتوں کے ذریعے قائم ہوئی تھیں۔ جو اپنے اپنے سماجوں میں بدترین سامراجی استحصال اور جبروتشدد سے تنگ آچکے تھے۔ان کے پاس سامراجی استحصال اور لوٹ مار سے محفوظ رہنے کے لئے اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کے عفریت سے جان چھڑانے کے لئے کوئی اور مناسب اور موزوں طریقہ کار موجود نہیں تھا۔

ان چند مستثنیات کے علاوہ باقی سبھی نام نہاد آزادی حاصل کرنے والے ملکوں کی اکثریت سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ حکومتوں کے شکنجے میں پھنس گئی ۔یہ حکومتیں بدعنوان اور خصی حکمران طبقات کے زیرتسلط تھیں جوکہ اپنے سماجوں کوترقی دینے اور ان میں صنعت یافتہ سرمایہ دارانہ ریاست کی تعمیر کیلئے درکار سماجی‘ معاشی اور سیاسی بنیادیں قائم کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم

تھے۔نوآبادیاتی غلامی سے حاصل ہونے والی یہ نام نہاد آزادی اپنے کردار میں معذوراور مفلوج تھی۔اس آزادی سے ابھرنے والے حکمران طبقات کا کردار دلالی' جی حضوری اور سامراجی طاقتوں کی مخلصانہ اطاعت پر مبنی تھا۔دوسری طرف ان نوآبادیاتی حکمرانوں کی وراثتی اور نامیاتی نااہلی کے سبب ان کی ریاستوں کی پہلے سے کمزورمعاشی بنیادیں اور بھی نحیف ہوتی چلی گئیں اور یوں یہ مغربی سامراج کے مالیاتی سرمائے اور ٹیکنالوجی کے رحم وکرم پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوتے چلے گئے۔ان کی اس تاریخی پسماندگی اورجدید ترقی یافتہ ملکوں پرمعاشی، تکنیکی اورمالیاتی انحصارنے ان نااہل حکمرانوں کو بعد از جنگ کے نئے عالمی نظام کی اطاعت پر مجبور کردیا جسے سامراج کی بلا روک ٹوک لوٹ مار کی سہولت اور آسانی کیلئے تشکیل وترتیب دیاگیاتھا۔

برصغیر کی 1947ء کی تقسیم نے اس بات کو یقینی بنادیاکہ سامراجی استحصال اور سرمائے کی حکمرانی ایک نئے نوآبادیاتی نظام کی شکل میں جاری و ساری رہے گی۔جہاں عالمی منڈی کا غلبہ ان سماجوں کو سامراجی استحصال کی غلامی پر مجبور کر دے گا۔پاکستان کا نااہل حکمران طبقہ اس مجبوری کو جلد ہی جان گیا تھا مگر پھر ان کی اپنی بے بسی ان کے آڑے آگئی اور وہ اس طوق کو اپنے گلے سے نہیں اتار سکا۔اس تاریخی کمزوری سے ایک طرف اسے سامراجی غلامی کی بیڑیاں پائوں میں ڈالنی پڑگئیں تو ودسری طرف اسے جاگیردار اورزمیندار اشرافیہ کے پائوں میں اپنا سر رکھنا پڑگیا 'ان میں پیر اور سجادہ نشین بھی شامل تھے ۔یہ دیہی علاقوں میں بڑی بڑی زمینوں کے مالک تھے جوکہ انہیں برطانوی راج نے اپنے اقتدار کو طول اور تقویت دینے کیلئے اور بے لوث غلامی کرنے کے اعزاز میں دان کی تھیں۔نوابوں ،جاگیرداروں ، زمینداروں،پیروں اور گدی نشینوں کا یہ ٹولہ بھی نااہل سرمایہ داروں کی طرح سے ایک الگ مسلمان شناخت کے نام پر مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ ہوچکاتھا۔ملکی سطح پر ہونے والی سیاست کا ہر مسئلہ جاگیردارانہ نقطہء نظر سے دیکھا اور پرکھاجانے لگا۔اپنی زمینوں اور اپنے مزارعین کی وجہ سے حاصل ''کامل خودمختاری'' کے بل بوتے پر جاگیرداروں کا یہ طبقہ جب چاہتا ایک نئی پارٹی بنا لیتا یا کسی پارٹی کے حصے بخرے کردیتا۔جناح ایک بورژواجمہوری ریاست کی تشکیل کے حق میں تھا مگر دوقومی نظریے کے علمبرداروں کی طرف سے مذہب کے واویلے نے اس نئی ریاست کا چہرہ اور رنگ روپ ہی بدل کے رکھ دیا۔

کشمیر

آزادی کے پہلے سال ہی کشمیر میں جنگ پھوٹ پڑی جو کہ برطانوی سامراج کی طرف سے دانستہ چھوڑا گیا ایک تنازعہ تھا۔برطانویوں کا '' تقسیم کرو اور راج کرو ''کی

پالیسی کا مقصودمنتہا بھی یہی تھا۔اور یہ پالیسی وہ اپنی نوآبادیوں سے نکل جانے کے بعد بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔بھارت اور پاکستان کے مابین دشمنی اورعدم استحکام کا زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرنا ان کے سامراجی تسلط کی بڑھوتری کیلئے انتہائی سودمند پالیسی تھی۔مسلم اکثریت کے حامل کشمیر کے ہندو مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کا معاہدہ کرلیا ۔جس پر پاکستانی حکمرانوں نے کشمیر کو بزورطاقت حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ایک خفیہ منصوبہ بنایاگیاجس کے مطابق پختون قبائلیوں کو حملہ کرناتھا۔یہ پختون قبائلی 23/24 اکتوبر 1947ء کی شب دریائے جہلم عبور کر کے کشمیر داخل ہوئے۔منصوبے کے مطابق 26اکتوبر کو اس وقت سرینگر پر قبضہ کرلیناتھا جب ہر طرف عید کا تہوار منایا جارہاہوتا۔ مگر بجائے سرینگر کا رخ کرنے کے انہوں نے خودکومظفرآباد اور ملحقہ علاقوں میں لڑائی جھگڑوں اور لوٹ مار میں مصروف اور ملوث کرلیا۔یہ محض بارہ مولا تک ہی پیش قدمی کرسکے(اگرچہ یہ کشمیری دارالحکومت کی بجلی کاٹنے میں کامیاب ہو چکے تھے)اس کی وجہ سے بھارت کو وہاں بڑی تعداد میں اپنے فوجی اتارنے کا موقع مل گیا تاکہ وہ حملہ آوروں سے نمٹ سکیں۔یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر کی تاریخ ایک انتہائی عجیب و غریب موڑمڑتی ہے۔کشمیرکا تین چوتھائی حصہ بھارت کے اور باقی کا ایک تہائی سب سے دشوار ترین علاقہ پاکستان کے کنٹرول میں آگیا۔بھارتی فوج نے قبائلی پیش قدمی کو روکتے ہوئے اور سرینگر کوقبضے سے بچاتے ہوئے ،نیشنل کانفرنس کے ورکروں کو کشمیر کے دفاع کی ذمہ داری سونپ دی ۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے جوابی حملہ کرتے ہوئے بارہ مولا کو دوبارہ اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ بھارتی فوج کے جموں وکشمیر میں داخل ہو جانے کے بعد گورنر جنرل پاکستان جناح نے کوشش کی کہ پاکستان بھی جوابی کاروائی کرتے ہوئے اپنی فوج کشمیر بھیج دے مگر اس وقت کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی کی طرف سے اس کوشش کو روک دیاگیا۔اسے خوف تھا کہ اس سے دونوں نئی ریاستوں کے مابین جنگ چھڑ جائے گی۔ اس وقت دونوں ملکوں کی افواج ایک ہی سپریم کمانڈ کے زیر کمان تھیں۔جناح نے اس کے باوجود بھی کوشش کی کہ پاکستان کے حمایتی ”آزادکشمیر“کی قوتوں کی مدد کیلئے فوج کو بھیجا جائے۔مثال کے طورپر پاکستان کے باقاعدہ چھٹی پر گئے ہوئے فوجیوں سے درخواست کی گئی کہ وہ ریاست کشمیر جا کر لڑائی میں حصہ لیں۔

مئی 1948ء میں جنرل گریسی اپنے پچھلے فیصلے پر نظرثانی کرتے ہوئے پاکستانی فوج کو ”سرکاری“ طورپر جموں وکشمیر بھیجنے پر رضامندہوگیا۔یوں حملوں اور جوابی حملوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا جس کے نتیجے میں پاکستان نے گلگت (اس علاقے کو سرکاری طورپر 3نومبر1947ء کے دن پاکستان کا حصہ بنایاگیا) بلتستان وادی کا کچھ حصہ،پونچھ کا زیادہ ترحصہ اور جموں کے میرپور پر قبضہ

کرلیا۔جبکہ بھارتی فوج نے لداخ،کشمیراور جموں کے کئی صوبوں اورپونچھ کے کچھ حصے پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ 1948ء کے آخر تک جو جنگ کشمیر تک محدود تھی اس کے بھارت اور پاکستان کے اندر پھیلنے کے امکانات پیدا ہوگئے۔لیکن اس شدت کو جنگ بندی کے ایک معاہدے کی صورت میں روک لیا گیا۔ یہ جنگ بندی اقوام متحدہ کی طرف سے عمل میں لائی گئی اور جس پر یکم جنوری 1949ء سے عملدرآمدہوناتھا۔بعدازاں 27جولائی 1949ء کو ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت دونوں افواج کے نمائندوں کی موجودگی میں سیزفائر لائن کی نشاندہی کر دی گئی۔یہ لائن1965ء کی پاک بھارت جنگ تک قائم رہی۔

جناح

جناح جس واحد ”سیاسی پارٹی“پر اعتماد اور تکیہ کر سکتاتھا وہ پاکستان کی سول انتظامیہ تھی،جس نے انڈین سول سروس سے جنم لیا اورجس کا تخم برطانوی سامراجی انتظامیہ نے بویاتھا ۔جناح پاکستان کو ایک مکمل آئینی سوشل ڈیموکریسی سمجھتا تھا۔ 11اگست 1947ء کوپاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے کراچی میں ہونے والے اجلاس میں اس نے کھلے عام ان تمام تر تعریفوں اور وضاحتوں سے لاتعلقی کا اعلان کیا جو اس نئی ریاست کے کردار کے بارے میں بیان کی جارہی تھیں۔اس نے اپنے خطاب میں کہا”تم آزادہو ،کسی مندر میں جانا ہو یا کسی مسجد میں،پاکستان کی اس ریاست میں رہتے ہوئے تم آزادی سے کہیں بھی اپنی اپنی عبادت کرنے کیلئے جا سکتے ہو۔تمہارا خواہ کسی مذہب‘کسی نسل کسی رنگ سے تعلق ہوریاستی امور کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا۔ہم اس بنیادی اصول پر اپنی بنیاد اور اپنی ریاست کا آغازکررہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اورایک ہی ریاست کے برابر کے حقوق کے حامل شہری۔میں سمجھتاہوں کہ ہمیں آئندہ اس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔اورآپ لوگ دیکھیں گے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے اور ہندو بھی ہندونہیں رہیں گے اور یہ بات میں مذہب کے حوالے سے نہیں کر رہا بلکہ سیاسی حوالے سے کر رہاہوں کہ یہ سب ریاست کے شہری ہی ہوں گے“۔(4)

جناح کی اس تقریر کو مذہبی جماعتوں، متشدد فرقہ پرستوں اور دائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیاہے کیونکہ اس میں ایک اسلامی ریاست کی تخلیق کی مخالفت کی گئی ہے۔یہ تنقید غیرمعقول اوربلاجواز بھی نہیں ہے۔اگر پاکستان ” مسلم قوم“کیلئے کی جانے والی جدوجہد کا ہی نتیجہ تھا تو پھر واضح طورپر سیکولرازم اس کیلئے ایک غیر مناسب اور غیرموزوں نظریہ ہی قرارپاتاہے۔اگر سیکولرازم کے حامل آدرش کوہی پاکستان میں فروغ دینا اور اس پر عملدرآمدکرنا مقصود تھا تو یہ

کام ایک متحدہ برصغیر میں بھی بخیرو خوبی سرانجام دیا جاسکتاتھا۔جناح پر آئین پرستی کا بھوت سوار تھا جس نے اس نئی ریاست کی تشکیل کیلئے چلائی جانے والی مہم کے کردار کو مبہم کر کے رکھ دیا۔بٹوارے کے فوری بعد ہی جناح نے مسلم لیگ کو ایک سیکولر جماعت بنانے کیلئے سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیاتھا اور وہ یہ طے کرچکاتھا کہ اس کا نام مسلم لیگ سے تبدیل کرکے پاکستان نیشنل لیگ رکھ دیاجائے۔مگر پاکستان ٹائمز نے اس کے ارادے کو قبل از وقت افشاکردیا۔جناح کی فوری موت اور پھر لیاقت علی خان کے اچانک قتل کے بعد معاملات کی ساری کمان سول سروسز نے سنبھال لی۔

پاکستان کی معاشی صورتحال بہتر نہیں تھی۔اس نئی ریاست کی معیشت پر زرعی شعبے کی برتری کا اندازہ اس حقیقت سے لگایاجاسکتاہے کہ زراعت کا مجموعی پیداوار میں حصہ **60%**جبکہ روزگارکے شعبے میں اس کا حصہ **70%**تھا۔اس کے مقابلے میں کل پیداوار میں صنعت کا حصہ **6%**جبکہ روزگارمیں **10%**تھا۔باقی حصہ خدمات کے شعبے کاتھا۔بڑے پیمانے پر پیداوارکا وجودہی نہیں تھا۔ دستیاب صنعتی اداروں کا **41%**زرعی خام مال کی تیاری سے وابستہ تھا اوراس لیے یہ موسم کے مطابق ہی کام کرتا تھا۔ پاکستان کو زرعی خام مال پیدااورتیارکرنے والاملک سمجھا جاتاتھا جو سیاسی اور معاشی رابطوں کے ایک نیٹ ورك کے ذریعے برطانیہ سے جڑاہواتھا۔

1954ء کے انتخابات

پاکستان کے دیہات اور مضافات کی کیفیت تو اوربھی بدترین تھی۔پاکستان میں مجموعی طورپر **6000**جاگیردار**35**لاکھ کسانوں کی مجموعی ملکیت سے زیادہ زمین کے مالک تھے۔جاگیردارہی مسلم لیگ کی ورکنگ کونسل کے اندر سب سے بڑاگروپ رکھتے تھے۔کوششیں کی گئیں کہ ایک متفقہ و متحدہ حکمران طبقہ تشکیل پاجائے،ایک مستحکم حکومتی پارٹی بنالی جائے،اور ایک مستقل آئین ترتیب دیاجائے۔لیکن یہ سبھی کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔آنے والی دہائیوں میں ”شناخت اور تشخص کا وہ بحران“ پوری شدت کے ساتھ کھل کر سامنے آگیا جس نے اس نئی ریاست کے نظریہ سازوں کو روز اول سے ہی حواس باختہ کیاہواتھا۔

کوریاکی جنگ کے دوران پاکستان نے اپنے روپے کی قیمت کم کرنے سے انکار کردیاجس کی وجہ سے اس کی معیشت کو ایک عارضی عروج میسرآیا۔مگر جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی زرعی خام مال کی قیمتیں بھی تیزی کے ساتھ گرگئیں۔گراوٹ کی اس کیفیت میں **1952/53**ء میں پیداہونے والی غذائی قلت اور قحط نے جلتی پر تیل کا کام کردیا

اور مسلم لیگ غذائی اجناس کے ذخیرہ اندوزوں سے نمٹنے اور معاشی بحران پر قابو پانے میں مکمل طورپر ناکام رہی جس سے اس کی نااہلی کھل کرسامنے آگئی۔پاکستان میں سیاسی امور و رموز تشکیل دینے میں نمایاں کردار برطانوی راج کی تیارکردہ اور پروردہ پنجابی سول افسرشاہی اور بیوروکریسی کے ان لوگوں کا تھاجو بٹوارے کے بعد وسطی اور شمالی بھارت سے ہجرت کرکے آئے تھے اور جنہیں اردو بولنے والے یا مہاجر کہا جاتا ہے۔مسلم لیگ ریاستی افسرشاہی کی پیداکردہ تھی جس کی تنہائی اور بے بسی 1954ء میں ہونے والے صوبائی انتخابات کے موقع پر کھل کر سامنے آگئی۔یہ الیکشن ایک ایسے ماحول میں ہونے جارہے تھے جس سے پہلے زبان کے پیچیدہ مسئلے پر بڑی تعدادمیں عوامی مظاہرے پھٹ پڑے تھے۔ 21 فروری 1952ء کو پولیس نے طالب علموں کے ایک بڑے مظاہرے کو منتشر کرنے کیلئے گولی چلا دی جس سے 26ہلاک اور 400زخمی ہوگئے۔انتخابات کیلئے اعلان کردہ تاریخ جوں جوں نزدیک آتی جارہی تھی،افسرشاہی کا خوف اور تذبذب بڑھتا چلاجارہاتھا۔ بائیں بازو کو چپ کرانے کیلئے الیکشن پندرہ دنوں تک کیلئے ملتوی کردیے گئے۔48گھنٹوں کے اندر اندر1200کمیونسٹوں اور ٹریڈیونینسٹوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ آخرکار جب 8مارچ سے 12مارچ تک کے دوران ووٹنگ کی اجازت دے دی گئی تو بنگالیوں نے ثابت کردیا کہ مسلم لیگ مرکزی سیاسی دھارے کے شعور سے کتنی دوراور تنہا تھی۔صوبے کی کل 309نشستوں میں سے مسلم لیگ کو صرف 10میں کامیابی مل سکی تھی۔کمیونسٹ پارٹی نے دس نشستوں پر الیکشن لڑاجس میں سے وہ چارپر کامیاب ہوئی۔یہاں یہ امر توجہ اور دلچسپی کا حامل ہے کہ کامیاب ہونے والے کمیونسٹ ہندو تھے جبکہ مسلمان کامریڈز اپنی نشستیں ہارگئے تھے۔یہ واقعہ 1947ء کے بٹوارے کے شرمناک کردار کو صاف عیاں کررہاتھا۔

الیکشن کے صرف دوماہ بعد ہی مرکزی حکومت نے نو منتخب اسمبلی کو تحلیل کردیااورآئین کی شق 92Aکے تحت وہاں گورنرراج نافذکردیا۔کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کردی گئی اور مالکان کیلئے حکم جاری کردیا گیا کہ کسی کمیونسٹ مزدور کو کام پر نہ رکھا جائے ورنہ انتظامیہ ان کے ساتھ سختی سے نمٹے گی۔ایک طرف بائیں بازو کو کچلنے اور اس کی سرگرمیاں روکنے کیلئے جبروتشدد کیا جارہاتھا تو دوسری طرف دائیں بازو کے ”یونائیٹڈفرنٹ“کو مراعات سے نواز اجارہاتھا۔مغربی پاکستان میں ضمنی الیکشنوں میں مسلم لیگ پے درپے شکستوں سے دوچارہورہی تھی جس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اگر آزاد انتخابات کرائے گئے تو مسلم لیگ تینوں صوبوں میں ہار جائے گی۔

افسر شاہی دہشت زدہ ہوکر حواس باختہ ہوتی جارہی تھی۔معاملات کو سیدھا کرنے اور ان پر قابو پانے کیلئے ”ون یونٹ“کا منصوبہ تیار کرلیا گیا۔اس کی ابتدامیں ہی ، مسلم لیگ میں دھڑے بندی ہوگئی۔گورنر جنرل غلام محمدایک بدتمیر و بدزبان بیوروکریٹ تھا جس کا امریکہ میں ڈولس برادرز کے ساتھ انتہائی قریبی تعلق تھا۔جبکہ وزیراعظم محمد علی بوگرہ خود بھی امریکی وزیرخارجہ جان فوسٹر ڈولس کا چہیتا اورمنظورنظرتھا۔غلام محمد نے وزیراعظم بوگرہ کے ساتھ کمانڈر انچیف جنر ل ایوب خان کو امریکہ روانہ کیاتاکہ اس کے ساتھ مذاکرات کے ذریعے طویل المدتی عسکری اور معاشی معاہدے کیے جائیں اور ملک کو چلانے کے لئے حکومت کو سنبھالا دیا جائے۔کراچی واپسی پر یہ دونوں سیدھا گورنر جنرل ہائوس گئے۔جہاں یہ فیصلہ کیاگیا کہ آئین ساز اسمبلی تحلیل کرکے پاکستان میں ہنگامی حالت کا نفاذ کر دیا جائے۔ یہ ایمرجنسی ان بے شمار ایمرجنسیوں کا نقطہء آغازتھی جو بعد میں پے در پے ملک میں نافذہوتی رہیں۔ مرکزی حکومت نے زبردستی ون یونٹ منصوبہ مسلط کردیااورصوبائی اسمبلیوں پردبائوڈالا گیاکہ وہ اسے منظور کرلیں۔ 14اکتوبر1955ء کو ایک نیا صوبہ ”مغربی پاکستان“قائم کردیاگیا۔جبکہ 23مارچ 1956ء کو پاکستان کو ”اسلامی جمہوریہ“ قرارد ے دیاگیا۔

پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے روس کے دورے کی دعوت مسترد کردی تھی جبکہ اس کی بجائے اس نے امریکہ جانے کافیصلہ کرلیا۔بعدازاں اس کے پیشروحکمرانوں نے اس گٹھ جوڑکو مزیدمضبوط کیا۔غلام محمد اور سکندر مرزا جو بیوروکریٹ تھے ،دونوں نے 1950ء کی دہائی میں ملک کو چلایا اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا امریکہ کے ساتھ اتحاد قائم و مستحکم ہوجائے تاکہ وہ ملک میں اپنی پوزیشن کو بہتر وموثر کرسکیں۔جبکہ پہلی امریکی امداد 1951ء میں ہی پاکستان پہنچادی گئی تھی۔جان فوسٹر ڈولس نے پاکستان کوایشیامیں آزادی کا نگہبان قراردیا۔یہ تصور کہ امداد کسی شرط یا پابندی کے بغیر ملاکرتی ہے انتہائی بیہودہ اور فاسق ہے۔خود امریکی سرکاری دستاویز اس پر اپنی پالیسی کو واضح کرتی ہے؛

”تکنیکی معاونت کوئی ایسی شے نہیں ہواکرتی جو ایک حکومتی ادارے کے طور پرہم ایک دوسرے کو لیتے یا دیتے ہوں۔امریکی حکومت کسی طور کوئی خیراتی ادارہ نہیں ہے۔نہ ہی یہ امریکی عوام کے سخی مزاج ہونے کا کوئی اظہار یا وسیلہ ہے۔اس کارخیر کیلئے فلاحی‘ خیراتی اور مذہبی ادارے مناسب آلہ ہوتے ہیں اور ایسے کئی دنیابھر میں کا

م کربھی رہے ہیں۔تکنیکی معاونت امریکہ کے ان متعدداوزاروں میں سے ایک ہے جس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنی خارجہ پالیسی بلکہ دنیابھر میں امریکی مفادات کی تعمیروتشکیل کیا کرتے ہیں۔ہماری یہ معاونت دفاعی معاہدوں، سمندر پار انفارمیشن پروگراموں،اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں میں شرکت،افراد کے تبادلوں کے منصوبوں،ٹیرف اورتجارتی پالیسیاں،زائدزرعی اجناس کو ٹھکانے لگانے کی پالیسیوں اور روایتی سفارتی نمائندگی کے طریق کار سے متعلق ہوتی ہے“۔(5)بھارت اور افغانستان کی جانب سے مغربی بلاک کا حصہ بننے سے انکار نے پاکستان کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔پاکستان کی فوج اور افسر شاہی پاکستان کوامریکی اڈہ بنانے پر راضی ہوگئی۔جنم دن سے ہی پاکستان کی تعمیر میں خرابی کی اك صورت مضمرتھی۔جس نے اسے تحفظ و عدم تحفظ کے دوہرے احساس میں مبتلا کیاہواتھا۔اسی احساس کے کرب نے شروع ہی سے اس کی سبھی پالیسیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔معیشت سمیت اس کی سب پالیسیاں ریاست کے تحفظ کے اسی احساس کے گرد ہی تشکیل اور ترتیب دی جاتی رہی ہیں۔

آزادی کے بعدہونے والے خونریز واقعات کے بعد پاکستان کا حکمران طبقہ بھارت کو ایک ایسا درندہ سمجھ کر خوفزدہ ہو چکاتھا کہ جو اپنے چھوٹے ہمسایوں کو کھاجانے پر تلاہواتھا۔اس کچھ سچے اور کچھ تصوراتی خوف نے پاکستان کے حکمرانوں کو آزادی کے فوری بعد ہی اپنی گرفت میں لے لیاتھا۔اپنے سے بڑے ،زیادہ طاقتور اور زیادہ مضبوط بھارت سے محفوظ رہنے کیلئے ،اور پھر اپنی اندرونی کمزوری اور کھوکھلے پن سے سہمے اور سب سے بڑھ کراپنے محروم عوام سے خوفزدگی نے ان حکمرانوں کو ایک ایسی نفسیات میں مبتلا کردیا کہ ریاست کو زیادہ سے زیادہ مسلح کیا جانا ہی ہمارے بچنے کا مناسب و معقول رستہ ہے۔

”بھارت سے محفوظ رہنے کیلئے ،پاکستان کی خواہش ہوگی کہ وہ ضرورت پڑنے پر امریکہ کا دامن پکڑلے گا۔لیکن ہم کبھی بھی قبول نہیں کر سکتے کہ ہم بھارت کا دامن تھام لیں اور خود کو ننگ وطن کرلیں“۔(6)اگرچہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے مذکورہ بالاشرمناك اور بیہودہ بات3جنوری1966ء کوامریکی سفیر کے سامنے کہی تھی،تاہم بھارت کی برتری کے اس خوف وہراس نے پاکستان کو شروع دن سے ہی امریکہ کی جھولی میں ڈال دیاتھا۔پاکستان اپنے وفاقی بجٹ کا کم از کم 25%شروع سے ہی دفاعی اخراجات پر خرچ کرتا چلاآرہاہے،مگر اس سے کہیں بڑی رقم خفیہ طورپر بھی دفاع پر خرچ کی جاتی رہی ہے۔یہ اعداد وشمار سامنے آئیں تو انسان کی عقل چکرا کر رہ جاتی ہے۔اس کے باوجود بھی پاکستان اب تک لڑی جانے والی ایک بھی جنگ میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا،اس کارگاہ شکست میں یہ 1948ء میں نصف کشمیر سے ہاتھ دھوبیٹھا، 1971ء میں

یہ اپنا ہی نصف مشرقی پاکستان ہار گیا، 1980ء کی دہائی کے اوائل میں سیاچن گنوا دیا گیا جبکہ کارگل کی حقیقی کہانی پر سے ابھی پردہ اٹھنا باقی ہے۔

آزادی کے وقت 95000 نفوس پر مشتمل فوج پاکستان کے حصے میں آئی تھی۔پاکستان نے فیصلہ کیا کہ اس کی تعداد میں فوری اضافہ کرتے ہوئے اسے 150,000 کر دیا جائے۔اس مقصد کیلئے محمد علی جناح' لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین نے اپنے اپنے دور حکومت میں امریکہ سے دوار ب ڈالر کے فنڈز حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر امریکہ انکار کرتا رہا۔پاکستان کا سب سے پہلا بجٹ 28 فروری 1948ء کو پیش کیا گیا جس کا 85% حصہ حیران کن حد تک دفاعی اخراجات کیلئے مختص کیا گیا۔صرف 1953/54ء کو چھوڑ کر اگلے دس سالوں تک یہی حصہ مختص رکھا گیا۔ ایوب حکومت کے پہلے بجٹ میں ترقی کیلئے رقم دوگنی کردی گئی اور اسے دفاعی بجٹ کے برابر لایا گیا(دفاعی بجٹ کو ابتدائی سالوں سے ہی ا مریکہ کی عسکری معاونت کے مطابق ترتیب و تشکیل دیا جاتا رہا تھا)ترقی کا یہ تخمینہ بھی امریکی معاشی معاونت کے تحت ہی مرتب ہوا تھا۔

1952ء میں پاکستان کو غذائی قلت کے شدید بحران نے آلیا۔پاکستان نے امداد اور معاونت کیلئے امریکہ سے درخواست کی ۔مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان کو ایکسپورٹ امپورٹ بینک آف امریکہ(USEXIM) کی جانب سے 15 ملین ڈالروں پر مبنی ایک کمرشل قرضے کے ذریعے دس لاکھ ٹن گندم فراہم کی گئی۔

19 مئی 1954ء کو پاکستان اور امریکہ کے مابین ''باہمی دفاعی معاہدے ''پر دستخط ہو گئے۔ جبکہ 8 ستمبر 1954ء کو پاکستان سیٹو (South East Asia Treaty Organistaion) SEATO کا ممبر بن گیا ۔ایوب خان نے اس موقع پر کہا کہ ''آسمان ہماری حد ہے ''۔لیکن سیٹو نے کبھی بھی پاکستان کو نہ تو امریکی امداد سے مستفید ہونے دیا اور نہ ہی پاکستان پر حملوں کے وقت اس کا کوئی ساتھ دیا۔پاکستان نے 1959ء میں بڈابیر کے مقام پر امریکہ کو اڈہ بنانے کی جو سہولت فراہم کی تھی اس نے بھی پاکستان کے دفاع کو مستحکم کرنے میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ اس کیلئے خطرات میں اضافہ کردیا۔ اس اڈے سے 1962ء میں،امریکی U-2s طیارے پرواز کر کے روسی فضائی حدود میں داخل ہوگئے تھے جن میں سے ایک کو روسیوں نے مار گرایا تھا اور پھر پاکستان کو دھمکی دی تھی کہ دوبارہ اس اڈے سے کوئی پرواز اس کی حدود میں آئی تو وہ پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹا دے گا۔

11 جولائی 1952ء کو پاکستان ورلڈ بینک میں شامل ہوگیا۔اس سے اگلے سال بینک کے ایک وفد نے پاکستان کا دورہ کیا اور آبپاشی،ریلوے کی بحالی، مواصلات میں بڑھوتری اور ہائیڈرو پروجیکٹس منصوبوں کیلئے 6 کروڑ ڈالر کی پیشکش کی۔پاکستان نے

اپنی تاریخ کا پہلا قرضہ 22 جولائی 1952ء کوپاکستان ریلوے کیلئے ورلڈبینک سے حاصل کیاجو دو کروڑ ستر لاکھ ڈالر تھا۔

1967ء میں جب امریکہ نے پاکستان کی امداد بند کر دی تو ایوب خان نے عالمی بینک سے رابطہ کیا اور پہلی بار پاکستان نے اپنے قرضوں کیلئے ریلیف مانگا۔مگر دو سال تک کنسورشیم نے اس پر غور کیلئے اپنی میٹنگ ہی نہیں بلائی۔جس پر جنرل یحیٰی خان کو مجبورہوکر 25مارچ1969ء کو قرضوں کی دوبارہ ادائیگی پر پابندی لگادینی پڑی۔

امریکی معاشی اور عسکری امداد نے پاکستان کی سیاسی اور سماجی قوتوں کے اندرونی تعلقات کو بھی بدل کے رکھ دیااوران کا جھکائو رجعتی اور قدامت پرست پارٹیوں اور اداروں کی طرف کردیا۔اور امریکہ کو اس کیفیت کا بخوبی ادراك بھی ہے ،اس نے اس کااظہار بھی کیاہے”سیاسی نقطہء نظر سے دیکھا جائے تو امریکی عسکری امداد نے پاکستان کی مسلح افواج کو مضبوط کیاہے۔اس وقت ملک میںیہی ایک واحد منظم اور مستحکم ادارہ ہے اوراس وجہ سے پاکستان کواجتماعی دفاعی معاہدوںمیں شرکت کاحوصلہ اور موقع بھی ملا ہے۔(7)

صورتحال اس وقت انتہا پر پہنچ گئی جب پاکستان نے اکتوبر1956ء میںمصر پر برطانیہ،فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کی حمایت کا اعلان کردیا۔وہاں برطانیہ کے حمایتی بادشاہ فاروق کے تخت کے اکھاڑے جانے کے بعد وہاں جمال عبدالناصر کی حکومت کے قیام نے مشرق وسطیٰ کی سیاست کا رخ بدل کے رکھ دیاتھا۔عرب قوم پرستی اپنے عروج کو پہنچ گئی ۔ناصر نے 26جولائی1956ء کو مغرب کی طرف سے اسوان ڈیم کی تعمیر کیلئے درکار فنڈزنے دینے کے رد عمل میں نہر سویز کو قومی تحویل میں لیا۔ا س موقع پرناصر نے کہاکہ سامراج کو اپنے غصے کی آگ میںجھلسنا پڑسکتاہے۔ناصر کی برطانیہ کے خلاف مزاحمت نے سبھی سابق نوآبادیوں کے عوام کی اکثریت کے دل ودماغ کو اس کیلئے ہمدردی اور ہم آہنگی کے جذبات سے بھر دیا۔

مغربی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی

1957ء کے اوائل میں بھاشانی نے مغربی پاکستان کا دورہ کیا جہاں اس نے بائیں بازو کے رہنمائوں سے ملاقاتیں کیں اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سبھی ترقی پسند تنظیموں کی ایک آل پاکستان کانفرنس منعقد کی جائے گی۔یہ کانفرنس 25/26جولائی 1957ء کوڈھاکہ میں ہوئی۔اس کے نتیجے میں نیشنل عوامی پارٹی کا قیام عمل میں لایاگیا۔سماجی ساخت کے حوالے سے اس میں ہر صوبے کی نمائندگی موجود تھی مگر یہ ملک بھرکے سبھی

کمیونسٹ اور نان کمیونسٹ بائیں بازو کے گروپوں کاایک "یونائٹڈفرنٹ "تھا ۔اس کے طے کردہ مقاصد اور عزائم میں انقلابی قوم پرستی اور سوشل ڈیموکریسی کا اتصال تھا۔بنیادی طورپر اپنی ہئیت اور پروگرام کے حوالے سے یہ سٹالنزم کے مختلف عوامل کا مجموعہ تھا۔برصغیر کے بٹوارے نے بائیں بازو کی طاقتوں کو شدید بے سروسامانی کی کیفیت میں مبتلا کردیا تھا۔خاص طور پر مغربی پاکستان میں تو اس کے شدید اثرات مرتب ہوئے ۔جہاں کمیونسٹ تحریک کبھی عوامی بنیادیں حاصل نہیں کر پائی۔ یہاں کے کمیونسٹ محض ایک محدود نوعیت کا کسان احتجاج ہی منظم کر پائے تھے۔ لائل پور جوکہ اب فیصل آباد ہے ،منٹگمری جسے بعد میں ساہیوال بنادیاگیا،ملتان' خانیوال اور کچھ دیگر ضلعوں میں کسانوں کی تحریکیں اور کسانوں' زمینداروں کے مابین جھڑپیں سامنے آئی تھیں۔پنجاب کے حکمران اور یونینسٹ لیڈر سر سکندر حیات نے تشدداور مراعات دونوں طریقے استعمال کرکے اس احتجاج پر قابو پالیاتھا۔کمیونسٹ پارٹی آ ف پاکستان CPPکے قیام کا فیصلہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے 1948ء میں کیااور اس کیلئے وہاں سے کچھ مسلمان کمیونسٹوں کو پاکستان بھیجا تاکہ وہ نئی تنظیم کی مددومعانت کر سکیں۔سجادظہیر سی پی پی کے پہلے جنرل سیکرٹری تھا جس کا تعلق بھارت کے صوبے یوپی سے تھا۔اس کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا اور وہ اردو ادب میں ایک معروف تنقید نگاربھی تھا۔تاہم اس کی تنظیمی صلاحیتیں اس کی ادبی قابلیت سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔طارق علی کے الفاظ میں "مغربی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی ممبر شپ دوسوسے کم تھی۔صرف مستعد کیڈروں کی موجودگی سے ہی کوئی پارٹی موثر ٹریڈیونین نیٹ ورک کو تشکیل دے سکتی تھی"۔(8)مگر کیڈروں کی استعداداور صلاحیتوں سے مناسب طورپر استفادہ نہیں کیا گیا ۔پارٹی نے شارٹ کٹ استعمال کرنا شروع کردیے۔اور پھرسٹالنسٹ مرحلہ واریت کا غلط نظریہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی جو اس کی ترقی وپھیلائو کے آڑے آئی۔

1951ء میں پنڈی سازش کیس نے سارے ملک کو چونکا کے رکھ دیا۔چیف آف آرمی سٹاف میجر جنرل اکبرخان اس کا ماسٹرمائنڈ تھا جو ایک ترقی پسند اور بہادر افسر کے طورپر مشہور تھا۔اس کے ساتھیوں میں انقلابی قوم پرست،انتہائی متعصب اور مذہبی جنونی قسم کے افسر بھی شامل تھے۔نوزائیدہ کمیونسٹ پارٹی اس معاملے میں یوں ملوث ہوگئی کہ سجادظہیرکی جنرل اکبر سے ایک کاک ٹیل پارٹی میں ملاقات ہوئی۔ جس میں جنرل اکبر نے مجوزہ بغاوت کے بارے میں گفتگو کی اور اس کیلئے اغراض ومقاصد اور ہٹ لسٹ کی تیاری میں مدد مانگی۔کمیونسٹ پارٹی نے اس منصوبے کی منظوری دی اور اس سلسلے میں ہونے والی کئی میٹنگوں میں شرکت بھی کی گئی۔لیکن فوج سے شریک ایک افسراس دوران خوف کا شکارہوچکاتھا اور اس نے مخبری کر دی جس سے سارا راز افشا

ہوگیا۔سبھی سازشیوں کو دھرلیاگیا۔کمانڈر انچیف ایوب خان حیران رہ گیا کہ اسے گولی سے اڑا دینے کا منصوبہ تیار ہوچکاتھا۔ اس منصوبے کی کمزوری اور ناپختگی اسی سے ظاہرہوگئی کہ سازشیوں کو انتہائی کم سزا سنائی گئی۔سجادظہیر تورہاہوتے ہی واپس بھارت چلاگیا۔کمیونسٹ پارٹی نے پابندی لگنے کے بعد خودکو عملی طورپرتحلیل کرنے کا اعلان کردیا۔اس کے کئی کیڈروں نے آزادپاکستان پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔اس دھچکے نے پارٹی کے رہے سہے عناصرکواتھاہ مایوسی میں دھکیل دیااور اس کے بعد سے پارٹی کبھی بھی ایک ملکی سطح کی آزاد قوت کے طورپر نہیں ابھر سکی۔اس کے بعد اس کی سیاست وقتاًفوقتاًمختلف النوع اورمختلف طبقات کے عناصر کے ساتھ وابستہ و منسلک ہوتی رہی۔

1958ء

1958ء کے بجٹ میں دفاعی بجٹ میں اضافہ جبکہ قیمتوں میں توازن کے اقدامات کو ختم کر دیا گیا۔جس کی وجہ سے شہریوں کیلئے زندہ رہنے کیلئے درکار لوازمات کی قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیاجوکہ اوسطاً **8.2**فیصدتھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں اور دیہاتوں میں احتجاج شروع ہوگیا۔ہڑتالیں ایک عمومی بات ہوکے رہ گئیں جنہیں ریاست اور مالکان کے پالتو غنڈے بے رحمی سے کچل رہے تھے۔مغربی پاکستان کے دارلحکومت لاہور میں لاکھوں کسانوں نے مارچ کیا جس میں انہوں نے یہ مطالبات پیش کیے۔

1-مزارعوں کی بے دخلی کا خاتمہ۔

2-جاگیرداری نظام کو ختم کیاجائے۔

3-غیر کاشتہ زمین بے زمین کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

کئی دیگر واقعات میں سے ایک واقعہ صوبہ سندھ کے اندرون میں واقع ایک قصبے 'لنڈو میں پیش آیاجہاں ہاریوں (غریب کسانوں) کی فصلوں پر قبضہ کرکے ان کے گھروں کو مسمار کردیاگیا، خواتین کے ساتھ زیادتی کی گئی اور کئی ہاریوں کو گرفتار کرلیاگیا۔یہ سب مقامی جاگیرداروں کی بھرپور معاونت اور منشا سے کیاگیا''۔(**9**) **20**جون**1958**ء کو لائل پور میں مزدوروں نے ایک یونین لیڈرکی گرفتاری کے خلاف ایک ہڑتالی کارخانے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جس پر پولیس نے اندھادھند فائرنگ کر دی جس سے چھ مزدورہلاک اوراکیس شدید زخمی ہوگئے۔

ملک کے سب سے پہلے عام انتخابات مارچ **1959**ء میں ہونے تھے۔افسرشاہی انتہائی خوفزدہ تھی اور اس کی کئی درست وجوہات بھی تھیں۔ اس بات کے قوی امکانات

تھے کہ بائیں بازو کی جماعتیں قومی و صوبائی اسمبلی کی کئی نشستوں پر کامیابی حاصل کرلیں گی۔اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر ان الیکشن کو ملتوی یا موخر کیاجاتاہے تو ایک عوامی غم وغصہ پھٹ پڑے گا اور پھر انتخابات کے امکانات بھی معدوم ہوجائیں گے۔

فوجی راج

دس سالوں کے دوران افسرشاہی ایک مستحکم وموثربورژواسیاسی پارٹی تعمیر کرنے میں ناکام رہی۔ 7اکتوبر1958ء کو پاکستان کے قیام کو جب گیارہ سال گزر چکے تھے،اور اس کے سیاسی ڈھانچے شکست و ریخت کی زدمیں تھے،پاکستان کی فوج نے اقتدارپر قبضہ کرکے سیاست کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔یہ نئی حکومت سول و فوجی افسرشاہی کا ملغوبہ آمریت تھی۔ایوب خان کے الفاظ میں‌ایک ایسی ریاست جو نوآبادی رہ چکی ہواس میں ”جمہوریت کسی طور سنجیدگی و تحمل سے نہیں پنپ سکتی اس کیلئے تو ویسا ہی ٹھنڈا مزاج اور ماحول درکارہوتاہے جیسا برطانیہ کے اندر ہے“۔(10) ان الفاظ کو امریکی پالیسی سازوں اور ان کے نمائندوں‌نے نہ صرف سنجیدگی سے لیا بلکہ اسے دنیابھر میں آزمایابھی گیا۔دونوں ادارے، فوج اور سول افسرشاہی ،نوآبادیاتی ریاست کی براہ راست پیداوار اور باقیات تھے۔اور ان اداروں کی طرف سے نوآبادیاتی حکمرانی کو برقرار رکھنے کی اہمیت سے کسی طورصرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ پنجاب اور پختونخواہ کے پسماندہ ودرماندہ علاقوں سے نئی فوج کیلئے بڑے پیمانے پر بھرتی کی جارہی تھی۔

یہ ایک سادہ حقیقت ہے کہ آزادی کی پہلی دہائی کے دوران ہی یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ ریاست و مملکت پاکستان بہر طور ایک جدیدصنعتی اور ترقی یافتہ سرمایہ دارملک بننے کی اہلیت سے محروم ہے۔ برصغیر کے بٹوارے کے المیے کو نظرانداز کرنے والے بائیں بازو کے سیاستدانوں کی خوش فہمی کہ نئی ریاست کا بانجھ حکمران طبقہ ایک جمہوری سیٹ اپ قائم کرے گا،قومیتوں کو برابری کے حقوق دے گا،شفاف الیکشن کرائے گااور خودمختاری سمیت سبھی جمہوری تقاضے پورے کرے گا،یہ ایک طرف ان کا سب سے بہترین یوٹوپیائی خواب تھا تودوسری طرف انقلابی مارکسزم کے ساتھ بدترین غداری بھی تھی۔روایتی مسلمان بورژوازی در حقیقت امید اور مایوسی کے درمیان لٹک رہی تھی۔

سیاسی اتھل پتھل،ریاست کا بحران،اور سامرجی غلبے کی اطاعت بنیادی طورپر آزادی سے ہمکنار ہونے والے ایک نوآبادیاتی ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی ناکامی کی عکاس تھی جو کہ اب ایک وحشی سامراج کے جنون کے جال میں بری طرح

پھنس چکاتھا ۔لیکن سب سے بڑھ کر یہ نئی ریاست پہلے سے ہی بیچ سے کٹی ہوئی تھی اور اس کی دو قومیتیں بٹوارے کی قینچی سے ہی کٹ چکی تھیں،یہ کٹائو صرف جغرافیائی ہی نہیں تھا بلکہ تاریخی‘ معاشی اورثقافتی تھا۔کٹائو اور چیرپھاڑ کے اس زخم کو مندمل کرنے کیلئے ایک اعلیٰ پیمانے کی سماجی ‘معاشی ترقی اور نشوونما کی ضرورت تھی جس کو پاکستان کا حکمران طبقہ شروع کرنے سے ہی قاصررہا۔آپس میں دست وگریبان رہنے والی سیاسی حکمران اشرافیہ نے ایسی انتشارزدہ کیفیت پیدا کر دی کہ جس سے پاکستانی سرمایہ داروں اورسامراج کے مفادات کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ بحران زدہ پاکستانی سرمایہ دارانہ نظام کی حفاظت کیلئے براہ راست فوجی حکمرانی کو اختیار کیا جائے۔ اس بات نے پاکستان کے حکمران طبقے کے رجعتی کردارکو بھی عیاں کردیاحالانکہ ابھی اس کی حکمرانی شروع ہوئے کچھ ہی سال ہوئے تھے۔

ریاست کی تشکیل کیلئے مذہب کا استعمال اپنے اندر ایک بہیمانہ حکمت عملی تو تھی ہی لیکن مارشل لاء مسلط کرنے سے اس ریاست اور اس کے حکمران طبقات کا تاریخی ،معاشی اور نظریاتی دیوالیہ پن کھل کر سامنے آگیا۔لیکن پھر جیساکہ واقعات کا تسلسل ثابت کرتاہے کہ فوجی آمریتوں کا یہ تجربہ بھی اپنے جبروتشددکے باوجود، پاکستانی سرمایہ داری کو استحکام اور کارکردگی فراہم کرنے میں ناکام رہا۔اس کے برعکس اس دس سالہ آمریت نے ایسے سماجی تضادات کو ابھاراکہ جن کی وجہ سے ایک سماجی انقلاب پھٹ پڑا جس سے ریاست ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی اورایک سوشلسٹ انقلاب سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑپھینکنے کیلئے سامنے آگیا۔

جمال عبدالناصر

27اکتوبر **1958**ء کی فوجی بغاوت کے نتیجے میں بننے والی حکومت فوجی اور سول بیوروکریسی کی کھلی آمریت تھی۔دس سالوں تک قائم رہنے والی یہ آمریت دو وقفوں پر مشتمل رہی۔پہلا **1958/62**ء کاعرصہ فوجی تسلط کاتھاجبکہ **1962/69**ء کے دوران بیوروکریسی نے ملکی سیاست میں اپناحاوی کردار بحال کرنے کی کوشش کی۔یہ وہ دن تھے جب ایشیا اورمشرق وسطیٰ میں صورتحال انتہائی نازک ہو تی جارہی تھی۔خاص طورپربرطانوی سامراج کا انحطاط حالات کی نزاکت کو اور بھی مشتعل کرتاجارہاتھا۔نہر سویز کا **1956**ء کابحران اس کی بڑی وجہ بنی جب برطانیہ‘ فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کو بپھرے ہوئے مصر کے عوام اوروہاں عروج کو پہنچے ”ناصرازم“نے شکست سے دوچار کردیاتھا۔عرب سمیت کئی نام نہاد مسلمان ممالک کے فوجی افسروں

کیلئے جمال عبدالناصر امید کا ایک ایسا محور بن کر ابھرا جسے وہ قابل تقلید سمجھتے تھے اور تقلید کرنا بھی چاہتے تھے۔اس کیفیت میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی فوجی بغاوت نے ،ہرچند کہ وہ مغرب کا حامی تھا ، سب کو حیران و پریشان کردیا۔وائیٹ ہال لندن کی راہداریوں میں تو اس نے کھلبلی مچادی۔بغاوت کے فوری بعد سفارتی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی اور سب کے اوسان خطا ہورہے تھے۔حالیہ دنوں میں آکسفورڈ نے کچھ برطانوی اخبارات کی فائلوں میں سے اس دور کاایک ٹیلی گرام شائع کیا ہے جس سے اس سفارتی خوف کی واضح جھلک سامنے آجاتی ہے۔یہ ٹیلی گرام کامن ویلتھ آفس کی طرف سے 28اکتوبر1958ء رات 8بج کر20منٹ پر بھیجا گیاتھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ’نئی حکومت کو کئی ایک مشکلات کاسامنا کرناپڑے گا‘ مستقبل میں استحکام غیر یقینی ہے اور بے شمار اضطراب موجود ہیں۔اگرچہ ایوب خان ایک مضبوط شخصیت کا حامل ہے اورعملیت پسند آدمی ہے تاہم اس کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہے جس سے یہ سوال ابھرتاہے کہ کیا پاکستانی فوج میں کوئی اور آدمی یا لوگ ایسے تو نہیں جو پس پردہ رہ کر صورتحال کو سنبھالا دے سکیں۔ہمارے لیے یہ بات باعث تشویش ہے کہ اگر کسی وقت ایوب خان کوہٹایاجاتا ہے تو اس کے بعد جو آئے گا وہ مغرب اور دولت مشترکہ دونوں کیلئے پہلے سے کم سود مند ہو گا۔اس بات کے خدشات بھی موجود ہیں کہ یا تو وہ غیرجانبداری برتے گا یاپھر وہ ناصر کے نقش قدم پر چل پڑے گا۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ دولت مشترکہ کے ایک رکن ملک میں جمہوریت کا خاتمہ کردیاگیا ہے اگرچہ یہ عارضی ہے۔ ایوب حکومت کا مستقبل غیر یقینی ہے،تاہم یہ بات ہمارے مفادات کیلئے بہترہوگی کہ ہمیں ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرنی چاہیے“۔(11)

برطانوی سامراج کے خدشات اتنے بے بنیاد بھی نہیں تھے خاص طورپر اس کے عراق‘ شام اورپھر مصر کے تلخ تجربے کے بعد تو یہ اور بھی درست ہوگئے تھے۔مصرمیں قیادت کرنے والے بیس افسروں کا گروپ جس نے ”آزاد افسروں “کی موثر حکومت قائم کی تھی یونیورسٹی گریجوایٹس پر مبنی تھا جن میں سے زیادہ تر قاہرہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔یہ سب اپنے شہروں میں مقبول سیاسی رحجانات سے متاثر تھے۔ ان میں اخوان المسلمین کی احیائے اسلام کے سے متاثر ہونے والے اور مصر کے بائیں بازو کی طرف سے مشتہر سوشلزم کے پیروکار شامل تھے۔انورالسادات اخوان کا سرگرم کارکن تھاتو جمال عبدالناصر ،خالد محی الدین اور جمال سالم بائیں بازو سے وابستہ تھے۔کیڈٹ اور افسر کے طورپر اپنی طالبعلمی کے دوران ناصر نے والٹیر ،جاریبالدی،اتاترک ،نپولین ،کلازوٹ اور بعض کے مطابق مارکس تک کا بھی مطالعہ کیاہواتھا۔ اس گروپ نے کامیابی کے ساتھ بادشاہت کو اکھاڑ پھینکاتھااور کوشش کی کہ انقلابی اقدامات کیے جائیں۔خاص طورپرزراعت کے شعبے میں ایک قوم پرستانہ سامراج

مخالف پروگرام کے تحت دیہاتوں میں استحصالی طبقے کی کمرتوڑدی گئی۔

میکارتھر

متضاد طورپر دیہاتی اور آمرانہ پس منظر رکھنے کی وجہ سے پاکستانی جرنیل کچھ مختلف قسم کے تھے جن کادنیاکے بارے میں تصورمحدوداور تھکامانده ساتھا ۔لیکن امریکیوں کے منصوبے اور اہداف کچھ اور ہی تھے۔ وہ مشرق بعید کے تجربے کوپاکستان کے اندر دہراناچاہ رہے تھے۔ جنوبی کوریا،ہانگ کانگ، فور موسا جو کہ اب تائیوان ہے،جاپان ،سنگاپورسمیت جنوب مشرقی ایشیاکے کئی علاقوں میں امریکہ، فوجی آمریتوں کی مدد سے نسبتاًمضبوط سرمایہ دارانہ معاشی بنیادیں قائم کر چکا تھا۔

فوجی اور دھونس کی طاقت کی مدد سے امریکی ملٹری ایسٹرن کمانڈکے کمانڈر جنرل ڈگلس میکارتھر نے شدت کے ساتھ زرعی اصلاحات سمیت کئی اقدامات کیے تاکہ ان ریاستوں میں جدید صنعتی سرمایہ دارانہ بنیادیں استوارکی جاسکیں ۔یہ تجربات کامیاب رہے کیونکہ یہ ریاستیں اپنے ساتھی ملکوں چین،کورین جزیرہ نمااورملایاسے کٹی ہوئی تھیں۔جاپان پہلے ہی ان ممالک میں صنعتی بنیادیں استوارکرچکاتھاوہ بھی جنگ سے پہلے۔تاہم امریکہ نے جنرل میکارتھر کے جابرانہ دور میں بے پناہ سرمایہ کاری کی اور ایک ایسی مطیع بورژوازی پیداکی جوہزاروں قسم کی جکڑبندیوں میں کچھ اس طرح بندھی ہوئی تھی کہ امریکی تسلط اور غلبے پر ذراسی بھی آنچ نہ آسکے اور جو جنرل میکارتھر اور امریکی فوج کی واپسی کے بعد بھی قائم رہ سکے۔یہ سارااہتمام چین اور علاقے کے دوسرے ملکوں میں سرخ انقلاب کی طوفانی موجوں کو روکنے کیلئے کیاجارہاتھا۔اسی لئے یہاں ٹھوس قسم کی سرمایہ دارانہ ترقی کویقینی بنایاگیا۔امریکہ نے جنگ کے دوران اپنے محنت کشوں سے کشید کی ہوئی قدرزائد کی بڑی مقدار کویہاں سرمایہ کاری کیلئے استعمال کیا۔یہ سب ، بعد از جنگ کی سرد جنگ کے دوران امریکی سامراج کی سیاسی ،عسکری ،سفارتی اورسٹریٹجک برتری کوبرقراررکھنے کیلئے لازمی تھا۔ 1949ء کے انقلاب کے بعد چین میں قائم ہونے والی سٹالنسٹ حکومت نے بھی ،اپنی تنگ نظر قوم پرستی کے باعث اس عمل کو مضبوط کرنے میں بہت مددکی۔جنرل میکارتھر کی جابرانہ حکومت نے اس عمل میں کئی جاگیردارانہ باقیات کی طاقت کو تہہ وبالاکیا ان میں جاپان کی بادشاہت کا خاتمہ بھی شامل تھاتاکہ ان علاقوں میں جدید قومی ریاستیں قائم کی جاسکیں۔

ایوب خان

پاکستان کی قسمت میں ایسا نہیں تھا،اگرچہ ہمارے یہاں اب بھی کچھ بورژوا سیاستدان ایشیائی ٹائیگرز کے ”معجزے“کے سرزدہونے کا راگ الاپتے رہتے تھے تاہم1990ء کی دہائی میں ان ایشیائی ٹائیگرز کے انجام کے بعد سے یہ غلط فہمی ختم ہوکے رہ گئی ہے۔پاکستان میں یہ عمل رابرٹ میکنامارا کے ذریعے شروع کیاگیاجو 1960ء کی دہائی میں امریکی وزیردفاع اور ان دنوں عالمی بینک کا سربراہ تھا۔فیلڈ مارشل ایوب خان کی پالیسیوں کو تشکیل دینے اور ان پر عملدرآمدکرانے کی ذمہ داری میکنامارا ہی سرانجام دے رہاتھا٬وہ بھی پاکستانی جرنیلوں کی معاونت اور دبائو کے ذریعے۔پاکستان میں سبز انقلاب اور زرعی اصلاحات کا منصوبہ واشنگٹن میں تیارکیاگیا۔امریکہ کی اس پالیسی کے پیچھے وہی مقاصد کار فرما تھے جو مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیامیں کارفرماتھے۔یعنی خطے میں کسی بھی انقلابی تحریک سے نمٹنے کی قبل از وقت تیاری کی جائے۔لیکن پاکستان میں اس پالیسی کے الٹ نتائج برآمدہوئے۔جس طرز کی ترقی کا اہتمام کیاگیا اس نے انقلاب کو روکنے کی بجائے اس کے ابھرنے کے حالات پیداکردیے۔

بٹوارے کے نتیجے میں جو قابل ذکراثرات مرتب ہوئے ان میں سے ایک ،اس وقت کی سیاسی اور جغرافیائی صورتحال تھی ۔برصغیرمیں ہر طرف انقلابی طوفان ا بھر رہے تھے۔جو ہندو مسلمان بورژوا سیاسی قیادت کی کوششوں کے باوجود آزادی کی تحریکوں کے کردار پر حاوی ہورہے تھے۔اپنی سوانح عمری ”فرینڈزناٹ ماسٹرز“میں ایوب خان نے ایک پورا باب اپنی فوجی حکمرانی کے بارے میں لکھا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اسے فوجی بغاوت کی بجائے ایک انقلاب ثابت کرسکے۔لیکن اس کی اپنی حیرانگی اور خدشات بھی اس میں خاصے نمایاں ہیں۔وہ لکھتا ہے”ایک اور پریشانی جو مجھے لاحق ہو چکی تھی وہ یہ تھی کہ کس طرح فوج اقتدارمیں آنے کے بعد اس سے الگ ہوگی،یہ ہوگی بھی یا نہیں؟باہر کی دنیا اسے” فوجی بغاوت “ قرار دے رہی تھی جو کہ دیگر ملکوں کے اندر بھی تسلسل سے ہورہی تھی۔اس سے پاکستان کے تشخص اور ساکھ کو بہت نقصان پہنچ رہاتھا۔ایک انتہائی منظم،تربیت یافتہ اور ڈسپلن کی حامل فوج کیلئے یہ امر تکلیف دہ ہوتاہے کہ وہ سیاسی حکمرانی کا آلہ بن جائے۔لیکن جس قسم کی صورتحال ملک کے اندر موجود تھی٬ یہ صرف فوج ہی تھی جو ایک متحد ادارے کے طورپر اسے سنبھال اور معاملات کو معمول پر لا سکتی تھی۔انقلابات اپنی تیاری میں طویل اور دردناک مراحل سے گزرتے ہیں۔ان کیلئے تفصیلی منصوبہ بندی، خفیہ میٹنگیں کرنی پڑتی ہیں،ملک بھر میں فوج کو اتارنا اور متحرک کرنا پڑتاہے۔ہمارے معاملے میں تیاری بہت ہی کم تھی اور اسے ایک ملٹری ایکشن کے طورپر نافذکیاگیا۔ بس اتناہوا کہ ایک بریگیڈ ہی کو بلکہ دو بریگیڈز کوحرکت کرنا پڑی“۔(12) پاکستانی بورژوا طبقے کی کمزوری نے فوج کو ایک متبادل اور وسط مدتی حکمرانی کے جواز فراہم کیے۔ غیر فوجی اشرافیہ کو حکمرانی کیلئے

فوج پر بے پناہ انحصار کرنا پڑا۔ تاہم یہ بھی ایک شرمناک حقیقت ہے کہ دن رات اٹھتے بیٹھتے فوجی آمریت کا رونا رونے والے سبھی بورژوا سیاستدان اپنی اپنی حکومتوں کے دوران فوج کیلئے خزانے کے منہ بھی کھول دیا کرتے ہیں اور اسے پہلے سے بھی زیادہ بڑی رقم سے نوازتے ہیں۔ایسا اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ بخوبی ادارک رکھتے ہیں کہ آخری تجزیے میں ان کے استحصالی طبقے کے مفادات کی نگرانی اور نگہبانی کیلئے اور کسی بھی انقلاب کے خطرے سے بچائوکیلئے اگر کوئی ادارہ سب سے موثراور کارگر ہے تو وہ یہی پاک فوج ہی ہے۔

بٹوارے کے بعدعالمی پیمانے پر سیاسی منظرنامے میں تبدیلی کے باعث برطانیہ کی عملداری کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ امریکہ نے سنبھالنا شروع کر دی ۔فروری **1954**ء میں جی ایچ کیوراولپنڈی میں(**USMAAG**)یونائیٹڈ سٹیٹس ملٹری اسسٹنس ایڈوائزری گروپ تشکیل دیا گیا کیونکہ پاکستان کی داخلی و خارجی پالیسیاں اس وقت تک بڑی حد تک امریکی مفادات کے تابع ہو چکی تھیں۔کچھ سیاستدان اس حقیقت سے بھی گھبرا گئے تھے کہ فوجی سربراہوں کے پینٹاگان کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم ہوچکے ہیں۔یہ بات مشکوک ہے کہ امریکی حکام **1950**ء کی دہائی کے آخرمیں ہونے والی فوجی بغاوت سے باخبر تھے۔کچھ سالوں بعد ایوب خان کے بھائی سرداربہادر نے الزام عائدکیا کہ امریکی سی آئی اے فوج کے اقتدارپر قبضے کے معاملے میں پوری طرح ملوث تھی۔

اکتوبر**1958**ء کے بعد ملٹری چیفس اور افسرشاہی کے نمائندگان نے دلیل دینی شروع کر دی کہ ملک کو سیاستدانوں سے محفوظ رکھنے کیلئے مارشل لاء کا نفاذضروری ہوگیا تھا۔یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی سیاست بدنامی کی حد تک غیر مستحکم ثابت ہو چکی تھی اورملک کے پارلیمانی ادارے تباہ و برباد ہو چکے تھے لیکن فوجی اقتدار کیلئے محض یہی ایک حقیقی وجہ نہیں تھی۔پاکستانی ریاست ایک تشخص اور شناخت سے محروم تھی اوراس کاحکمران طبقہ کمزور تھا۔اس نئی ریاست کے ہر ڈھانچے میں عوام کے غیض وغضب کے پھٹنے اور ان کی انقلابی پیش قدمی کے قوی امکانات موجودتھے۔چنانچہ فوج نے غیرملکی رہنمائی کے ساتھ،عوامی طاقت کے اظہارکے عمل کو روکنے کا فیصلہ کرلیا اور خود کو متبادل و معیاری حکمران طبقے کے طورپر متعارف کرانے اور خود کو ایک مضبوط سیاسی پارٹی کے طورپر سامنے لانے کا فیصلہ کرلیا۔ افسرشاہی کی طرف سے اس عمل کو مکمل تائیدوحمایت حاصل تھی ۔ایوب آمریت کا پہلا مرحلہ آپریشن کلین اپ پر مبنی تھا جس میں سیاستدانوں کو گرفتارکر کے ان کے سیاست کرنے پر کئی سالوں تک پابندی لگا دی گئی۔کئی ٹریڈیونینوں اورکسان تنظیموں پر بھی پابندی لگا دی گئی اورطلبہ کو سختی سے روک دیاگیاکہ وہ کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لیں گے۔

بائیں بازو کے معروف دانشور میاں افتخارالدین کے ترقی پسنداخبارات کے سلسلے کو ریاستی تحویل میں لے لیاگیا،یہ الزام لگاتے ہوئے کہ میاں افتخار غیرملکی ایجنٹ ہے۔یہ بائیں بازو کے خلاف ایک سنجیدہ حملہ تھا جس کے ذریعے اس کی آواز دبادی گئی اور سب کچھ حکومت نے براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

اسی دوران فوج نے ملک کو جدید"قومی ریاست" بنانے کی کوشش شروع کردی۔زرعی اصلاحات' تعلیم،شادی،فیملی لاء،اجرت و ملازمت سمیت کئی معاملات کیلئے کمیشن قائم کرنے شروع کردیے۔تاہم فیملی لاء آرڈیننس (جس میں یک زوجیت کو تحفظ اور عورت کو طلاق کا حق دیاگیا)کے علاوہ کوئی اور کمیشن فیصلہ کن سنجیدہ اصلاحات نہیں کرسکا۔

داخلہ اور معاشی پالیسی

لیکن اس سلسلے میں جو واحد اصلاح کی بھی گئی اس سے استفادہ صرف درمیانے اور حکمران طبقے کی عورتیں ہی حاصل کر سکیں۔ محنت کش طبقے کی خواتین اور سماج کے دیگر محروم طبقات کے مالی وسائل ہی اتنے نہیں تھے کہ وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔ پاکستان کی خواتین کی اکثریت انہی محروم طبقات سے تعلق رکھتی تھی۔ پے اینڈ سروسز کمیشن نے جو رپورٹ مرتب اور پیش کی اس میں سول سروسز کے ملکی ڈھانچے کی اوورہالنگ کے نام پر تباہ کن اقدامات تجویز کیے گئے جن کو لاگو کرنے سے برطانوی راج سے ورثے میں ملنے والی روایتی شاہانہ اکڑفوں کو چیلنج کیاگیاتھا۔لیکن اس رپورٹ کو خاموشی سے سردخانے میں ڈالنا مناسب سمجھا گیا۔ زرعی اصلاحات کے کمیشن نے سب سے زیادہ مایوس کیا۔اس میں جو تجویزدی گئی اور جس طرح عملدرآمد کیاگیا اس کا ایک ہی مقصدومنشاتھا کہ صورتحال کو جوں کا توں قرار رکھا جائے۔ ہاں البتہ کچھ مصنوعی قسم کی اونچ نیچ ضرور کی گئی۔میکسیکو میں کارڈیناس اور مصرمیں ناصر کی زرعی اصلاحات کے مقابلے میں دیکھا جائے تو پاکستان میں ہونے والی زرعی اصلاحات کو سب سے زیادہ زمیندار طبقے کی طرف سے خوش آمدید کہاگیا۔اگرچہ زمین کی حد ملکیت میدانی علاقوں میں **500**ایکڑ اور بارانی علاقوں میں**1000**ایکڑ مقرر کردی گئی اور چراہ گاہوں اور مویشی فارموں کو اس سے مبراقراردے دیا گیا۔ زمینداروں نے اپنے پیاروں کے نام زمین کا انتقال درج کرواکے اصلاحات کو بے معنی کردیا۔سندھ کے ایک بہت بڑے وڈیرے میر غلام علی تالپور نے زرعی اصلاحات کو انتہائی سخاوت قراردیتے ہوئے اسے صدر پاکستان کی کشادہ دلی کا نتیجہ قراردیا۔حقیقت یہ ہے کہ ان زرعی اصلاحات نے دیہات کے اصل اور مرکزی مسئلے کو چھیڑاتک بھی

نہیں یعنی کاشت اورملکیت کو الگ الگ کرنا ۔ان اصلاحات میں اگر کوئی مساوات سامنے آئی بھی تو وہ زمینداروں کے مابین مساوات تھی۔بہت ہی کم اور نہ ہونے کے برابر زمین مزارعین کے حصے میں آئی مگر ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی جسے ادا کرکے اس پیشکش سے وہ مستفید ہوسکتے۔ چونکہ ہندوساہوکار اب رہے نہیں تھے اس لیے نقد رقوم کی کوئی صورت موجود نہیں رہی تھی۔انہی زمینداروں اور مالکوں نے ہی ساہوکاری کا کام سنبھال لیا تھا۔حکومت نے دیہی قرضوں کے ادارے قائم ہی نہیں کیے تھے جو بے زمین کسانوں کی مدد کرسکتے۔ان زرعی اصلاحات کے وقت 6000زمینداروں کے پاس 500ایکڑ فی کس کے حساب سے 75لاکھ ایکڑ زمین تھی،جبکہ 22لاکھ کسان خاندانوں کے پاس فی خاندان5ایکڑ یا اس سے بھی کم زمین تھی۔25لاکھ کسان بے زمین تھے اوروہ مزارع یا کھیت مزدورکا کام سرانجام دیتے تھے۔ اصلاحات نے اس صورتحال میں کوئی معیاری تبدیلی پیدا نہیں کی۔جیساکہ پاکستان ٹائمز نے نشاندہی کی ”پابندی لگنے سے کچھ ہی ماہ قبل،پاکستان مسلم لیگ جیسی قدامت پرست جماعت کی لینڈریفارم کمیٹی نے بھی نہری زمین کی ملکیت کی حد 150ایکڑ کرنے کی تجویز پیش کی تھی“۔(13)

زمینداروں نے کاشتہ اراضی کا صرف6%ہی ان زرعی اصلاحات کی نذرکیاتھا۔اس کے باوجود کہ اس طبقے نے حکومتی سبسڈیوں سے استفادہ کرنا شروع کردیاتھا جس سے ان کی پیداوار میں بڑھوتری بھی ہورہی تھی۔سرمایہ دارانہ بنیادوں پر کاشتکاری کو فروغ دیاگیا جس سے قابل کاشت زمین کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔لیکن چھوٹے کاشتکار عملی طورپر نظرانداز کردیے گئے۔سبز انقلاب کے اصل فوائد زمیندار طبقے کو ہی میسر آئے۔سبسڈی اور قرضوں سے بھی سب سے زیادہ موقع اورمفاد انہی کو ملا۔جبکہ ان کو انکم ٹیکس کی ادائیگی سے بھی مبرا رکھاگیا۔دیہی علاقوں میں سکولوں‘ ہسپتالوں‘ ڈسپنسریوں کیلئے بمشکل کوئی رقم رکھی گئی۔یہی حالت دیگر سہولیات کے ضمن میں بھی تھی جن سے وہاں فلاح و بہبود ممکن ہوتی۔دیہی غریب آبادی جو ملک کی اکثریتی آبادی تھی بمشکل اس زرعی انقلاب سے مستفید ہو سکی۔

شہروں میں البتہ ڈرامائی طورپر معاشی ترقی کو عملی جامہ پہنایاگیا ۔فوج نے پاکستان کو سرمایہ کاری کیلئے جنت بنا دیا اور اس کیلئے کئی پابندیاں اور تحفظات فراہم کیے گئے جن میں اہم ترین ٹریڈیونینوں کو سختی سے دبا کے رکھاگیا۔پاکستان کے پاس 1947ء میں کوئی سرمایہ دار طبقہ موجود نہیں تھا۔برصغیرکا شمال مغربی حصہ خاص طورپر صنعتی اداروں کیلئے کبھی بھی موزوں نہیں رہاتھا۔یہ بمبئی سے آنے والے بوہرے اور اسماعیلی خوجے تھے جنہوں نے پاکستان کی محدودصنعتکاری کا آغاز کیا۔یہ لوگ ،پنجاب کے اپنے چنیوٹی بھائی بندوں کے ساتھ مل کر پاکستان کی طاقتور افسرشاہی کے خدمتگار بن گئے۔موخر الذکر نے نئی ریاست کی آشیربادادور تعاون سے سرمائے کی تشکیل

کیلئے کئی مسلسل اقدامات سرانجام دیے۔ حکومتی امدادسے سستی مشینری اور خام مال کی فراہمی،سود سے پاک قرضے؛ان سب سے بھرپور فائدہ اٹھایاجاتا رہا لیکن دوسری طرف ٹیکسوں کی وصولی سے دیدہ دانستہ آنکھیں بند کر لی گئیں۔

تقسیم کے فوراًبعد ہی ستمبر 1947 میں کراچی میں انڈسٹریز کانفرنس بلائی گئی تاکہ مستقبل کی ملکی صنعتی ترقی کے بارے میں منصوبہ بندی کی جا سکے۔2اپریل1948ء کو حکومت نے اپنی پہلی صنعتی پالیسی جاری کی جس میں مسلسل صنعتی ترقی کی غرض سے ترجیحات کا تعین کیاگیاتھا۔(14)

حقیقی اداروں کے مالک طبقے کی کمزوری اورصنعت کی کمی کی وجہ سے حکومت کو صنعتی اداروں کا حامل طبقہ پیداکرنے اور اس کو تیزی سے نشوونما دینے کیلئے سرگرم کرداراداکرناپڑگیا۔ا س سلسلے میں محمد علی جناح نے گورنر جنر ل کے طورپر پہلی صنعتی پالیسی کے اجرا کے فوری بعد کراچی میں صنعت و تجارت کے چیمبر سے خطاب کرتے ہوئے واضح اہداف کا ذکر کرتے ہوئے کہا”حکومت چاہے گی کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن کی مدد سے صنعت اور تجارت کو پھلنے پھولنے کا ہر ممکن موقع مل سکے۔میں آپ کی توجہ چاہتے ہوئے آپ سے مطالبہ کرتاہوں کہ آپ صنعتکاری کے ہرمرحلے کیلئے درکار انفرادی اور پرائیویٹ انٹرپرائزکو منظم کرنے کے عمل میں حکومت پاکستان کی معاونت کریں۔میں سول سرونٹس اور کاشتکاروں کے بغیرپاکستان کا تو تصور کرسکتاہوں لیکن تاجروں کے بغیر پاکستان کا نہیں۔مجھے اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ پاکستان میں تاجر وں‌اور سرمایہ کاروں کوہمیشہ خوش آمدیدکہاجائے گا۔اور مجھے اس کا قوی یقین ہے کہ وہ اپنا مستقبل، اپنی قسمت خودہی تعمیر کریں گے“۔(15)

حکومت نے صنعتی ترقی میں بڑھوتری اور صنعتکار طبقے کی نشوونما کیلئے کئی مختلف اور تیز تر اقدامات کیے۔مارچ 1949ء میں کراچی سٹاک ایکسچینج قائم کی گئی تاکہ سرمائے کی ایک وسیع منڈی فراہم کی جائے۔ستمبر 1949ء میں پاکستان انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کا قیام عمل میں لایاگیاتاکہ نجی شعبے کی صنعتوں کو مالی معاونت فراہم کی جا سکے۔

نئے صنعتکار

ایک اور ٹھوس اقدام کے طورپر 1950ء میں پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن ایکٹ کا اجرا کیاگیا جس پر جنوری 1952ء میں عملدرآمد شروع کیاگیا۔جس کا مقصد ایک ایسی کارپوریشن کا قیام تھا جوصنعت کے شعبے میں عملی اقدامات کی ذمہ دارہوتی۔بعض مخصوص کیفیات میں یہ نجی سرمائے کی معاونت بھی کر سکتی تھی جو

اس کے منصوبوں کیلئے ضروری ہوسکتاتھا۔اس کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جب منصوبے مکمل ہوتے اور کام شروع کردیتے تو کارپوریشن سرمائے کے حصص نجی سرمایہ کاروں کو منتقل کر دے گی۔نومبر 1952ء میں حکومت نے درآمدات کیلئے عمومی کھلے لائسنس معطل کردیے اور اشیائے صرف کی درآمد کو پابندکرتے ہوئے صرف" ضروری" اشیاء اور مشینری کی درآمدکی اجازت دے دی۔ان تمام عوامل نے مل جل کر پاکستان میں ایک منافع بخش صنعتی سرمایہ کاری کے حالات پیداکر دیے۔یوں ہم خوشحالی و ترقی کا ایک ایسا دوردیکھتے ہیں جس کے دوران بڑے پیمانے پرصنعتی سرمایہ کاری ہوئی۔غیر ملکی زر مبادلہ کی لاگت اوردرآمد شدہ اشیاء کی مقامی سطح پر انتہائی زیادہ قیمتوں میں فرق کی وجہ سے درآمدات کا لائسنس رکھنے والوں نے ناقابل تصور منافع کمایاجسے بعد میں انہوں نے صنعت میں سرمایہ کاری کیلئے استعمال کیا۔ان کو اس بات کی بھرپور ضمانت اور یقین دہانیاں فراہم کی گئیں کہ ان کو ایک ایسی ملکی منڈی دستیاب ہو گی جس میں کوئی بے یقینی نہیں ہوگی اور اگلی حکومت بھی اسے جاری و ساری رکھے گی۔

"1950ء کی ساری دہائی کے دوران نئے صنعتکاروں نے انتہائی اعلیٰ منافع کمایا،ان کی سرمایہ کاری زیادہ تراشیائے صرف کی صنعتوں میں تھی جہاں یہ بھی ہوتاتھا کہ ان کا لگایاہواسارا سرمایہ پہلے ہی سال وصول ہوجایاکرتاتھا۔یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی کے اوائل تک بھی اداشدہ سرمائے اور نیٹ ویلیوپرشرح منافع 25سے35فیصدہوتاتھا۔اس عرصے میں اورساٹھ کی دہائی تک حکومت نے نجی ملکیت کو مراعات دیتے ہوئے نجی صنعتوں کو بہت بڑے پیمانے پر سبسڈیز اور ٹیکسوں میں رعایتیں دیں۔

منافعوں کو بہت حوالوں سے ٹیکسوں سے مبرا رکھاگیا'ایسامختلف شکلوں میں کیاگیا جیسا کہ ملک کے کئی مخصوص جغرافیائی علاقوں میں قائم ہونے والے صنعتی زونز کو"ٹیکس ہالیڈے"قراردے دیاگیا' الائونسزکی گراوٹ میں تیزی لائی گئی' دوبارہ سرمایہ کاری میں لگنے والی کارپوریٹ اور ذاتی آمدنی پر انکم ٹیکسوں میں چھوٹ دی گئی وغیرہ وغیرہ۔ 1950ء کی دہائی میں حکومت نے جن چند ایک صنعتوں پر سرمایہ کاری کی ان میں نجی اداروں نے تکنیکی پیچیدگیوں،زیادہ ابتدائی اخراجات ،زیادہ لاگت اور مشکوک منافعوں کا جواز بناتے ہوئے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔مگر حکومت نے بہر حال وہ پروگرام شروع کیاجس کا اعلان کردہ ہدف یہ تھا کہ وہ ان صنعتوں کو تیار ہوجانے کے بعدنجی اداروں کو فروخت کردے گی"۔(16)

1958ء تک ترقی کا یہ سلسلہ رک چکاتھا۔زرعی پیداوار میں جمود نے غذائی اشیاء کی شدید قلت پیدا کردی جس کا مطلب تھا قیمتوں اور افراط زر کے اندیشے میں اضافہ۔ اشیائے صرف کی ملکی پیداوار کے ذریعے درآمدات کے متبادل کی یہ حکمت عملی جتنی کارگزاری دکھاسکتی تھی دکھا چکی تھی اور اب اس میں مزید پھلنے پھولنے کا کوئی

امکان باقی نہیں بچاتھا۔ایوب خان کے مارشل لاء نے گرتی ہوئی معاشی اورسیاسی صورتحال کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کیلئے کئی ایسے مدافعتی اقدامات کر رکھے تھے کہ جن کی مدد سے اس کے اقتدارکو کوئی خطرہ نہ ہو۔ان اقدامات نے شروع شروع میں سرمایہ کاروں کو وقتی طورپر بے یقینی سے دوچارکیامگر پھر جلد ہی حکومت نے اس بات کو واضح کیا کہ اس سب کچھ کا مقصد نجی شعبے کی ترقی اور نشوونماہی تھا۔ابتدائی طورپر اس حوصلہ افزائی کا مقصد نئی صنعتوں کی نشوونما تھاجس کا ہدف برآمدات کے شعبے کو ترقی دینا تھااور جس کیلئے مالی امداد بہت بڑی مقدارمیں ملنے والی غیر ملکی امدادسے کی جاناتھی۔ان اہداف کو پانے کیلئے جلد ہی پالیسیوں کا نفاذکردیاگیا۔ایوب خان نے یہ واضح کردیاتھا کہ" معاشی ترقی کی ضرورتوں کو پوراکرنے کیلئے نئے ممالک مغربی جمہوری نظام کی جکڑبندیوں کی طرز پر ترقی کرہی نہیں سکتے تھے ۔اگر ان کی ترقی کے عمل کا بغورمطالعہ کریں تو پتہ چلتاہے کہ ان ملکوں نے بھی مطلق العنان حکومتوں کے ہوتے ہوئے ہی یہ حاصلات کی تھیں"۔(17)

1960ء کی دہائی میں حکومت کی نجی شعبے کو کھلی چھوٹ دینے کی پالیسی کوبرقراررکھتے ہوئے نجی صنعت کو مالیاتی اداروں کی طرف سے قرضوں کی صورت میں مزید معاونت کا سلسلہ جاری رکھا گیا ۔ پاکستان انڈسٹریل فنانس کارپوریشن PIFCOاس مقصدکیلئے پہلے ہی 1948ء میں قائم کی جاچکی تھی۔1957ء میں پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انویسٹمنٹ کارپوریشن PICIC ،عالمی بینک کی معاونت سے قائم کی گئی ۔ تاکہ PIFCOکے دائرہ کار سے باہر موجود نجی صنعتوں کی بڑی تعداد کو بھی غیرملکی زرمبادلہ کی سہولت فراہم کی جا سکے۔ 1960ء کی دہائی میں PIFCOکو انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ بینک آف پاکستان IDBPمیں تبدیل کردیاگیا۔اس نے درمیانے درجے کی اور PICIC نے بڑی صنعتوں کا شعبہ اپنے اپنے ذمے لے لیا۔ ان شعبوں میں جہاں نجی شعبہ ابھی تک سرمایہ لگانے سے احترازکررہاتھا اس کے باوجود کہ ان کو ہر قسم کی من مانی معاونت کی پیشکش بھی کی گئی تھی،حکومت نے ان منصوبوں پر خود ہی براہ راست سرمایہ کاری کرلی۔ یہ زیادہ تر صنعتی استعمال کی اشیاء کے منصوبے تھے جن کا مقصد پاکستان کے صنعتی طورپر پسماندہ علاقوں میں روزگار کے مواقع پیدا کرناتھا۔

سرمایہ دارانہ مفادات کی عوامی مفادات پر برتری

PIDCنے اپنے منصوبے انتہائی موزوں شرائط پر نجی اداروں کو سونپ دیے۔کارپوریشن کے وسائل سے مستفیدہونے کیلئے عمومی طریق کارکی غیرموجودگی میں ،کہ ان منصوبوں کوکیسے کس کے سپرد کیاجائے ، یہ تبادلے سیاسی بندربانٹ کی بھینٹ

چڑھتے رہے۔ چنانچہ یہ سبھی منصوبے ان بڑے صنعتکاروں کے پاس چلے گئے جنہوں نے اعلیٰ افسرشاہی کی دیانتدارانہ خدمت کی تھی۔یوں کاروبار اور بیوروکریسی کے اس مالیاتی مفاداتی تال میل نے ملک کے بڑے صنعتی گھرانوں کے پاس دولت کے ارتکاز میں بے پناہ اضافہ کردیا۔اور یہ سب حکومت کی صنعت سازی کو تیزتر ترقی دینے کی عمومی پالیسی کے تحت ہورہاتھا لیکن یہ سب فوائد کی سماجی تقسیم میں عدم توازن کی صورت میں ہی ہورہاتھا۔اس پالیسی کے درپردہ دلیل یہ تھی کہ سرمائے کے ارتکاز کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ صنعتی اداروں کے قیام کی ایک لازمی ضرورت پوری ہورہی تھی۔ یہ جواز پیش کیاگیا کہ صرف بہت زیادہ آمدنی والے سرمایہ کا رگروپوں کی ہی اس مقصدکیلئے حوصلہ افزائی کی جانی ضروری تھی کیونکہ صرف انہی میں ہی ”بڑے پیمانے کی بچت کرنے کے امکانات ہواکرتے ہیں“۔

1950ء کی دہائی میں بڑے پیمانے کی پیداواری صنعت کی اوسط شرح پیداوار16%تھی جو 1960ء کی دہائی کے اوائل تک 15%رہی۔ .1954/55ء سے 1959-60ء کے دوران صنعتی شعبے کا مجموعی قومی آمدنیGNPمیں حصہ 8.4%تھا جو1959/60ء سے 1968-69ء تک بڑھ کر10.6%ہوچکاتھا۔1959ء تک پاکستان کے 24بڑے صنعتی گھرانے پاکستان کے کل اثاثوں کے45.9%حصے کے مالک بن چکے تھے۔ 1968ء میں 22خاندان ،جن میں ایوب خان کا خاندان بھی شامل تھا ،ملک کے کل صنعتی سرمائے کے 66%،انشورنس کے70%اوربینکنگ کے 80%کے مالک و مختار بن چکے تھے۔(18)

دراصل پبلک فنانس کے اداروں کے ذریعے حکومتی وسائل تیزی کے ساتھ بڑے صنعتی گھرانوں کی طرف منتقل ہوتے جارہے تھے کیونکہ ان گھرانوں نے اپنی اجارہ دارانہ برتری قائم اور مستحکم کر لی تھی۔نہ صرف کارپوریشنوں بلکہ منڈیوں کی صورت میں بھی۔حکومت کے طے شدہ ہدف کے باوجودجو اس نے اپنے تیسرے پانچ سالہ منصوبے 1965/70ء کیلئے جاری کیاتھا،کہ صنعتی استعمال کی اشیاء کی صنعت کو ترقی کیلئے ترجیح دی جائے گی،اور حکومت کی طرف سے اس خواہش کے اظہارکے باوجودکہ اس کیلئے نجی اداروں کو درکار مالی معاونت بھی فراہم کی جائے گی،ان بڑے نجی اداروں نے صرف انہی صنعتوں میں ہی سرمایہ کاری کی جو ان کیلئے بلند شرح منافع کی ضامن تھیں۔

1965/68ء کے عرصے میںPICICنے اپنے 83%قرضے ٹیکسٹائل انڈسٹری (جیوٹ اوردیگر فائبر)کوفراہم کیے جبکہ صرف6.6%قرضے انجینئرنگ ،دھات اوربرقی صنعت کو جاری کیے گئے اور یہی وہ شعبے تھے جنہیں حکومت سرمایہ کاری کیلئے اپنی اولین ترجیح قرار دے چکی تھی۔ (19)

اسی وجہ سے ایوب خان حکومت کو یہ تشویش لاحق ہو گئی تھی کہ کراچی بہت

زیادہ اہمیت اختیار کرتا جارہاہے۔یہ شہرصنعتی محنت کشوں کے بڑے پیمانے پر ارتکاز کو بھی جنم دے رہاتھا۔ 1954ء میں ملک کی بڑی صنعت کی افرادی قوت کا 25%سے زیادہ حصہ کراچی میں تھا۔ یہ 1959/60ء میں 40%،1964/65ء میں 45%اور1969/70ء میں 30% ہو چکا تھا۔

”حکومت کی طرف سے صنعت کو منتشر کرنے اورصرف چند مراکز کی ہی اہمیت کو کم کرنے کی پالیسی،کہ جہاں صنعت مرتکز ہوچکی تھی خاص طورپر کراچی کے معاملے میں، صنعتی مزدوروں کی کسی بھی تنظیم کیلئے انتہائی اہم مطالعے کی حامل ہے۔کیونکہ یہ علاقائی تقسیم نئے نئے لوگوں کو صنعتی افرادی قوت کا حصہ بناتی جارہی تھی ۔تاہم یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ آگے چل کر ، صنعت کے بکھرے ہوئے پھیلائو نے صنعتی افرادی قوت کے قومی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا، خصوصاً 1968/69ء کے عظیم انقلاب میں جس نے ایوب حکومت کا دھڑن تختہ کردیاتھا“۔(20)

بدعنوانی اور جبر

ریاست نجی سرمایہ داری کو تخلیق اور اسے مضبوط کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جا رہاتھا کہ نئی بورژوازی افسر شاہی کے ساتھ وابستہ وپیوستہ رہے گی۔جس کے نتیجے میں کاروباریوں اور افسرشاہی میں انتہائی قریبی مفاداتی رشتے قائم ہوگئے۔ 1958ء کی فوجی بغاوت کے بعد فوج کی بالاپرت بھی اس رشتے داری میں شریک ہوگئی۔یوں بدعنوانی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔افسر شاہی اور جنرل شاہی نے سیاسی تو بورژوازی نے معاشی طاقت کو اپنے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ منافعوں میں اضافہ ہوتا رہامگر پیداواری صنعت کے مزدوروں کی حقیقی اجرتوں میں شدید کمی واقع ہوتی چلی گئی۔جبکہ کراچی، لاہور ،لائل پور ،راولپنڈی اور دیگر شہروں کے صنعتی مراکز میں محنت کشوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوچکاتھا۔ہر چند کہ ایوب خان کے دور حکومت کوپاکستان کی معلوم تاریخ کے نسبتاً پرسکون دورمیں شمار کیاجاتاہے ،مگر یہی پرسکون دور ملک میں کسی قسم کا حقیقی استحکام پیداکرنے میں مکمل طورپر ناکام رہا۔یہ ایک وحشی استحصالی حکومت تھی جس نے کئی جرائم اور زیادتیوں کا ارتکاب کیا۔خاص طورپر بائیں بازو کے ساتھ۔لاہور کا بدنام زمانہ شاہی قلعہ ایو ب دور میں ہی جدید دورکا معروف عقوبت خانہ بنادیاگیاتھا۔یہاں سب سے زیادہ شہرت حسن ناصر شہید پرہونے والے جبر اور بعد میں اس کی شہادت کو حاصل ہوئی جو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا ایک قائد تھاجسے فوجی حکمرانوں نے موت کے

گھاٹ اتار دیا۔کئی دیگر سیاسی اور ٹریڈیونین رہنما بھی اس تاریخی عقوبت خانہ کی کال کوٹھریوں میں انسانیت سوز جبروتشدد کا شکار ہوتے رہے۔

مگر یہ جبر وتشدد شاہی قلعے کی بلند فصیلوں سے نکل کر سارے ملک میں پھیلتا چلا گیا ،ہر کونے کھدرے میں پولیس بلاروک ٹوک اندھادھند وحشتوں کا مظاہرہ کررہی تھی۔خاص طور پر ایوب خان کے سیاسی مخالفین کو نشان عبرت بنایا جاتا رہا۔رشوت اور بدعنوانی افسرشاہی کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور پولیس کے معاملے میں تو یہ ایک عام معمول قرار پا گیا تھا۔جمہوریت کو نیچے عوام تک لے جانے کے نام پر بنیادی جمہوریت کا کھیل رچایا گیا تاکہ سیاست کو" غیر سیاسی " کردیا جائے۔تب سے لے کر اب تک ہر فوجی آمر نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور طول دینے کیلئے بنیادی جمہوریت کا یہی شعار اپنا رکھا ہے۔2جنوری1965ء کے پہلے قومی صدارتی الیکشن کیلئے یہی بنیادی جمہوری ادارے ہی حلقہ انتخاب قرار پائے تھے۔مگر اس تمام تر حفاظتی و مدافعتی اقدامات کے باوجود ایوب خان کو یہ الیکشن لڑنا پڑ گیا۔ایوب خان کی طرف سے نظرانداز کیے جانے والے لومڑی مزاج جاگیرداروں نے اس کے ساتھ کئی چالیں چلنی شروع کردیں۔انہوں نے محمد علی جناح کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کو اس کے مقابلے میں حزب مخالف کے مشترکہ ومتفقہ امیدوار کے طور پر لا کھڑا کردیا۔مس فاطمہ اپنے بھائی کے ساتھ شانہ بشانہ عوامی جلسوں میں شریک رہی تھی اور جناح کی بیوی کے چھوڑ جانے کے بعد سے وہ اپنے بھائی کی سیاسی ہمسفر رہی تھی۔

جنگ

کھلے بندوں کی جانے والی دھاندلی کے باوجود سرکار ی مشینری اورذرائع ابلاغ کے زور دار پروپیگنڈے کے مطابق ایوب خان"آرام" سے اپنا صدارتی الیکشن جیت گیا۔سماج کی تہوں میں پنپتی بے چینی نے رفتہ رفتہ سطح پر ابھرنا شروع کردیا۔اقتدار کے خاموش ایوانوں میں سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔حکومت کے حکمت سازوں کے چہروں پر تشویش کے آثار بڑھتے ہی چلے گئے۔وہ سماج میں اس اچانک شروع ہو جانے والی حرکت سے گھبرا گئے اور بدحواس ہو کر ایک دوسرے کے خلاف بدترین اقدامات پر اتر آئے تاکہ عوام کی توجہ کو تقسیم اور گمراہ کیا جاسکے۔جو اس حکومت کے وجود اور اسکے جواز پر انگلیاں اٹھانے لگ گئے تھے۔اسی بدحواسی میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ کشمیر پر چڑھائی کر دی جائے تاکہ بھارت کے ساتھ جھگڑے کی کو ئی شکل نکل آئے۔ان میں سے چند بہادر و باہمت نے تو یہ بھی سوچنا سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم کشمیر کو فتح کر کے اپنی حکمرانی کو ایک مستحکم بنیاد فراہم کردیں گے۔جنرل کلازوٹز نے کہا تھا کہ "جنگ سیاست کا

پرتشدد ذریعے سے تسلسل ہے“۔

انہوں نے داخلی تضاد کو خارجی محاذآرائی کے ذریعے ختم کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔کچھ سرکاری دانشمندوں کا یہ بھی خیال تھا کہ جنگ محض کشمیر کے اندرواقع متنازعہ سرحد تک ہی محدودرہے گی۔ مگریہ جنگ ایک علاقے تک محدودلڑائی سے پھیل کر دوملکوں پاکستان اور بھارت کی بین الاقوامی سرحدوں تک پھیلتی چلی گئی۔ستمبر **1965**ء میں شروع ہونے والی یہ جنگ **17**دن تک جاری رہی اور جیسا کہ ہر جنگ کا بنیادی قانون ہوتا ہے ،ہر جنگ کی طرح اس میں بھی سب سے پہلا خون سچائی کا ہی ہوا۔یہ سوال ابھی تک تشنہ ہے کہ یہ جنگ کس نے جیتی اور کس نے ہاری ؟سوویت سفارتکاری کی مداخلت کے نتیجے میں ہونے والے سیز فائر کے بعد دونوں پاکستان اور بھارت نے اپنی اپنی فتح کے شادیانے بجائے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک نسبتاًکمزور ملک ہونے کی وجہ سے پاکستان کو اس جنگ سے زیادہ نقصان اٹھاناپڑا،نہ صرف معاشی طورپر بلکہ خودریاست کی اپنی اندرونی ساکھ اس سے شدید متاثرہوئی۔بحران پہلے سے ہی حکمران طبقے کے اندر دراڑیں ڈال چکاتھا جنگ نے تواس تقسیم کو مزید گہرا‘مزید شدید کردیا۔سب سے اہم ترین تنازعہ ایوب خان اور اس کے انتہائی لاڈلے ، چہیتے اور معتمدذوالفقارعلی بھٹو کے مابین کھل کر سامنے آگیا۔

یہ تنازعہ اس وقت بھی عیاں ہو کر سامنے آیا جب ایوب خان کی کابینہ کی ٹیم اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کا وفد تاشقند (روس) میں روسی وزیراعظم کوسیگن اور وزیرخارجہ گرومیکو کی سربراہی میں ہونے والے مصالحاتی مذاکرات کیلئے اکٹھے ہوئے۔بھٹونے بعد میں تاشقند معاہدے کو ایوب خان کی طرف سے پاکستان کی خودمختاری کو بیچ دینے کا معاہدہ قراردے دیا۔بھٹو کے ساتھ ایوب خان کی علیحدگی ایوب کیلئے ہلاکت خیز ثابت ہوئی اور یہ ان بڑی وجوہات میں سے ایک تھی جو ایوب کی رخصتی کا باعث بنیں۔

انقلاب

کہا جاتاہے کہ جنگوں کی کوکھ سے انقلاب جنم لیاکرتے ہیں۔جنگی جنون کے نتیجے میں ابھرنے والا قومی اور سماجی تعصب اور عوام الناس کے ذہنوں میں انڈیلاجانے والاجذبہ حب الوطنی فوراًہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیاتھا۔ہر سرمایہ دارانہ سماج کی طرح اس جنگ سے ہونے والی تباہ کاریوں کا بوجھ بھی آخرکارمحنت کشوں اور مفلوک الحال

عوام پر ہی ڈال دیا گیا۔جس کی وجہ سے سیاسی وسماجی اپوزیشن اور مزاحمت نے سر اٹھانا شروع کردیا۔جس کی ابتدا بیروزگار گریجوایٹس اور طالبعلموں سے ہوئی۔مسلسل بیروزگاری سے پیدا ہونے والے اورسماج میں تیزی سے پھیلتے ذہنی دباؤ کا شکار نوجوانوں نے اپنی پیشہ ورانہ ڈگریاں جلانا شروع کر دیں۔

کئی حوالوں سے **1965**ء کی جنگ **1968/69**ء کے انقلاب کے معاملے میں عمل انگیز ثابت ہوئی۔جنگ نے ناگزیر طورپر معیشت پر اپنے اثرات مرتب کیے اور اس نے معاشی ترقی اور سماجی ارتقاء کے مابین فرق اور فاصلے کو مزید بڑھادیا۔ایوب حکومت کے دوران مضبوط معیشت،انفراسٹرکچراور صنعت کی ترقی ہوئی مگر اس ترقی کی سماج کو ترقی دینے کی نااہلی نے ایک بار پھر اس تاریخی حقیقت کو عیاں کردیا کہ ایک نوآبادیاتی بورژوازی قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے پورے کرنے کیلئے قطعی طور پر نااہل ہواکرتی ہے۔پاکستانی بورژوازی نے کبھی سوچا تک بھی نہیں ہوگا کہ اسے اس سے بہتر حالات میسر آئیں گے۔ریاست کی طرف سے مالیاتی اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے ضمن میں امداد،وہ بھی تجارت کیلئے سازگار حالات اور محصولات کی سودمند پابندیوں سمیت۔ریاست کی طرف سے فراہم کی گئی سہولتوں اور مراعات کی فہرست کافی طویل ہے مگر اس سب کے باجود یہ نہ تو زرعی انقلاب کے ذریعے جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر سکی اور نہ ہی ایک حقیقی قومی ریاست تشکیل دے سکی۔اورنہ ہی یہ برابری کی جڑت کا احساس پیداکرکے قومی مسئلے کو حل کر پائی۔نہ تو یہ ریاست کو ایک سیکولر شکل و صورت فراہم کرسکی اور نہ ہی بالغ رائے دہی کی حامل ایک سچی پارلیمانی جمہوریت کو ممکن بنا سکی۔اصلاحات کی اس ایوبی دہائی کے دوران ہونے والی سماجی اور صنعتی ترقی کی طرزناہموار اور مشترکہ فطرت کی حامل تھی۔بورژوازی قومی خودمختاری تخلیق کرنے میں ناکام رہی اور سامراجی جکڑبندیوں سے خود کو کسی طورآزاد نہیں کراسکی۔حکومت نے جو کچھ بھی کیا اس سے اور تو کچھ سامنے نہیں آسکا البتہ اس کی بدعنوانی اور کھوکھلا پن ضرورعیاں ہو کر سب کے سامنے آگیا۔ایک ترقی پسند طبقے کے طورپر ان کی ناکامی اور نا اہلی اس وقت سامنے آگئی جب انہوں نے اپنی بقا کیلئے جاگیردارانہ باقیات اور مذہبی شدت پسندی کے ساتھ اتحاد کرلیا اور جب انہوں نے سامراج کی محتاجی اختیار کر لی۔اس قسم کے حکمران طبقے کو تاریخ کے ہاتھوں انجام سے دوچارہوناہی تھا اور **1968/69**ء کے انقلاب نے یہ تاریخی فریضہ تقریباًسرانجام دے ہی دیاتھا۔

ایوب خان کی صنعتی ترقی کا سب سے مثبت پہلوایک نئے تازہ دم پرولتاریہ کا تاریخ کے میدان میں قدم رکھناتھا۔پھر بڑی ٹریڈیونینوں اورمنظم ٹریڈیونین ازم کی غیر موجودگی بھی ایک اہم عنصر تھا۔اس قسم کی مضبوط ٹریڈ یونینیں عمومی طورپر

بدعنوانی اور مصالحانہ موقع پرستی کا شعار اپنائے ہوئے ہوتی ہیں اور پرولتاریہ کے ا نقلابی ارتقاکے عمل میں رکاوٹ کے سوا کوئی کردارادانہیں کرتیں۔لیکن جن ٹریڈیونینوں کو انقلاب ابھارتاہے ان کی سوچ اوران کا عمل ہی کچھ اور ہوا کرتا ہے۔تاہم انقلاب کی پسپائی ان کو پھر سے وہی روایتی ٹریڈیونین بننے پر مائل کر دیتی ہے۔یہی اس انقلاب میں بھی ہوایعنی جب دھاراپلٹاتو سب پلٹ کے رہ گیا اور حالات پھرسے معمول پر آگئے۔

دیہی زرعی بحران اور زرعی شعبے کی سست رو اور بیزار کردینے والی اکتاہٹ کے مارے، دیہات و مضافات سے آئے یہ محنت کش، تیزترین صنعتکاری کے عمل میں کھپتے چلے گئے۔تاہم صنعت اور جدید ٹیکنالوجی نے ان کو ایک نئی بصیرت سے روشناس کراتے ہوئے ان کے سادہ دماغوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھار دیا۔اورپھر یہ مزدور ابھی تک ٹریڈیونین یا سیاسی قیادت کی دھوکہ دہی پر مبنی مصالحت کے نقصانات سے محفوظ تھے۔مصالحت کرلینے کی پیچیدگیاں اور بیہودگیاں ابھی تک ان کے دل و دماغ کو چھوکر بھی نہیں گزری تھیں۔ان کا شعور روشنی کی رفتار سے بلندہوتاجارہاتھااور جونہی ان کو ادراک ہوگیا کہ مشترکہ حاصلات کیلئے مشترکہ جدوجہد کے سوا نہ کوئی رستہ ہے اور نہ ہی کوئی حل تو ان کا یہ شعوری نتیجہ **1968/69**ء کے انقلاب کی صورت میں آتش فشاں کی طرح پھٹ کر سامنے آگیا۔

یہ تازہ دم پرولتاریہ نسبتاًایک تیز ترقی کی پیداوارتھا۔کارل مارکس نے **1857**ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے اپنی معرکتہ الآرا کتاب میں لکھاتھا”ریلوے لائن کے بچھائے گئے ہر ایک میل اورٹیلی گراف کے ذریعے برطانوی سامراج اپنی قبر خود ہی کھو درہاہے“۔مارکس کا یہی مشاہدہ ایوب دور کی صنعتی ترقی کے معاملے پر بھی مکمل لاگو ہوتاہے۔معاشی ترقی کے ہونے مگر سماجی ارتقا کے نہ ہوسکنے سے پیدا ہونے والے تضادات پھٹ کر **1968/69**ء کے انقلاب کا روپ دھار گئے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے تیز ترقی ایوب کے دور میں ہی ہوئی تھی۔کسی اور دورحکومت میں اس قدر صنعت کاری نہیں ہو سکی جتنی اس دور میں ہوئی ۔جس سال انقلاب ہورہاتھااس سال پاکستان کی شرح ترقی **9.1%**تھی جو اس سے پہلے اوراس کے بعد کبھی اسے نصیب نہیں ہو سکی۔لیکن یہ شاندار شرح ترقی اور صنعتکاری کا یہ عمل ہرگز ہرگز فوجی حکومت سے سرزد ہونے والا کوئی معجزہ نہیں تھا۔اس میں مختلف النوع قسم کے کئی عوامل و عناصر کارفرماتھے۔اس کی سب سے بڑی وجہ مغرب میں ہونے والا عروج اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو ملنے والے ابھار کے اثرات تھے جو ہر طرف مرتب ہورہے تھے۔جس سے پاکستانی حکمرانوں نے بھی خاطرخواہ فائدہ اٹھایا۔اس وقت یہ کینیشین ازم کو اپنا نے کی پوزیشن میں بھی تھے اور پھر ریاست کو معیشت میں بھرپور مداخلت کے مواقع بھی میسر آئے

ہوئے تھے۔

پاکستان کی ترقی امریکی ماہرین معیشت کیلئے مشعل راہ بنی ہوئی تھی اور وہ دیگر کئی نوآبادیاتی ممالک کو مشورے دے رہے تھے کہ وہ بھی تیسری دنیا کے اس شاندار ماڈل کی پیروی کریں جو آزاد ادارہ سازی کی ایک روشن مثال بن چکاہے۔لیکن یہ محض دنیا کو بتانے کی باتیں تھیں۔ یہاں کوئی ادارہ آزاد نہیں تھا۔یہ صرف ریاستی سبسڈیوں اور تحفظات کی ہی کرم فرمائی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام خود کو اتنا مضبوط و مستحکم کر سکا تھا۔پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن جیسے اداروں کی طرف سے قائم کی جانے والی فیکٹریاں بعد میں نجی سرمایہ داروں کے ہاتھوں ”معقول “قیمتوں پر بیچ دی گئیں۔اس عمل کو ”ہارورڈڈیویلپمنٹ ایڈوائزری سروس“کا نام دیا گیا۔پاپانیک Papanekنے پاکستان کی بورژوازی کو ڈاکوئوں کا ٹولہ قراردیااور اس ترقی کے نیچے پھلتے پھولتے استحصال کو جائز قراردیا۔ لیوس کیرل Lewis Carollکے طنزیہ انداز میں پاپانیک نے اپنی کتاب Wonderlandمیں ان نابرابریوں کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے”آمدنیوں میں نابرابری ہی معیشت کی ترقی کا باعث بنا کرتی ہے۔اسی سے ہی کم آمدنی والے لوگوں کی حالت میں حقیقی بہتری ممکن ہوتی ہے“۔(21) ایوب خان کی حکومت کو بھک سے اڑا دینے والے سماجی دھماکوں نے پروفیسرپاپانیک کی اس وضاحت کو غلط ثابت کردیا۔ہارورڈ کے یہ عالم فاضل مشیر صنعت میں سرمائے کو ڈالتے وقت اس تباہی کو نظرانداز کر گئے جو اس عرصے کے دوران زراعت کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔مغربی پاکستان میں سرمایہ کاری کیلئے دوتہائی رقم باہر سے آرہی تھی کیونکہ ایک مضبوط و مستحکم فوجی حکومت ہی تھی جو غیر ملکی سرمائے کو ملک کے اند ر لا رہی تھی اور مقامی سرمائے کی نشوونما کر رہی تھی۔

فوجی حکومت کی پالیسیوں نے ملک کے اندر دولت کا بے پناہ ارتکازکردیاتھا۔1964ء میں جب ملک بھر کے معیشت دان اکٹھے ہوئے تاکہ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کو تجویز وتشکیل دیا جا سکے تو انہیں اس حقیقت کی سمجھ آ گئی کہ پاپانیک کے ماہرین عوام کی اکثریت کیلئے حقیقی آمدنی میں درپیش تعطل اور رکاوٹ کاکوئی مداوا نہیں کر سکے تھے۔ پلاننگ کمیشن کے سربراہ ماہر معیشت ڈاکٹر محبوب الحق نے جن اعدادوشمار کا انکشاف کیا ان سے سارا ملک ششدر رہ گیا۔اس نے بتایاکہ ملک کا 66%صنعتی سرمایہ محض 22 خاندانوں کی دسترس میں تھا۔دائود،آدم جی‘سہگل‘ولیکا‘بھیم جی‘ڈنشا‘فینسی‘مارکر‘اصفہانی اور حبیب ان میں سب سے نمایاں تھے۔اسی تیسرے پانچ سالہ منصوبے کی دستاویز میں یہ اعتراف بھی شامل تھا کہ معیشت کی حقیقی صورتحال ایسی نہیں کہ جس سے خوش گمان ہواجاسکے۔ایک طرف قومی آمدنی GNP ترقی کررہی تھی اور معیشت پھیلتی جارہی تھی تو اسی کے ساتھ ساتھ

عوام الناس کی بدحالی اور کسمپرسی بھی ترقی اور وسعت اختیار کرتی جا رہی تھی۔معاشی ترقی کے انھی پانچ سالوں کے دوران ہی عوام کی خوراك کی شرح انتہائی نیچے جا چکی تھی۔

افسرشاہی اور فوج نے ایک طرف بڑے شہروں میں بے انت اور شدید استحصال کے نتیجے میں کروڑپتیوں کا ایک طبقہ پیداکردیاتھاتو دوسری طرف جاگیرداروں اور سرمایہ دار کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کیے رکھی جنھوں نے کسانوں اور مزارعوں کا خون چوس چوس کر اپنی طاقت اور دولت میں بے پناہ اضافہ کرلیاتھا۔کوئی بھی جب اس ظالمانہ کیفیت پر بات یا احتجاج کرتاتو اس پر ظلم کی انتہا کردی جاتی تھی۔ شہروں میں ہر قسم کی ٹریڈ یونین سرگرمی کو بالادست طبقہ اپنے مضبوط کنٹرول میں لیے ہواتھا۔ٹریڈیونین ازم کے سست رو ارتقاکی متعدد وجوہات تھیں۔ایک جابر جاگیر دارکی فیکٹری میں تازہ وارد ہونے والے محنت کشوں کی اکثریت کا شاپ فلورپر خاموش رہنا ایک وجہ تھی۔سرکاری سطح پر ہونے والا جبروتشدداور مکروفریب بھی ایک بڑی وجہ تھی۔کمپنی یونینوں کے عہدیداروں کو ریاست کی طرف سے خاصی پذیرائی اور حوصلہ افزائی فراہم کی جارہی تھی۔جبکہ مقامی عہدیدار فیکٹری مالکان کی مددسے نمائندہ یونین بنانے کی کوشش کرنے والوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتے تھے۔ایوب اقتدار کے سارے عرصے میں ہڑتالوں پر پابندی عائد رہی جبکہ ٹریڈیونین رہنمائوں کو حکومت نے تنخواہیں لگارکھی تھیں۔لیکن پاکستان میں ٹریڈیونین ازم کی کمزوری کی ایک بڑی معروضی وجہ بھی تھی۔روزگار سے محروم محنت کشوں کی ایک بہت بھاری تعدادکی موجودگی کبھی بھی مضبوط یونینوں کیلئے سازگار نہیں ہواکرتی۔دیہات میں افسرشاہی اور زمینداروں نے مزارعین کو مکمل طورپر اپنا تابع بنا لیاہواتھا۔یہاں ہونے والی ترقی ”ٹیوب ویل انقلاب “کا فائدہ بھی صرف دیہات کا امیر ہی اٹھا سکاتھا۔دیہی ترقی کیلئے دیہی انفراسٹرکچر ،سماجی بہبود اور پیداواری ٹیکنالوجی کیلئے سرمایہ کاری کی منصوبہ بندی کرنے کی بجائے ،پاکستانی معیشت صرف شہری اشرافیہ کی صارفیت کی عادات کی تسکین کیلئے سرگرم رہی۔اور یہی ملک کی غیرمنظم درآمدی پالیسی کے پیچھے کارفرما مقصد تھا۔پاکستان میں سرمایہ دارانہ نظام کسی طور آزاد اور ترقی بخش نہیں تھا۔بلکہ یہ بڑی سرمایہ دار طاقتوں کا ایک ایسامطیع و محتاج موکل تھا جو خود مفلوك الحال تھااورصرف بڑے پیمانے کی غیر ملکی امدادکے ذریعے ہی اپنے منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتاتھا ۔صنعتی ترقی نے پاکستان پر دو بڑے گہرے اثرات مرتب کیے‘ ایک اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے بیچ فاصلوں اور تنازعات کو بڑھاوادیااوردوسرا اس نے شہروں کے اندرمحنت کش طبقے کی تعداد میں تیزی کے ساتھ اضافہ کیا۔

پاکستان کی بورژوازی خود کو مبارکبادیں دینے میں اتنی محو اور مخمور ہوچکی تھی کہ اسے ان سیاسی کیفیات کا سرے سے اندازہ ہی نہیں ہورہاتھا جو عنقریب ان کی ریاست کے تانے بانے ادھیڑنے کا سبب بننے والی تھیں۔1968/69ء میں پاکستان میں ہونے والی انقلابی سرکشی کم از کم ایشیا کی تاریخ کی پچھلی دودہائیوں کا سب سے حیران کن واقعہ تھا۔عالمی تناظر میں یہ ایک ایسا سماجی انقلاب تھا جس کی کامیابی تاریخ کے ارتقا ئی عمل پر گہرے دوررس اثرات مرتب کر سکتی تھی۔

نوٹس

1۔ ایوب خان، ایوب خان کی ڈائری72-1966ء ، بدھ 16اکتوبر1968ء ، (آکسفورڈ) صفحہ273
2۔ اقبال کے جناح کے نام خطوط، لاہور 1942ء
3۔ کولن اینڈ لیپئیر،فریڈم ایٹ مڈ نائٹ، صفحہ285
4۔ ڈان، کراچی، 12اگست1947ء
5۔ ٹیکنیکل معاونت :خارجہ امور کی کمیٹی کی حتمی رپورٹ(انگریزی)، واشنگٹن، 12مارچ1957ء
6۔ ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک(انگریزی)،(آکسفورڈ)، 2007ء ، صفحہ 25
7۔ ٹیکنیکل معاونت :خارجہ امور کی کمیٹی کی حتمی رپورٹ(انگریزی)، واشنگٹن، 12مارچ1957ء
8۔ طارق علی، کیا پاکستان بچ جائے گا؟(انگریزی)، صفحہ 56
9۔ پاکستان ٹائمز ، 16مئی 1958ء
10۔ طارق علی، کیا پاکستان بچ جائے گا؟(انگریزی)، صفحہ 63
11۔ برٹش پیپرز69-1958، (آکسفورڈ)، صفحہ 49
12۔ ایوب خان،آپ بیتی: آقا نہیں دوست، صفحہ 71
13۔ پاکستان ٹائمز، لاہور26جنوری 1959ء

14. 1948ء کی صنعتی پالیسی جو آرنلڈ1955ء میں دوبارہ شائع ہوئی، ضمیمہ 3، صفحہ 283-8
15. ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک(انگریزی)،(آکسفورڈ)، 2007ء ، صفحہ 18
16.ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک(انگریزی)،(آکسفورڈ)، 2007ء ، صفحہ 20
17. ایضاً، صفحہ 25
18. بزنس ریکارڈر، 25اپریل 1968ء
19. IBRD1970: Vol, III صفحہ 63
20.ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک(انگریزی)،(آکسفورڈ)، 2007ء ، صفحہ 24
21. گستاف ایف پاپانیک، پاکستان کی ترقی(انگریزی)، (ہارورڈ)، 1967ء

انقلاب کا آغاز!
جب سوشلسٹ فتح اتنی قریب آگئی تھی!

عوام کی تاریخی واقعات میں براہ راست مداخلت ہی کسی بھی انقلاب کی سب سے نمایاں خوبی ہوتی ہے۔عام دنوں میں ریاست خواہ اس پر بادشاہت براجمان ہو یا جمہوریت ، خود کو عوام سے بے نیاز رکھتی ہے اور مورخین سربراہان مملکت 'وزرا 'دانشوروں او ر صحافیوں کے حوالوں سے ہی تاریخ کو مرتب کرتے ہیں۔۔۔لیکن جب وہ وقت آجاتاہے کہ یہ فرسودہ نظام عوام کیلئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تووہ سبھی حدودوقیود پامال کرتے ہوئے ان لوگوں کو سیاسی دھارے سے نکال باہر کرتے ہیں'اپنے روایتی نمائندوں کو اٹھاکر ایک طرف کر دیتے ہیں'اور پھر اپنی مداخلت و شمولیت سے ایک نئی طرزحکومت کی بنیادیں رکھتے ہیں۔یہ عمل اچھا ہے کہ برا،اس کا فیصلہ اخلاقی مبلغین کرتے پھریں۔ہمیں تو ان حقائق سے ویسے ہی سروکار ہے جیسے وہ اپنے معروضی حالات کی کوکھ سے جنم لیتے اور تشکیل پاتے ہیں۔ایک انقلاب کی تاریخ ہمارے لیے ،سب سے پہلے ،حکمرانی کے عمل میں عوام کادخل ہوتاہے جووہ اپنے مقدر بدلنے کیلئے کرتے ہیں“ ۔(1)

(لیون ٹراٹسکی،1879/1940ء)

انقلاب کی پہلی چاپ

جمعرات 7نومبر 1968ء کو1917ء کے عظیم اکتوبرانقلاب کی 51ویں سالگرہ تھی۔اس دن پاکستان کے کسی بھی قصبے یا شہر میں اس حوالے سے نہ تو کوئی تقریب منعقدہورہی تھی' نہ ہی یہ دن منایا جارہاتھا۔ معمول بن گیا تھا کہ اس دن سبھی کمیونسٹ ،سوشلسٹ یا پھر ترقی پسند پارٹیوں کے سٹالنسٹ رہنما حکومتی وزراء اور افسران بالا کے ہمراہ"معززین شہر"کی حیثیت سے روس کے سفارتخانے یا قونصلیٹ میں مدعو کیے جاتے اور وہاں سالگرہ کا جشن منایاجاتا تھا۔سٹالنسٹ افسرشاہی نے' بالشویک انقلاب 'کو سفارتخانوں کی دیواروں میں محصور کردیاتھا۔اس دن کو پرولتاریہ کی عالمگیریت پر مبنی یکجہتی کی علامت کی بجائے روس کے قومی دن کی حیثیت میں بدل کے رکھ دیاگیاتھا۔ یہ اپنے اندر بالشوازم کی اس بین الاقوامیت کی اساس کے قتل کی غمازی کرتاتھا جسے 1917ء کے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں ہونے والے انقلاب نے متعارف کرایا اور نافذ بھی کیا۔U.S.S.Rکی ایک یونین کے طورپر تشکیل کا مقصد بھی یہی تھا کہ دنیا بھر کے ملکوں کے مزدوروں کو ایک مضبوط اکائی میں پرویا جائے۔

تاہم اسلام آباد میں روسی سفارتخانے سے ذرا ہی دور انقلاب کے قدموں کی پہلی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ 6/7 نومبر کے اس واقعے کے بعد جو عوامی ابھارپاکستان میں سامنے آیا وہ یہاں وہی تاریخ رقم کرسکتاتھا جو روس میں 1917ء کے انقلاب نے کی تھی۔اگلے 138دنوں کے اندر جو کچھ پاکستان کے گلی کوچوں میں ہوا ،اس کی ابتدا اسلام آباد سے کچھ کلومیٹر دور گورنمنٹ پولی ٹیکنیک کالج کے سامنے ہوئی تھی۔جہاں پولی ٹیکنیک اور گورڈن کالج کے طلبہ ریاستی طاقت کے ساتھ ٹکرا گئے اور یہیں سے انقلاب کی شروعات ہوئی۔ اس آغازنے عوام کے قدموں کو وہ انقلابی سرکشی اورسرشاری فراہم کردی کہ جس سے اقتدار کے ایوان لرزتے چلے گئے ،نہ صرف اسلام آباد اورڈھاکہ میں بلکہ لندن اور واشنگٹن میں بھی۔

یہ پہلا واقعہ جس نے واقعات کے تسلسل کوجنم دیا ،ایک دستاویزی شکل میں اسلام آباد میں برطانوی ہائی کمیشن کی طرف سے وائٹ ہال لندن کو بھیجی جانے والی ٹیلی گراموں کی صورت میں موجودہے۔ان ٹیلیگراموں میں جو عبارت موجود ہے وہ اگرچہ سفارتی منافقت سے بھرپور ہے تاہم اس سے بھی بخوبی اندازہ ہوجاتاہے کہ 1968ء کی خزاں سے شروع ہو کر 1969ء کی بہار تک جاری رہنے والی انقلابی سرکشی سے سامراجی کس

قدر ہراساں ہو چکے تھے۔ برصغیر پر اپنے راج کے تجربات اور پھر پاکستانی سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ان کے گہرے مفادات وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے سامراجیوں پر خوف طاری ہوچکاتھا۔اس کیفیت کا اظہار ان کے اپنے بھیجے گئے پیغامات سے ہوتا ہے جو ابھی حال ہی میں مرتب اور شائع کیے گئے ہیں۔برطانویوں کو بہرحال باقی ہر بڑی طاقت(امریکہ سمیت) کے مقابلے میں اس خطے کی کیفیات و نفسیات سے زیادہ واضح آگاہی اور سدھ بدھ تھی۔ 16نومبر1968ء کو برطانوی ہائی کمیشن کی جانب سے پکارڈ نامی ایک سفارتکار کی طرف سے 'مغربی پاکستان میں گڑ بڑ' (Disturbance in West Pakistan)کے نام سے ایک مراسلہ بھیجا گیا۔ہم اس کو یہاں نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو درست طورپر اندازہ ہو سکے کہ برطانویوں کو ان واقعات سے کتنی دلچسپی اور کیسے کیسے تحفظات تھے۔یہ دلچسپی بغیر وجہ کے نہیں تھی،سب سے بڑی امکانی وجہ یہ تھی کہ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے نمٹنے کی تیاری کرنی تھی۔یہ مراسلہ مسٹرمائیکل سٹیوارٹ ممبر پارلیمنٹ SW1 وائٹ ہال کے نام اور پتے پر بھیجا گیاتھا۔

”سر!میں جناب کی توجہ کیلئے مظاہروں کی رپورٹ بھیجنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتاہوں جو یہاں راولپنڈی میں 7سے10نومبر کے دوران طالبعلموں نے کیے اوربعد میں جن میں دیگر لوگ بھی شریک ہوگئے ۔یہ مظاہرے پولیس کی فائرنگ سے ایک طالبعلم کی ہلاکت کے بعد اس کے ساتھ ہمدردی کے اظہار میں شروع ہوئے ہیں۔یہ مغربی پاکستان کے کئی حصوں میں ہو رہے ہیں اور کئی جگہوں پر یہ متشدد بھی ہو رہے ہیں۔10نومبر کو پشاور میں جب صدر ایوب خان جلسہ عام سے خطاب کر رہاتھا ،اس پر ایک طالبعلم کی طرف سے گولی چلائے جانے کی رپورٹ ملی ہے۔13نومبر کو ذوالفقار علی بھٹو ،ولی خان اوردیگر کئی اہم اپوزیشن رہنمائوں کودفاع پاکستان قوانین کی دفعہ 32کے تحت گرفتار کرلیاگیاہے۔

مغربی پاکستان میں پیش آنے والے واقعات دھماکہ خیز نوعیت کے ہیں۔اکتوبر میں کراچی میں طلبہ کے مظاہرے ہوئے۔اورپھر نومبر کے پہلے ہفتے میں تعلیمی اداروں میں مسائل کے خلاف پھر مظاہرے ہوئے۔پھر یہ بگڑتے چلے گئے اور بڑے تعلیمی اداروں تک پھیل گئے جس سے وہ بندکر دیے گئے۔ حیدرآباد کی یونیورسٹی میں صورتحال بہت خراب ہو چکی ہے۔سرحد کے کئی شہروں میں پولیس نے مظاہرین پرآنسوگیس پھینکی اور لاٹھی چارج کیا ۔یہ مظاہرے اکتوبر کے آخر اور نومبر کے شروع میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورے کے بعد ہوئے ہیں۔یوں طالبعلموں کو سڑکوں پر آنے کا جواز فراہم کردیاگیا ہے۔

یہ واقعہ 7نومبر کو راولپنڈی میں پیش آیا۔جب شہر کے سب سے قدیم ادارے گورڈن کالج جوکہ اعلیٰ تعلیم کیلئے پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہے، کے طلبہ پچھلے دنوں

افغان سرحد کے ساتھ ملحقہ علاقے لنڈی کوتل گھومنے گئے۔اور یہاں کی روایت کے مطابق وہاں سے کچھ سمگل شدہ اشیا خریدیں جو پاکستان میں کہیں اورنہیں ملتیں ۔واپسی پر کسٹمز حکام نے انہیں پکڑلیا۔اس ’نارواسلوک‘ پر گورڈن کالج کے طلبہ نے احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کر دی اور ایک جلوس کی شکل میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچ گئے تاکہ کسی ازالے کی بات کر سکیں ۔تاہم ڈپٹی کمشنر نے ان کی شنوائی نہیں کی جس پر جلوس انٹر کانٹینینٹل پہنچ گیا جہاں مسٹر بھٹو اپنے پشاور کے دورے سے واپسی پر دوراتوں کیلئے قیام پذیر تھے۔مسٹر بھٹو کو پاکستان کے مغربی حصے میں طالبعلموں کی بھرپور حمایت میسر ہے۔انہوں نے بھٹو کو گورڈن کالج میں آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنے ساتھ ہونے و الی زیادتی کے لئے اسے اپنا دکھ سنا سکیں۔اس وقت یہ طلبہ غصے میں توتھے مگر پر امن تھے۔اسی دوران جی ٹی روڈ پر واقع پولی ٹیکنیک کالج کے طلبہ کا ایک گروپ بھی بھٹو سے ملنے اور دعوت دینے کیلئے پہنچا۔یہ میٹنگ ابھی جاری تھی کہ پولیس پہنچ گئی اور لاٹھی چارج کے ساتھ ساتھ فائرنگ شروع کر دی جس سے پولی ٹیکنیک کا ایک طالبعلم ہلاک ہوگیا۔اس واقعے نے غم وغصے کو بھڑکا دیا۔ جب اس فائرنگ کی خبریں راولپنڈی کے طلبہ تک پہنچیں توانہوں نے کنٹونمنٹ اور صدر ایریا میں توڑ پھوڑ شروع کر دی۔پبلک سروس ٹرانسپورٹ پر پتھراؤ شروع کردیاگیااور اسے آگ لگا دی گئی۔**7/8**نومبر کی درمیانی رات کے وقفے کے بعداگلی صبح (اسلام آباد کے کچھ چھوٹے مظاہروں کے علاوہ جنہیں پولیس نے آسانی سے کنٹرول کرلیاتھا)راولپنڈی شہر میں ساڑھے بارہ بجے مظاہرے شروع ہو گئے مظاہروں کا زور گورڈن کالج کے علاقوں اور قریبی سیٹلائٹ ٹاؤن میں تھا۔عمارتوں کو نقصان پہنچایا گیا، زیادہ ترنشانہ سرکاری عمارتیں اورانتظامی دفاترتھے ۔ انٹرکانٹینینٹل ہوٹل اور سرکاری ملکیتی پاکستان بک شاپ کے شیشے توڑ دیئے گئے۔فوج کو بلاکر متاثرہ علاقوں میں صبح سے رات تک کیلئے کرفیولگادیاگیا۔گذشتہ روز مارے جانے والے طالبعلم کو اسلام آباد سے **70**میل دور اس کے آبائی شہر پنڈی گھیب میں سپردخاک کر دیاگیا۔اگر اسے پنڈی میںدفنایا جاتاتو پنڈی شہر ناگزیرطورپربڑے ہنگاموں کی زد میں آسکتاتھاجسے بچا لیاگیا۔

9نومبر کی اگلی صبح لوگوں کا ہجوم مری روڈپر جمع ہوا جب بھٹو ریل کے ذریعے لاہور روانہ ہورہاتھا۔سکیورٹی فورسز نے ہجوم پر فائر کھول دیا جس سے دو افراد ہلاک ہو گئے۔ اسکے بعد بظاہر راولپنڈی میں معاملات ٹھنڈے پڑ گئے۔اگلے دن کرفیومیں نرمی کر دی گئی اور فوج واپس بیرکوں میں چلی گئی۔ سرکاری اعدادوشمار کے مطابق تین ہلاکتوں کے علاوہ فائرنگ سے پانچ افراد زخمی ہوئے جنہیںہسپتال داخل کرایاگیا۔جبکہ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ یہ سب کم بتایاگیا ہے۔ان لڑائیوں میں ایک اسسٹنٹ سپریٹنڈنٹ پولیس شدیدزخمی اور نو کانسٹیبل بھی زخمی ہوئے۔کئی سفارتی گاڑیوں کو بھی نقصان

پہنچا ،ان میں ترکی کے سفیر اور ایران کے وزارتی قونصل کی کاریں بھی شامل ہیں۔ جبکہ ایک قونصل خانے کی بس اور لینڈروور بھی ان علاقوں میں پتھروں کی زد میں آچکی ہیں جبکہ ان کے مقامی ڈرائیور کو پکڑ لیا گیا۔ البتہ برطانوی پراپرٹی کو کہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔

لیکن پنڈی میں مارے جانے والے طالبعلم کی ہلاکت کے ساتھ یکجہتی کیلئے مغربی پاکستان میں کئی جگہوں پرمظاہرے شروع ہو گئے ۔8نومبر تک تو یہ پرامن تھے مگر اگلے روزرپورٹیں آئیں کہ پنجاب سندھ اورسرحد میں پرتشدد ہنگامے ہوئے ہیں۔کراچی میں مقامی مسائل کی وجہ سے پہلے ہی بے چینی تھی مگر پنڈی کے واقعے نے اسے بھڑکا دیا۔وہاں پبلک پراپرٹی کو کافی نقصان پہنچاہے جبکہ سکول' کالج یونیورسٹیاں بند کر دی گئی ہیں۔لاہور میں 8نومبر سے ہنگامے شروع ہوئے جو اگلے دن بھی جاری رہے ، یہ زیادہ تر ریلوے سٹیشن کے آس پاس کے علاقوں میں ہوئے ہیں۔جہاں لوگ بھٹو سے ملنے اور اس کے استقبال کیلئے جمع ہوئے جو پنڈی سے لاہورپہنچ رہاتھا۔یہاں بھی تعلیمی ادارے بند پڑے ہیں۔ایسے ہی مظاہرے پشاور، مردان ،چارسدہ ،نوشہرہ ،ایبٹ آباد ،ڈیرہ اسماعیل خان ،لائل پور،سیالکوٹ، کوہاٹ، سکھر،سرگودھا،گوجرانوالہ،بہاولپور سمیت مغربی پاکستان کے کئی دوسرے شہروں میں بھی ہونے کی رپورٹیں ملی ہیں۔10نومبر کوشمالی پنجاب اور سرحد کے کئی علاقوں میں مزید ہنگاموں کی اطلاعات ملیں۔مردان 'چارسدہ' کیمل پوراور نوشہرہ میں تومظاہرین نے ایوب حکومت کے خلاف سخت نعرے بازی کرتے ہوئے گاڑیوں اورریلوں پرشدید پتھراؤ بھی کیا۔ نوشہرہ میں پولیس فائرنگ سے ایک شخص ہلاک بھی ہواہے۔چارسدہ میں مشتعل عوام نے ایک شوگر مل پر قبضہ کر کے چینی برآمدکرلی (حکومت عرصے سے چینی کی قلت کا شورمچائے ہوئے تھی)۔

اب میں جناب عالی کی توجہ بھٹو اور ولی خان جو کہ نیشنل عوامی پارٹی کاصدر اور ماسکو نواز ہے،اور دیگر اپوزیشن لیڈروں کی طرف دلانا چاہتاہوں جنہیں 13 نومبر کو آئین کی دفعہ 32کے تحت گرفتار کرلیاگیا ہے۔مجھے یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ مسٹر بھٹوکی سیاسی شہرت اور مقبولیت 28اکتوبر کے اس کے سرحد کے دورے کے بعد سے انتہائی مستحکم ہو چکی ہے۔اور یہ سب حکومت کی اپنی غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے۔21ستمبر کو حیدرآباد میں بھٹونے خطاب کرتے ہوئے صدر پاکستان پر ذاتی حملے کیے جس کی وجہ سے حکومت کے غبارے سے ہوا نکلنی شروع ہو گئی۔پہلے بھٹو پر گورنر موسیٰ نے حملہ کرانے کی بھونڈی اورناکام کوشش کی اس کے بعد اخبارات میں اس کے خلاف اپنے حمایتی افراد سے خبروں کا سلسلہ شروع کرادیاگیا ہے۔غیرجانبدرانہ رائے یہی ہے کہ اکتوبر کے بعد سے بھٹو عوام میں قابل قدر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کے بعد سرحد میں اس کے دورے نے تو اس مقبولیت کو اور بھی بڑھادیا جہاں اس کا فقیدالمثال

استقبال دیکھنے کو آیا۔وہ جہاں بھی گیا لوگوں کا جم غفیر جمع ہوتاگیا اس کے باوجود کہ حکومت نے دفعہ144نافذ کر رکھی ہے جس کے مطابق پانچ سے زیادہ افراد کے اجتماع اور اسلحے کی نمائش پر پابندی عائد ہے مگر لوگوں نے اس پابندی کی پرواہ تک نہیں کی۔اور وہ لاٹھی چارج،آنسوگیس اور فائرنگ سے ڈرے بغیر استقبال کیلئے پہنچتے رہے۔

اس کامیابی کی کیا وجوہات ہیں؟ اپنے 10جولائی کے مراسلے میں پاکستان کی اندرونی سیاست کے حوالے سے میں لکھ چکاہوں کہ کون سی وجوہات ہیں کہ بھٹو کی ساکھ اورمقبولیت میں بڑھوتری ہو رہی ہے۔یہ ساکھ اور مقبولیت اس کے حکومت کے بارے میں خیالات کا نتیجہ ہے جن کا اظہار وہ اپنے عوامی جلسوں میں کرتا چلا آرہاہے۔جب وہ پشاور گیا تو اسے عوام کا مزاج آشنا قراردیاگیا جبکہ میری خود ملتان سے تیس میل دور واقع شہر خانیوال کے کچھ اساتذہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ 'بھٹوہمارا ہیرو ہے'۔سرحد کا تو یہ عالم ہے کہ وہاں کوئی بھی قابل ذکر سیاستدان اگر حکومت کی کھلے عام مذمت کرے تو عوام اسے سر آنکھوں پر بٹھارہے ہیں۔اپنی سیاسی بصیرت اور عوام کی مزاج آشنائی کی بدولت بھٹو اپنی خوبیوں سے بروقت فائدہ اٹھارہاہے۔اس نے پشاور ،کوہاٹ ،ڈیرہ اسماعیل خان اور چارسدہ میں محض حکومت مخالفت جوشیلی تقریروں سے عوام کے دل جیت لیے ،اگر وہ کسی سنجیدہ موضوع پر بات کرنا شروع بھی کرتا تو جذبات سے بھرے لوگ اسے روك دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ ایسی کیفیت پیداہو چکی ہے کہ جس سے بھٹو کو بنی بنائی مقبولیت میسر آتی چلی جارہی ہے۔نظرانداز کیے گئے علاقے سرحد کا چیمپئن بننے کے بعد بھٹو پنڈی اور پھر پنجاب کی طرف روانہ ہواتو طالبعلموں اور" بے یارو مددگار غریبوں'' پر مشتمل اس کے حمایتی سڑکوں پر اس کے استقبال کیلئے نکل پڑے اس دوران وہ ریاستی اداروں کے وحشیانہ تشدد کا شکار ہوتے رہے۔ اس کے بعد بھٹوکی گرفتاری نے تو جیسے جلتی پر تیل چھڑك دیا ہو۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حکومت مسٹربھٹوکی مقبولیت سے ڈر چکی ہے۔مجھے اس کا یقین ہے کہ مسٹر بھٹو بھی سیاسی قید یا شہادت سے گھبرانے والا آدمی نہیں۔ وہ دیکھ رہاہے اوراچھی طرح سے جان چکاہے کہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کو اس کی گرفتاری سے ،خاص طورپر اگرتلہ کیس کی شہرت کے بعد ایک ہیرو کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ حکومت میں موجود ٹھنڈے دماغ اس حقیقت سے شایداتنے بے خبر بھی نہیں لگتے۔مگروہ بھٹو کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کو زیادہ توجہ دینامناسب سمجھ رہے ہیں۔وہ اسے غدار' سازشی سمیت کیا کیا نہیں قرار دے رہے ہیں اور لگتاہے کہ کوئی الزام ایسا باقی نہیں بچا جو اس پر لگایا جا سکتاہو۔حکومت نے کھلے عام ساری ذمہ داری بھٹوپر ڈال دی۔ بھٹونے بھی مشتعل مظاہرین کو چپ کروانے کی بجائے کہہ دیا کہ" ان کی لڑائی بر حق ہے اور میں ان کے ساتھ ہوں"۔ان حالات میں حکومت کے پاس اس کے

سوا اور کوئی رستہ نہیں بچا کہ وہ مسٹر بھٹو کو گرفتار کر لے۔اگرچہ اس کا کسی کو بھی اندازہ نہیں کہ آگے اس کے ملک کی سیاسی زندگی پرکیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ۔مشرقی پاکستان میں پہلے ہی اگرتلہ سازش کیس کے حوالے سے مرکز کے خلاف منافرت شدیدہو چکی ہے۔مگر مرکزی حکومت مغربی حصے میں اپنی طاقت کو مضبوط سمجھتے ہوئے مشرقی حصے کے ساتھ اپنے خراب ہو چکے تعلقات کو کسی خاطرمیں نہیں لا رہی ۔لیکن اب حکومت کو مکمل انتشار کا سامنا ہے جو اب صرف تاشقندمعاہدے جیسے مسئلے تک ہی محدود نہیں رہاہے بلکہ یہ اس کی سبھی پالیسیوں کے خلاف اپنا اظہار کرتا جارہاہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب اور بہتر ہوگا کہ یہ خود حکومت کے وجود کے خلاف ہو چکاہے۔

1958ء کے بعدجب سے یہ حکومت تشکیل پائی ہے تب سے اب تک نفرت اور غم وغصہ کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہیں پہنچا۔ بلاشبہ حکومت کے پاس حمایت اور طاقت کے مناسب ادارے موجود ہیں جن میں سول سروسز،بنیادی جمہوریت کے حامل بلدیاتی ادارے،پولیس اور سب سے اہم فوج جو ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کی اہلیت رکھتی ہے ۔لیکن اب ایک دوسرا ابھار جو بھٹو کی گرفتاری کے بعد اور بھی سخت ہو سکتاہے حکومت کی پوزیشن کو مزید کمزورکرسکتاہے۔اور حکومت کو ہر حال میں اس قسم کی کیفیت سے بچنے کیلئے فیصلہ کن اقدامات کرنے چاہییں۔ حکمرانوں کے لیے حکمران اور محکوم طبقات میں مصالحت کرانا اورتفاوت کو کم کرنا بہت مشکل ہوچکا ہے۔مسٹر بھٹو کی گرفتاری اس عمل کو اب اور بھی مشکل بنا دے گی۔اگر یہ معاملہ نہ بھی ہو تو حکومت کے پاس ایسا نہ کوئی منصوبہ ہے نہ دانش کہ جو اس بحران پر قابو پا سکے۔مسلم لیگ بھی اب اپنی سماجی بنیادیں کھوتی چلی جارہی ہے ۔ پہلے مسلم لیگ کی قیادت حکومت کو عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی سے آگاہ کر چکی ہے اور جو بعد میں فسادات اور گڑ بڑکی صورت میں ظاہر بھی ہوئی۔صوبے اور مرکز کے مابین مصالحت کی اگر کوئی کوشش ہوتی ہے تو اس کیلئے جو سماجی رابطے انتہائی ضروری ہیں‘مجھے بتایا گیا ہے کہ صدر مملکت مسلم لیگ کی قیادت کے ساتھ اس حوالے سے اپنی ناراضگی کا اظہارکر چکاہے کہ پنڈی میں فسادات کیوں شروع ہوئے!

میں اپنے اس مراسلے کی ایک ایک کاپی نیو دہلی میں برطانوی ہائی کمشنر اور کابل میں ہر میجسٹی محترمہ سفیر صاحبہ کی خدمت میں بھی ارسال کر رہاہوں۔ جناب عالی !یہ سب میرے لیے باعث اعزاز ہے ۔ آپ کا فرمانبردار خادم ....پکارڈ“(2)

اس کے بعد پاکستان میں برطانوی ہائی کمیشن کے مشیربرائے فوجی امور نے 18نومبر کو ایک اورحساس مراسلہ روانہ کیا۔یہ مراسلہ تاریخی حوالے سے حساس‘ شمال مغربی صوبہ سرحد(پختونخواہ) میں‌پیدا ہونے والی صورتحال اور عوام کے پاکستان کی

مسلح فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے بارے میں تھا۔سرحد تاریخی طورپر پہلے بھی برطانوی راج کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش رہا جہاں کے لوگوں نے سامراجیوں کے خلاف شدید مزاحمت کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس علاقے پر کبھی نہ کنٹرول حاصل کرسکے اور نہ ہی حکمرانی قائم کر سکے ۔یہ مراسلہ پہلے کی نسبت بہت مختصر ہے، اس لیے ہم اسے بھی یہاں نقل کر رہے ہیں۔

”18نومبر1968ء

منسٹری آف ڈیفنس (DI2)

مین بلڈنگ وائٹ ہال لندنSW1

پاکستان میں گڑبڑ

(Reference:My MA/81 14 November 1968)

یہ میرے سابقہ مراسلے کا تسلسل ہے۔ہمیں فوج کے ساتھ پیش آنے والے کچھ سنجیدہ واقعات کے حوالے سے اہم رپورٹس موصول ہوئی ہیں۔

1۔ایبٹ آبادمیں ہونے والے فسادات کے دوران ایک گھرپر حملہ کردیاگیاجو پاکستان ملٹری اکیڈمی نے کرائے پرلیاہواتھا ،جس میں ایک میجرجسے 1965ء میں بہادری پر انعام دیا گیا رہائش پذیرتھا۔اس واقعے میں گھرکو تہس نہس کرکے سامان یا تولوٹ لیاگیایا اسے تباہ کر دیاگیا۔یہ گھر صدر ایوب کی ملکیت ہے۔

2۔پشاور میں آرمی میڈیکل کور کے ایک کرنل کو اس کے ڈرائیوراور اردلی سمیت لوگوں نے قابو کرلیا اور ان پر تشدد کیا۔ اس کی وردی پھاڑدی۔ایک حکم نامے کے ذریعے فوج کو کہہ دیاگیا ہے کہ پشاور شہر کے اندر وردی میں نہ جایا جائے۔ پشاور وہ شہر ہے جو عرصہ دراز سے اہم اور تاریخی فوجی مرکز چلا آرہاہے۔

3۔راولپنڈی میں پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف ایر مارشل نورخان کی سرکاری گاڑی پرپتھراؤ کیاگیاہے جسے پولیس کی بھاری نفری کی مدد سے محفوظ مقام تک پہنچایا گیا۔

4۔پنڈی میں ہی ماسٹر جنرل آف آرڈیننس میجر جنرل وصی الدین کی بیوی کو اس وقت سخت تذلیل کا سامنا کرناپڑگیا جب وہ اپنے بچوں کو سکول سے لینے گئی ۔وہ جنرل سٹاف کی سرکاری گاڑی میں سوار تھی جس کے ستارے ڈھکے ہوئے تھے۔

پشاور اور پنڈی دونوں جگہوں پر فوج کو انتظامیہ کی مدد کیلئے طلب کرلیاگیا ہے۔یہ اطلاعات سفارتکاروں کو فراہم کر دی گئی ہیں۔

(جے ڈی ڈبلیو ملر)بریگیڈیر ملٹری ایڈوائزر

کاپی برائے اطلاع:میجر جنرل جے ایم میکنیل“(3)

عوام کا ابھار

مشرقی و مغربی پاکستان کے دونوں حصوں میں موجود برطانوی ہائی کمیشن اور قونصل خانے کی طرف سے وائٹ ہال لندن روانہ کیے گئے۔اسی طرح وہاں سے ان کے لیے مناسب جواب اور ہدایات بھی دی جاتی رہیں۔تاہم ان میں سے تین مراسلے ایسے ہیں جو برطانوی سامراجیوں کے اضطراب کو نمایاں طورپر واضح کرتے ہیں۔ان میں سے پہلا ڈھاکہ میں متعین ڈپٹی ہائی کمشنر روئے فوکس کی طرف سے 20نومبر1968ء کو بھیجا گیا۔"میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ان واقعات میں ایک واضح پیغام موجود ہے کہ اگر ہم نے مشرقی پاکستان کو کمیونزم سے بچاناہے تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرناہوگا مگر ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ہمیں اس خطرے کو خود بھی سمجھنا اوراپنی دوست دنیا کو بھی بتانا ہوگا"۔(4)

تمام سفارتی لفاظی کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ روئے فوکس صاف اور شفاف انداز میں اپنے آقائوں ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے سے خبردار کررہاتھا۔دوسرا پیغام جو ایک برطانوی سفارتکار جو پنڈی میں تعینات تھا کے انقلابی تحریک کے خوف کی عکاسی کرتاہے جس نے 29 جنوری 1969ء کو لندن کو ایک واضح طور پر کھلے الفاظ میں پیغام روانہ کیا"حالت یہ ہو چکی ہے کہ کئی نوجوان آرمی افسر بھٹوکے فلسفے اور اس کی شخصیت کے طلسم میں مبتلاہوچکے ہیں،فوج کے اندرایک "نوجوان ترک مہم" شروع ہونے والی ہے جو اپنے شہریوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آرمی کا کنٹرول سنبھالنے اور اقتداربھٹوکے حوالے کرنے کے موڈ میں ہے اور اس بات کو کسی طور خارج از امکان قرار نہیں دیاجا سکتا"۔(5)

سفارتی دائو پیچ کے باوجود یہ پیغام واضح کرتاہے کہ کیا کہا اورلکھا جارہاتھا۔بھٹو کا فلسفہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔پیپلزپارٹی کے بنیادی منشور میں اسے بیان اورعام کیاجاچکاتھا جس کے مطابق انقلابی سوشلزم کے ذریعے سرمایہ داری و جاگیرداری کو اکھاڑکر پھینکا جاناتھا۔نوجوان فوجی افسروں کی طرف سے اس فلسفے کی حمایت کے آغازنے پاکستان کے حکمران طبقات اوران کے سامراجی آقائوں کے پائوں تلے سے زمین نکال لی تھی۔وہ اپنی تقریروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتا چلا جارہاتھا'وہ انقلابی سوشلزم کی وکالت کررہاتھا اوروہ جہاں جہاں جارہاتھا لوگ دیوانہ وار اس کی طرف لپک رہے تھے۔

اس سے بھی واضح تیسراپیغام مسٹر پکارڈ کی طرف سے پنڈی سے 19فروری1969ء کو بھیجا گیا تھا "برطانیہ کے معاشی و تجارتی مفادات خطرے کی زد میں آچکے ہیں۔مزید

یہ کہ ایک انقلابی صورتحال پیدا ہونے جاری ہے۔اسے مغربی بنگال کی صورتحال سے جوڑنا کسی طرح غلط نہیں ہوگا۔اور اس سے عالمی امن کو سنجیدہ خطرات لاحق ہوجائیں گے"۔(6) یہاں مسٹر پکارڈصاف طورپر مغربی بنگال کے انقلاب کو پاکستان میں آتا دیکھ رہاہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سارے جنوبی ایشیا میں سوشلسٹ انقلاب کے اندیشے سے آگاہ کررہاتھا۔اور جب وہ عالمی امن کو درپیش خطرے کی بات کرتاہے تو اس سے اس کی مراد سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام اور وجود کے خاتمے کا خطرہ ہے۔اور یہ اندیشہ اتنا غلط بھی نہیں تھا اگر انقلاب کامیاب ہوجاتاتو۔

1965ء کی جنگ کے نتیجے میں پہلے سے ہی غربت کا شکارسماج کی اکثریت کو مہنگائی اور افراط زر میں اضافے نے مزید غربت میں دھکیل دیا۔چونکہ لوگوں کو مروجہ سیاسی ذرائع سے کسی قسم کا کوئی ریلیف میسر نہیں آرہاتھااور نہ کسی نوعیت کے حقوق مل رہے تھے اور چونکہ ریاستی مشینری بدعنوان تھی اس لئے لوگوں نے ماورائے پارلیمان راستے کا انتخاب کرلیا جس میں انہیں ڈرامائی طورپر حیران کن کامیابیاں ملیں۔مغربی اور مشرقی پاکستان کے بڑے شہروں میں مزدوروں نے طالبعلموں اور بیروزگارنوجوانوں کے احتجاجی مظاہروں میں بھرپور شرکت کی جس نے تحریک کوانقلابی رنگ میں رنگ دیا۔روایتی ٹریڈیونین رہنما جو قاعدے قانون اور ادارہ جاتی پابندیوں میں محدودرہ کر ہی کچھ کرنے کے عادی تھے اور جو پہلے ہی 1963ء میں کراچی کے اندر چلنے والی صنعتی تحریک میں مزدوروں کی طرف سے رد کر دیئے گئے تھے،وہ اس بار بھی پیچھے ہی رہ گئے تھے۔جبکہ دوسری طرف اپنے ہڑتالی ایکشن کمیٹیوں جیسے سیاسی عمل میں شرکت کے ذریعے جو کہ اس احتجاجی انقلابی تحریک کے دوران قائم ہوئی تھیں ، انقلابی نوجوان جوکہ ابھی تک صرف طلبہ سیاست تک ہی محدودچلے آرہے تھے ،لیبر اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے عرصے میں ایک اہم عنصر کے طورپر ابھرکر سامنے آئے تھے،وہ مزدوروں کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ مقصد کیلئے سرگرم عمل ہو گئے۔پرجوش طلبہ اورمزدور تنظیموں کایہ تال میل پہلے بھی 1963ء کی تحریک میں ایک ساتھ کام کرچکاتھا۔ مگر 1968/69ء کے سیاسی عمل اوراس عمل میں ان دونوں کے باہمی تعامل نے تنظیمی شعور اور تحریکی جذبے کے معیار کوہی بدل کے رکھ دیا۔اس جڑت نے کئی جگہوں پر نئی لیبر تنظیمیں بھی قائم کیں جن کے سیاسی اہداف و مقاصدزیادہ واضح، زیادہ بلنداورزیادہ سماجی وانقلابی تھے ۔اور جو محض اجرتوں کیلئے مصالحت کرنے والی تنظیموں اور قیادتوں سے کہیں بہتر کہیں آگے تھیں۔طلبہ مزدوروں کے درمیان باہمی تنظیمی جڑت کا موازنہ دوسرے ملکوں کی تحریکوں کے ساتھ کیا جاسکتاہے مثال کے طورپر 1945/47ء کے دوران مصر میں طلبہ اور مزدوروں نے ایک ساتھ مل کر سامراجی جبر اور مقامی استحصال کے خاتمے کیلئے تحریک چلائی تھی۔

طلبہ بغاوت کے شعلے

دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان میں چلنے والی اس تحریک کی پہلی چنگاری بھی طلبہ کے گرم جوش وجذبے سے ہی نکلی تھی۔نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن NSF پاکستان کی مرکزی بائیں بازو کی طلبہ تنظیم تھی جو دراصل 1953ء کی تحریک کے دوران تشکیل دی گئی تھی مگر بعد ازاں اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ 1950ء کی دہائی میں اور طلبہ تنظیمیں بھی تھیں جن میں ہائی سکول سٹوڈنٹس فیڈریشن اور گرلز سٹوڈنٹس کانگریس شامل تھیں جو بعد میں گرلز سٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں ڈھل گئی تھی۔اس کے سرگرم ارکان میں زاہدہ تقی،حمزہ باجی،راحت شکور،زرینہ صالحہ،ملکہ حسین اور دیگر شامل تھیں ۔1958ء میں ایوب آمریت کے تسلط کے بعد NSF(نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن) پر اس کی طلبہ میں بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے انقلابی سوشلزم پر عمل پیرا ہونے کی بنا پر پابندی لگا دی گئی۔1959ء میں امریکی صدر آئزن ہاور نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اس کے دورے کا آخری پروگرام کراچی میں تھا اور پھر اسے واپس امریکہ چلے جانا تھا۔NSF نے امریکی صدر کی آمد پر مظاہرے کا پروگرام تشکیل دیا اگرچہ اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی مگر یہ منصوبہ حکومت کے علم میں آگیا۔مظاہرے سے ایک رات قبل معراج محمد خان اور دیگر طلبہ قائدین گرفتار کر لیے گئے ،یوں یہ مظاہرہ نہ کیا جاسکا۔طلبہ نے ایک اور اہم مظاہرہ 1961ء میں کانگو کے بائیں بازو کے وزیر اعظم پیٹرس لوممبا کے قتل کے حوالے سے کیاتھا۔اس کا اہتمام بھی NSF نے کیاتھا۔اس مظاہرے پر حکومتی پریس اور خاص طورپرجماعت اسلامی نے خاصی لے دے کی اور کہا کہ یہ مظاہرین جبل پور بھارت میں مسلمانوں کے قتل کو بھول گئے ہیں۔دودنوں کے بعد NSF نے جبل پور میں غریب مسلمانوں کے قتل عام کے خلاف پھر مظاہرہ کیا۔یہ سبھی مظاہرے پرجوش تھے اور کراچی کے سبھی کالجوں میں پھیل گئے۔اس دوران کراچی یونیورسٹی میں ہڑتال بھی ہوئی۔ریاست نے اس پر رد عمل کرتے ہوئے سبھی طلبا رہنمائوں کو گرفتار کرلیا۔پندرہ طلبہ رہنمائوں پر ملٹری قوانین کے تحت مقدمہ چلایاگیا جن میں سے پانچ کو رہا کر دیاگیا جبکہ معراج محمد خان سمیت باقیوں کے کراچی شہر میں داخلے پر نو ماہ کی پابندی عائد کر دی گئی۔ان دنوں نوجوانوں پر ریاستی جبر کے خلاف حبیب جالب کی نظم بہت مشہور ہوئی۔

جن جوانوں نے اپنا لہو اچھال دیا
ستمگروں نے انہیں شہر سے نکال دیا

ایک شہر سے بے دخل کرنے کے بعد ان طلبہ رہنمائوں کو دوسرے شہروں میں جانے

اور اپنا پیغام پھیلانے کا موقع میسر آگیا۔اس دوران انہیں ہر بڑے شہر میں جانے اور وہاں کے طلبہ کے دلوں میں انقلابی جو ش و جذبہ بیدار کرنے کا موقع ملا۔ 1963ء میں کراچی کی عام ہڑتال کے دوران NSF نے سرگرم کردار ادا کیا اور اس دوران ریلوے،کے ای ایس سی،شپ یارڈ سمیت سائیٹ اور لانڈھی کے صنعتی مزدوروں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔12ستمبر1962ء کو ایک اور اہم واقعہ ہوا۔جب ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ نے پولوگرائونڈکراچی میں بڑے جلسہ عام کا اعلان کیا ۔ایک بہت بڑا سٹیج تیار کیاگیاجس میں وزراسمیت لیگ کے اہم رہنمائوں کی شرکت متوقع تھی۔ NSF کے سرگرم کارکن سٹیج پر چڑھ گئے جس سے کاروائی میں خلل پڑگیا۔ان طلبہ نے ایوب خان کے رجعتی وزیر چوہدری خلیق الزمان کو سٹیج سے نیچے پٹخ دیا۔جس کے نتیجے میں لڑائی شروع ہوگئی۔ذوالفقار علی بھٹو بھی اس وقت سٹیج پر موجودتھاجو اس وقت کنونشن مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری تھا ۔اور اس کی بھی NSF والوں کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی ۔اس واقعے کے بعد کئی طلبہ کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیاگیا۔تاہم اس سرکشی کے بعد ان کے کئی مطالبات تسلیم کر لیے گئے جن میں بیچلر کی ڈگری کو تین کی بجائے دو سال میں کرنے ، سبھی تعلیمی اداروں میں فیسوں میں کمی سمیت کئی دوسرے مطالبات شامل تھے۔1964ء کے صدارتی الیکشن میں NSF نے ایوب کے خلاف فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔1965ء میں کراچی میں گل رعنا کلب میں ہونے والا کنونشن تاریخی اہمیت کا حامل تھا ۔اس میں NSF دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی ان میں سے ایک ماسکو نواز دھڑا معراج محمد خان کی قیادت میں جبکہ دوسراپیکنگ نواز دھڑا کاظمی کی قیادت میں قائم ہو گیا ۔

NSF نے 1968/69ء کے طلبہ احتجاج میں مرکزی کردارادا کیاتھا اورپیپلزپارٹی کی حمایت کی تھی۔جبکہ 1970ء کے الیکشن میں یہ پیپلز پارٹی کی حمایت سے دستبردار ہو گئی اورالیکشن کے بعد بھٹوکی طرف سے پارٹی سیاست میں اصلاح پسندانہ پوزیشن اختیار کر لینے پر اور ریاستی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن جانے پر اس کے خلاف ہو گئی۔1968/69ء کے انقلاب کے دوران پنجاب یونیورسٹی طلبہ سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی جہاں دوسری تنظیموں کے ساتھ ساتھ نیشنل سٹوڈنٹس آرگنائزیشن(NSO) اسلامی بنیادپرستوں کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ان دنوں بنیادپرست انتہائی کمزور تھے جبکہ بایاں بازو انتہائی موثراور متحرك تھا۔تاہم طلباء یونین کے انتخابات میں بائیں بازو کے اتحادکے مشترکہ امیدوار کومخالف بنیاد پرستوں کے امیدوارکے مقابلے میں 162ووٹوں سے شکست ہو گئی۔یہ شکست بنیادپرستوں کی طاقت کا نہیں بلکہ بائیں بازو کی باہمی تقسیم کا نتیجہ تھی۔سچ یہ ہے کہ کامیابی کے باوجود بنیاد پرست کیمپس پر کنٹرول نہیں کر سکے تھے۔

اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں طلبہ تحریک کے سرگرم رہنما امتیاز عالم نے کتاب کے مصنف سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ”یہ ایک شاندار عہد تھا،جب ہر طالب علم دیگر کلاسیکل لٹریچر کے ساتھ ساتھ مارکس ،لینن ،مائوزے تنگ،ٹالسٹائی اور دوسرے ترقی پسند مصنفین کو ذوق و شوق سے پڑھ رہا تھا ۔ہر طرف طلبہ کے مابین بحث مباحثے ہورہے ہوتے تھے۔ہردوسرے دن طلبہ حقوق کیلئے اور ایوب حکومت کے خلاف مظاہرے معمول بنے ہوئے تھے۔احتجاج ایک باقاعدہ معمول بن چکاتھا۔ہر آدمی انقلاب کے رومانس کا اسیرہوچکاتھا۔

”مجھے اب بھی یونیورسٹی میں اپنا آخری دن یاد ہے۔ہم کوئی ساٹھ ستر کے قریب طلبہ الوداعی تقریب کے سلسلے میں ایک کھلے گرائونڈمیں اکٹھے تھے۔ہم نے جوشیلے انداز میں انقلابی تقریریں کیں۔آخرمیں ہم نے مزدوروں کاعالمی گیت انٹرنیشنال گایا۔ہم نے اپنی ڈگریاں پھاڑ دیں اور یہ فیصلہ کیا کہ یہاں سے ہم اپنے اپنے گھروں کو جانے کی بجائے کارخانوں اورکھیتوں کھلیانوں میں جاکر انقلاب کیلئے کام کریں گے“۔(7) ایوب خان کے خلاف تحریک کارخانوں‘کھلیانوں میں پھیل گئی۔”یونیورسٹی میں احتجاجی مظاہروں کے بعد اسے غیر معینہ مدت کیلئے بند کردیاگیا۔ہاسٹلوں کو زبردستی خالی کرالیاگیا۔یہاں سے جانے کے بعد طلبہ اپنے اپنے علاقوں میں پھیل گئے اور جدوجہدشروع کرتے ہوئے مزدوروں‘کسانوں سے مل کر انقلاب کا پیغام پہنچانے لگے“(8)

یہ سب پرجوش طلبہ مزدور اور کسان ایک متبادل تنظیم کی جستجو میں تھے جس کے ساتھ چل کر انقلاب ممکن بنایا جاسکتا۔ 1968/69ء کی تحریک کے دوران ان کا دیگر سرگرم مزدوروں بالخصوص کسی انقلابی رحجان سے وابستہ مزدور رہنمائوں کے ساتھ تعلق استوار ہوچکاتھا۔پرجوش دکانوں پر کام کرنے والے مزدور اور طالبعلم رہنمامزدوروں کے شعبے میں انتہائی متحرك ہوچکے تھے۔

1967ء کی ریلوے ہڑتال ،انقلاب کا نقطہء آغاز

1960ء کی دہائی میں محنت کشوں کے لیے ایوب خان آمریت کی طرف سے مسلط کردہ صنعتی تعلقات کے نظام کے تحت‘ جو ریاستی قاعدے قانون کی پیچیدگیوں کا شکار تھا‘ انصاف اور فوری نتائج کا حصول بہت مشکل ہوگیا تھا۔وہ مزدور رہنما جو عدالتوں کے طویل ‘صبر آزما اور تھکا دینے والے عمل سے اکتا چکے تھے،ایسے رستے اور وسیلے کی جستجو میں تھے جن سے مسائل کا براہ راست اور جلدحل ممکن ہو سکتا۔خاص طورپر جب انہیں نیچے سے مزدوروں کی طرف سے کافی دبائو ہوتاتھا کہ مسائل کو جلد ی سے حل کیا جائے۔ایسے مزدور رہنما جو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو نہیں بدل رہے

تھے ، وہ مزدوروں کے اندر بڑھتے ہوئے جوش و جذبے اور انقلابی شعور کے ہاتھوں استرداد کا شکار ہورہے تھے اور اپنی ساکھ اور حمایت سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔پیچیدہ‘ طویل لیبر قوانین اور ان پر حکومتی گرفت کی وجہ سے مروجہ سماجی ڈھانچے کے معیارات اور اقدار محنت کشوں کے کسی کام نہیں آرہے تھے اوران کو سہولت فراہم کرنے کی بجائے ان کے عذاب میں اضافہ کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس تحریک نے ان قوانین کو چیلنج کر دیا تھا اور معاملات ان قانونی جکڑبندیوں سے باہر نکل گئے تھے۔ان حالات میں جو ہورہا تھا ان میں ایک بڑا واقعہ جس نے **1968/69**ء کے انقلاب کی بنیاد کو استحکام بخشا وہ جنوری **1967**ء کی ریلوے کی شاندار ہڑتال تھی جو **13**دنوں تک جاری رہی تھی۔ ان دنوں ریلوے میں دائیں بازو کی دو رجعتی یونینیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک ریلوے مزدور یونین کی قیادت ایم اے رحیم کررہاتھا ،جبکہ اوپن لائن پر ریلوے یونائٹڈیونین (سی بی اے)کی قیادت عمر دین کے پاس تھی۔جبکہ بائیں بازو کی واحد یونین ریلوے ورکرزیونین تھی جس کا قائد مرزا ابراہیم تھا۔یہ ریلوے ہڑتال مزدوروں کی طرف سے اوقات کار کے دوران سپیشل راشن ڈپو قائم کرنے کے مطالبے پر کی گئی تھی۔اس مطالبے کو حکومت نے مسترد کردیاتھا۔جس کے بعد ریلوے میں آزادانہ طور پر کمیٹیاں تشکیل پانا شروع ہو گئیں۔ہڑتال کی اپیل ایک سے دوسرے مزدور تک زبانی طور پر پہنچا ئی گئی۔تھوڑی سی تعداد میں لیفلیٹس شائع کیے جا سکے تھے۔جب ہڑتال شروع ہوئی تو ریل کا ایک ڈبہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔پرانے ٹریڈ یونینسٹوں نے کہا کہ ہم نے برصغیر کی تاریخ میں ریلوے کی ایسی ہڑتال نہ کبھی دیکھی نہ سنی ۔رجعتی یونینیں تو اس ہڑتال کی حمایت نہیں کر رہی تھیں مگر مرزا ابراہیم کی یونین اپنے پیکنگ نواز ہونے اورحکمران ایوب خان کے مائو کے ساتھ قریبی تعلقات اور چینی افسر شاہی کی پاکستانی حکومت کی حمایت کی وجہ سے اس ہڑتال کی قیادت نہیں کر رہی تھی۔وزیر محنت احمد سعید کرمانی نے مرزا ابراہیم سے رابطہ کرکے اسے مزدوروں اور حکومت کے مابین مصالحت کرانے کا کہا۔مرزا نے ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ہڑتال کو ختم نہیں کراسکا۔حکومت نے اس ناکامی پر مرزاکو گرفتار کرلیا اور اس کے ساتھ ہی ریلوے مزدوروں پر جبر واستبداد شروع کر دیا گیا۔ حیدرآباد میں ریلوے مزدور پٹڑیوں پر لیٹ گئے تاکہ کچھ غداروں کی طرف سے ریل چلانے کی کوشش کوناکام بنا دیاجائے مگر ریل چلا دی گئی جس سے دو مزدور ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے۔حکومت نے بیشتر مطالبات تسلیم کرلیے اور ہڑتال ختم کردی گئی۔اس ہڑتال کے نتیجے میں مزدوروں کی نئی تازہ دم قیادت ابھر کے سامنے آئی جوکردار اور معیار میں پہلے والی سرکاری وغیرسرکاری قیادت سے آگے نکل چکی تھی۔ایک کمزوری جو اس ہڑتال کے ضمن میں سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اسے دیگر اداروں اور شعبوں کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکا۔مگر جو بہتر بات اس سے سامنے آئی وہ یہ تھی کہ مزدوروں کو اپنی لامتناہی

طاقت کا ادارک ہو گیا اورانہیں اپنی اہلیت کا بخوبی اندازہ ہوگیا جس نے ایوب حکومت کو ہلا کے رکھ دیاتھا۔

ایوب حکومت کو ایک سنجیدہ مسئلہ درپیش تھا جس سے حکمران نکلنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ایوب خان کسی طرح اپنی فوجی حکومت کی شکل وصورت کو بدل کراپنی حکمرانی کواب جمہوری لبادہ پہنانا چاہتاتھا تاکہ اسے قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کیا جاسکے۔اس کیلئے ”بنیادی جمہوریت “کا رستہ نکالا گیا۔یہ سکیم 1959ء میں متعارف کرائی گئی اور اس کے تحت 80000ارکان براہ راست منتخب کر لیے گئے۔ جس میں سے آدھے مشرقی اور آدھے مغربی پاکستان سے تھے۔ایوب کا خیال تھا کہ اس طریقے سے اتنی تعداد میں اپنی مرضی کے نمائندے منتخب کرواکر وہ سیاست کو اپنے قابو میں کرنے کے قابل ہو جائے گا۔امریکہ نے اس منصوبے کیلئے ایوب کو خطیر رقم سے نوازا۔ایوب خان نے ان نئے منتخب ارکان سے اعتماد کا ووٹ لے لیا۔اعتماد کے اس ووٹ کے حوالے سے منتخب ارکان سے سوال کیا گیا تھا کہ ”کیا آپ کو صدر فیلڈ مارشل ایوب خان (ہلال پاکستان،ہلال جرات) پر اعتماد ہے؟“ ۔سبھی ارکان نے ”ہاں“ کر دی۔یوں صدر ایوب نے 1960ء میں پاکستان کے پہلے نومنتخب صدر کا حلف اٹھایا ۔ایک نیا آئین تیار کیا گیا وہ بھی اس انداز سے کہ سبھی اختیارات صدر کے پاس مرکوز ہوگئے۔بعد ازاں انہی بنیادی جمہوری ارکان کے ذریعے ایک پارلیمنٹ بھی منتخب کرالی گئی۔ لیکن یہ سبھی حیلہ سازیاں اور دھوکے اس وقت دھرے کے دھرے رہ گئے جب تحریک پھوٹ پڑی۔بھٹو تحریک سے پہلے ہی حکومت کے خلاف میدان میں آچکا تھا۔اس نے تاریخ کے دیے گئے موقعے کو اپنی گرفت میں کرلیا تھا۔ہم پہلے ہی سفارتی مراسلوں کی شکل میں بتا چکے ہیں کہ 7نومبر 1968ء کو پنڈی میں عبدالحمید کی شہادت کے بعد جنم لینے والی تحریک میں اس کی مقبولیت کس قدر وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی تھی۔

طوفانی واقعات کی ابتدا

سٹینلے والپرٹ نے انقلابی تحریک میں بھٹو کی مداخلت کے بارے میں لکھا ہے ”ذوالفقار علی بھٹو پنڈی کی طرف روانہ ہوا جہاں مصطفیٰ کھر اور ممتاز بھٹو اس کا انٹر کانٹینینٹل ہوٹل میں انتظار کر رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبہ کو ہوٹل کے لان سے پولیس نے بھگا دیا تھا جن کی بڑی تعداد قریبی گورڈن کالج سے آئی ہوئی تھی۔پنڈی وہ شہرتھا جہاں جی ایچ کیو واقع تھا۔چنانچہ جلسہ اور اجتماع کسی طور بھی پسندیدہ عمل نہیں تھا اور وہ بھی اس دن جس دن روسی انقلاب کی سالگرہ ہو“۔

”میں جب مال روڈ پہنچا تو سارا علاقہ آنسو گیس کی شیلنگ کی وجہ سے دھوئیں

سے اٹا ہوا تھا۔ میرے پہنچنے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھٹو کو پولی ٹیکنیک کالج سے فون آیا کہ وہاں پولیس نے فائرنگ کر دی ہے جس سے ایک طالبعلم عبدالحمید کی موت واقع ہو گئی ہے۔مجھے بتایا گیا کہ طالب علم اس کی لاش ایوان صدر تک لے جانا چاہ رہے تھے اور وہ چاہ رہے تھے کہ بھٹو اس جلوس کی قیادت کرے"۔(9)

راولپنڈی میں اپنے فقیدالمثال استقبال کے بعد بھٹو ریل کے ذریعے لاہور کے تاریخی سفر پہ روانہ ہوا۔راولپنڈی کے طالبعلم رہنما اس سفرمیں اس کے ساتھ تھے۔اس سفر کے دوران ہر سٹیشن پرہزاروں لوگ بھٹو کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بیتابی سے اس کے منتظر تھے۔سٹینلے،حکومت کی طرف سے پنڈی سے نکال دیے جانے کے بعد بھٹو کے تاریخی شہرلاہور پہنچنے کا احوال بیان کرتا ہے"وہ دو سال سے زائد عرصے بعد لاہور آیاتھا،اس عرصے میں وہ چپ رہاتھا مگر اس کا استقبال ایک لاکھ یا شاید اس سے بھی زیادہ نوجوانوں نے کیا۔ہر طرف سر ہی سر تھے جو ایک دوسرے کے اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ کسی طرح بھٹو کی ایک جھلک دیکھ سکیں"۔(10) 13/14نومبر کی شب پاکستان کے سبھی بائیں بازو کے رہنما بھٹواور ولی خان سمیت گرفتار کرلیے گئے ۔اس حکومتی اقدام نے صورتحال کو مزید بھڑکا دیا۔وکلاء نے 15نومبر کو احتجاج کیا ۔19نومبر کو کراچی لاہور سمیت ملک کے سبھی چھوٹے بڑے شہروں میں ہائیکورٹ بار کی جانب سے ہڑتال اور مظاہرے کیے گئے۔نومبر کے آخرمیں ایک عام ہڑتال نے پنڈی شہرکو مفلوج کر کے رکھ دیا،اس روز پولیس سارادن طلبہ اور مزدوروں کے ساتھ لڑائی کرتی رہی جبکہ فوج ایک طرف بیرکوں میں بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی 7دسمبرکو ڈھاکہ میں عام ہڑتال نے شہر کو جام کر کے رکھ دیا ۔یہاں پولیس نے نوجوانوں کے خون سے شہر کو سرخ کردیا۔اس واقعے کے خلاف بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مولانابھاشانی نے جس کی نیشنل عوامی پارٹی (نیپ)مائوسٹ فلسفے کی حامل تھی ، وسط دسمبر میں سارے مشرقی پاکستان میں مکمل عام ہڑتال کا اعلان کردیا۔مجیب کی عوامی لیگ نے بھاشانی کی کال کی حمایت کردی۔اوریوں مشرقی پاکستان کی ہر دکان کا دروازہ بندکردیاگیا۔ایوب کو پتہ چل گیا کہ اس کے دن گنے جا چکے ہیں ۔وہ پبلک مقامات پرجہاں کہیں بھی جاتا اسے یا تو گولی یاپھر بپھرے ہوئے لوگوں کی گالی سننے کو ملتی۔ اس کی صحت جواب دیتی چلی گئی۔اسے اس بات کا تو یقین تھا کہ اس کی فوج بھارت کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہے البتہ وہ یہ ضرور سمجھ رہاتھا کہ یہ ملک کے اندر جاری گلیوں سڑکوں پر شورشرابے اورفسادات کا بھرپور توڑ کر سکتی ہے اور اس کے سیاسی مخالفین کا قلع قمع بھی کر لے گی۔مگر وہ الٹ اور غلط سوچ رہاتھا اس کی فوج بھارت کے ساتھ تو لڑ سکتی تھی مگر ایک انقلابی سرکشی پر اترے ہوئے عوام کا مقابلہ کسی بھی فوج کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی۔ایوب کی بدقسمتی یہ تھی کہ جس فوج کو وہ

اپنے کسی کام لا سکتاتھا ،وہ اس کے کسی کام نہیں آسکتی تھی،اگر وہ اس انقلابی کیفیت میں اسے کام لانے کی کوشش کرتاتو یہ ٹوٹ جاتی۔

28نومبر کوپیپلز پارٹی اور نیپ نے مشترکہ احتجاج کیا اور جلسے اور مظاہرے منظم و متحرک کیے۔8دسمبر کو ایوب نے ڈھاکہ کا دورہ کیا جہاں طلبہ نے اس کے خلاف مظاہرے کیے۔پولیس فائرنگ سے کئی طلبہ ہلاک اور زخمی بھی ہوئے۔10دسمبر کو فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کی جانب سے ملک گیرہڑتال کی گئی۔جبکہ13دسمبر کو مشرقی پاکستان کو عام ہڑتال نے جام کر کے رکھ دیا۔ایوب خان اپنی ڈائریوں میں اس وقت کے حوالے سے لکھتاہے''آج رپورٹس موصول ہوئی ہیں کہ بہت سے شہروں میں طلبہ اور غنڈہ عناصر کی طرف سے ہنگامے کیے گئے ہیں۔یہ لوگ مسلح تھے اور لوٹ مار کررہے تھے۔مسلم لیگ اور فیملی پلاننگ کے دفاتر کو انہوں نے اپنا ٹارگٹ بنایاہواتھا۔جو بات قابل تشویش ہے وہ یہ کہ دس سے بارہ سال کی عمر کے سکول طلبہ بھی اس فساد میں شریک ہونا شروع ہو چکے ہیں''۔(11) ایوب خان کو نیچے سے عوام کی ناقابل واپسی سرکشی اچھی طرح محسوس ہونی شروع ہو گئی تھی اس کے بقول''کاروں اور دیگر گاڑیوں کو سنگسار کیا جانے لگا ہے دکانیں لوٹی جا رہی ہیں۔ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک قافلے کو روک کر اسے مارا پیٹا گیاجس پر اپنے دفاع میں انہیں گولیاں چلانی پڑیں جس سے کئی افراد زخمی ہوگئے''۔''بھاشانی اور اس کے پیروکاروں نے مسلسل مکمل ہڑتال کی ہے۔اس دوران ڈھاکہ اور نارائن گنج میں دفعہ144لگا دی گئی تاہم بھاشانی نے بعد از نماز ظہر اسے توڑنے کا فیصلہ کیا ،جب پولیس افسران اسے روکنے میں ناکام رہے تو اس پراور اس کے اجتماع پر رنگین پانی پھینک دیاگیا۔جس پر وہ پسپا ہونے اور بھاگنے پر مجبورہو گئے''۔(12) 20جنوری1969ء کو ڈھاکہ میں ایک کمیونسٹ طالبعلم رہنما اسد پولیس فائرنگ سے ہلاک کردیاگیا۔اس قتل نے سارے ملک میں طلبہ کے جوش جذبے کو اور بھی بھڑکا دیا۔ 21جنوری کو لاہور میں ڈاکٹروں نے اپنا پہلااحتجاج کیا۔اسی لاہور شہر میں24جنوری کو عام ہڑتال کی گئی شہر میں 24گھنٹوں کیلئے کرفیو لگا دیاگیا اور فوج کوبلالیاگیا تاکہ لوگوں کوکنٹرول کیا جاسکے۔تاہم ہر جگہ طلبہ اور ہزاروں لوگ اس کرفیو کے خلاف باہر نکلے اور مظاہرے کیے۔

مشرقی پاکستان میں ناباکمار انسٹیٹیوٹ کا نہم جماعت کا ایک طالبعلم مطیع الرپولیس فائرنگ سے ہلاک ہوا۔جس پر ڈھاکہ میں مشتعل طلبہ اور عوام نے دو سرکاری اخبارات کے دفاتر جلاڈالے کیونکہ وہ عوام کے خلاف لکھ رہے تھے۔یہ دونوں ''مارننگ نیوز''اور دینک پاکستان''ڈھاکہ سے شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے روزنامہ پیغام کے دفتر کو بھی تباہ کردیا جس کا مالک مشرقی پاکستان کا گورنر منعم خان تھا۔ 25جنوری کو کراچی میں شدید مظاہرے ہوئے جس میں کئی بسیں جلا دی گئیں،یہاں کرفیو لگا دیا گیا۔

26جنوری کو ڈھاکہ اور نارائن گنج میں لوگوں نے کرفیو توڑ دیا اور فائرنگ سے تین شہری ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد لوگوں نے بنیادی جمہوریت کے ممبروں پر حملہ کردیا۔کراچی میں کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی(KDA) کے دفتر پر حملہ کرکے اسے نذرآتش کردیاگیا۔کراچی کے ساتھ ساتھ لاہور'گوجرانوالہ' ڈھاکہ سمیت کئی شہروں میں کرفیو لگادیاگیاا ور اس کے اوقات میں اضافہ کردیاگیا ۔ڈاکٹر مبشر حسن نے ان انقلابی واقعات کا تفصیل سے ذکرکرتے ہوئے اپنی کتاب"پاکستان کے بحران اور ان کا حل" میں لکھاہے۔

"14فروری1969ء کو ریلوے ،واپڈا،اور رکشہ ٹیکسی یونین نے لاہور میں ہڑتال کر دی اور مظاہرہ کیا۔ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈیونینزنے اپنے معاشی مطالبات پیش کیے جن میں مزدوروں کی اجرتوں میں اضافے سمیت کئی مطالبات شامل تھے۔17فروری کو ملتان میں پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔19فروری کو لاہور میں 30 ٹریڈیونینوں نے مل کر مظاہرہ کیا۔20فروری کو اوورسیروں پر مشتمل سرکاری ملازمین نے اپنے مطالبات کے حق میں لاہور میں مظاہرہ کیا۔ 21فروری کو ویسٹ پاکستان سیکرٹریٹ کے سبھی کلرکوں نے ہڑتال کر دی اور اپنے مطالبات پیش کیے۔23فروری کو روڈٹرانسپورٹ ورکروں نے مظاہرہ کیا جس میں ہسپتالوں اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے مزدور بھی شریک ہوگئے۔24فروری کوٹرانسپورٹ مزدوروں نے ایک اور مظاہرہ کیا جبکہ اسی روز بہاولپورمیں اساتذہ نے بھی مظاہرہ کیا"۔

" 13مارچ کو گجرات میں قائم باسکو فیکٹری میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی جو تیرہ دن چلتی رہی۔ 4مارچ کو ڈاکخانے کے مزدوروں نے ہڑتا ل کر دی یہ بھی تیرہ دن چلی۔اسی دن ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے دوہزار مزدوروں نے ایک دن کی مکمل ہڑتال کر دی۔5مارچ کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کے دس ہزار مزدوروں نے ہڑتال کر دی جو پانچ دن جاری رہی۔6مارچ کو لاہور میں ریلوے مزدوروں نے ہڑتال کی اور مظاہرہ بھی کیا جس میں ایوب کی حمایت کرنے والے ایک شخص کو مظاہرین نے مارمارکے ہلاک کردیا"۔

"7مارچ کو نیشنل بینک کے ملازمین نے ہڑتال کردی جبکہ ریلوے کے مزدوروں نے مظاہرہ کیا۔ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈیونینز نے ایک بہت بڑی ریلی نکالی۔ 8مارچ کو کراچی میں اساتذہ نے ریلی نکالی ،دیگر اداروں کی بڑی ریلیاں بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئیں۔9مارچ کو واپڈا کی سنٹرل ہائیڈرو یونین نے ایک مظاہر ہ کیااور اپنے مطالبات پیش کیے جن میں‌سب سے بڑا مطالبہ کم از کم تنخواہ150روپے مقرر کرنے کا تھا۔اس دن پہلی بار بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کا مطالبہ سامنے آیا۔اسی دن ایسٹرن فیڈرل یونین (انشورنس کمپنی)کے ملازمین نے بھی ہڑتال کا اعلان کیا ۔ 11مارچ کو واپڈا کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور ایک ریلی نکالی۔اسی روز ٹیلی کمیونیکیشن کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی جوآٹھ دن جاری رہی۔جبکہ اسی دن کراچی میں

5000اساتذہ نے ریلی نکالی جس میں ڈاکخانے کے کلرک اور ڈاکیے بھی شریک ہوگئے۔ 12مارچ کو ٹیلیفون آپریٹروں نے ہڑتال کر دی۔13مارچ کو ٹیلی کمیونیکیشن کے مزدوروں نے مظاہرہ کیا جس کے بعد انجینئرنگ سٹاف نے بھی اپنے ساتھی مزدوروں کے ساتھ یکجہتی کرتے ہوئے ہڑتال کر دی۔14مارچ کو طویل فاصلوں پر کام کرنے والے آپریٹروں نے بھی ہڑتال کر دی۔15مارچ کو نیشنل بینک اور گرینڈلیز بینک نے ہڑتال کر دی۔17مارچ کو لاہور میں بیس ہزار سے زائد پرائمری سکول اساتذہ نے ایک میل لمبا جلوس نکالا جس میں پنجاب کے 12اضلاع سے ٹیچر ز شریک ہوئے ۔18مارچ کو جوائنٹ لیبر کمیٹی کی کال پر ملک بھر میں 25لاکھ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ 19مارچ کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کے 6000 مزدوروں نے کوئی نوٹس دیئے بغیر ہڑتال کر دی۔21مارچ کو انڈیا فلورملز اور کراچی سٹیم رولرز ملز کے مزدوروں نے ملوں کا کنٹرول سنبھال لیا اور انہیں چلانے کیلئے کمیٹیاں تشکیل دےُ دیں۔اسی روز اکائونٹس ڈیپارٹمنٹ کے 20000 مزدوروں نے ہڑتال کردی ۔ 21مارچ کوہسپتالوں کے گریڈ 4کے ملازمین نے ہڑتال کردی۔اس سارے عرصے کے دوران مشرقی پاکستان میں گھیرائو کے 24واقعات پیش آئے جن میں مزدوروں نے کارخانوں پر قبضے کرکے ان کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔اس کے ساتھ ہی کئی سرکاری و نیم سرکاری دفاترپر بھی قبضے کر لیے گئے اور اپنے مطالبات تسلیم کرائے گئے۔25مارچ کو جوائنٹ لیبر کونسل نے مزدورمطالبات کا ہفتہ منانے کا اعلان کردیا“۔

”اس ساری تحریک کے دوران کل239افراد ہلاک ہوئے جن میں سے 196مشرقی پاکستان جبکہ 43مغربی پاکستان میں ہلاک ہوئے۔ تفصیلات کے مطابق ان میں پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی تعدا دمغربی پاکستان میں 41اور مشرقی پاکستان میں88تھی اور ان میں زیادہ تر طالبعلم تھے“۔(13)

ایوب نے اتوار 9مارچ1969ء کے دن کی اپنی ڈائری میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھاہے ”صوبے میں لا اینڈ آرڈر کی صورتحال انتہائی بگڑچکی ہے۔لگتاہے کہ یہ کبھی تھی ہی نہیں،سول انتظامیہ مکمل ناکام ہو چکی ہے۔فسادی عناصر سے ہٹ کر ،کمیونسٹ غنڈے اور دہشت گرد بھاشانی کے بھڑکانے پر تھانوں کو،مسلم لیگیوں کے گھروں اورجائیدادوں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں اوربلدیاتی اداروں کے سربراہوں اور ارکان سے مستعفی ہوجانے کا کہہ رہے ہیں“۔”ان حالات کو دیکھتے ہوئے بہت سے سول افسران اپنی ملازمتیں چھوڑ چکے ہیں۔یہی حال لوکل رینٹ کلیکٹروں کا ہے جبکہ ان کا ریکارڈ جلا دیاگیا ہے“۔”ان مزدوروں نے بھی ناک میں دم کرر کھاہے اور وہ مسلسل مظاہروں پر مظاہرے

کیے جا رہے ہیں ،جس کا اثر پیداوار پر پڑرہاہے۔سرمایہ کاری ختم ہو کے رہ گئی ہے۔سٹاک مارکیٹ بیٹھ چکی اور سرمایہ ملک سے باہر منتقل کیاجاچکاہے۔آنے والے دن پاکستان کیلئے بہت برے ثابت ہو سکتے ہیں“۔(14)

20مارچ کی اپنی ڈائری میں ایوب نے تسلیم کرلیا کہ تحریک نے کس طرح ریاست اور حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے ”کراچی ڈاک یارڈ میں مزدوروں نے ہڑتال کرتے ہوئے کام سے ہاتھ روک لیے ہیں ۔نہ تو کچھ لادا ،نہ اتارا جارہاہے۔بتایا گیا ہے کہ جہاز خالی واپس چلا گیا کیونکہ اس پر کپاس لادی نہیں کی جاسکی۔بھاشانی کراچی میں ہے اور وہ ہر طرف فساد پھیلاتا چلا جارہاہے۔کہا جارہاہے کہ آگے اس سے بھی خراب صورتحال پیداہونے والی ہے“۔(15)

مسلح افواج کے تینوں جرنیلوں آرمی کے جنرل یحییٰ ،نیوی کے ایڈمرل ایس ایم احسن اور فضائیہ کے ایر مارشل نورخان میں سے ایک کو بھی جرات نہیں ہورہی تھی کہ وہ متحرک اور مشتعل عوام پر گولی چلانے کا حکم دیں اس کی بجائے وہ بات چیت اور مذاکرات پر زور دے رہے تھے۔21فروری1969ء کو ایوب خان نے اعلان کردیا کہ وہ 1970ء میں ہونے والے صدارتی الیکشن میں امیدوار نہیں ہوگا۔اس اعلان نے انقلاب کے شعلوں کو اور بھی بھڑکا دیا۔اس نے تحریک کے رنگ و روپ اور جوش وجذبے کونئی امنگ اورترنگ سے بھردیا۔لاہور میں مغربی پاکستان سیکرٹریٹ کے کلرکوں نے ایک جزوی ہڑتال کا اعلان کیا،جس میں تیسرے اور چوتھے درجے کے ملازمین بھی شریک ہو گئے۔اس ہڑتال میں کچھ دنوں کے اندرہی ہسپتالوں،پی ڈبلیو ڈی،پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ خود مختارسرکاری ادارے جیسے روڈٹرانسپورٹ کارپوریشن،نیشنل بینک اورواپڈا کے سٹاف اور چھوٹے ملازمین بھی شامل ہوگئے۔مغربی پاکستان کی سبھی لیبر یونینوں اور فیڈریشنوں نے جوائنٹ لیبرکونسل تشکیل دے دی۔اس کونسل نے مارچ کے پہلے ہفتے کو مزدوروں کے مطالبات کے ہفتے کے طورپر منانے جبکہ 17 مارچ 1969ء کو ملک بھر میں عام ہڑتال کا اعلان کردیا۔یہ ایک انتہائی کامیاب اورتاریخی ہڑتال ثابت ہوئی اس دن سارا ملک بندہوکے رہ گیا ۔اس دن بجلی کے مزدوروں نے اسلا م آباد میں ایوان صدر ، سول سیکرٹریٹ ، سرکاری دفاتر اور جی ایچ کیو کی بجلی کاٹ دی ۔ویسٹ پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈیونینز کے صدر بشیر بختیار کے الفاظ میں یہ ہمارا صدر ایوب کیلئے واضح پیغام تھا ”کہ تمہیں جاناہوگا،نہیں گئے تو ہم یہ سلسلہ جاری رکھیں گے“۔(16)

مارچ پاکستان کی تاریخ کاسب سے متحرک ترین مہینہ بن گیا۔مزدوروں نے کارخانوں کا مکمل گھیرائوجلائو کر لیاتھا اور فیکٹریاں ان کے قبضے میں آچکی تھیں ۔ان حالات

میں سرکاری ملازمین کی ہڑتالوں نے حکومتی افسر شاہی اور شہری معیشت دونوں کو عضو معطل بنا کے رکھ دیا۔انقلاب کے زندہ عمل میں محنت کشوں کی شرکت اور شمولیت ،سیاسی عمل کے ذریعے اپنی کم اجرتوں میں اضافے ،اور اس دوران ان کی طرف ہڑتال کے بنیادی حق ،صنعتوں کو نیشنلائز کیے جانے اور سرمایہ د ارانہ نظام کو ختم کرنے کے مطالبات تحریک کے سب سے بڑے انقلابی مرحلے کے طورپر ابھر کے سامنے آئے۔ناگزیرطورپر اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان تیزی کے ساتھ نظریاتی طور پر دائیں اور بائیں بازو میں تقسیم ہو کرانقلاب کی تڑپ میں پیش قدمی کر رہاتھا۔ تحریک جو بھٹو اوربھاشانی کے شانہ بشانہ آگے بڑھتی چلی جارہی تھی ،ایوب اقتدارکے فوری خاتمے کا مطالبہ تو کرہی رہی تھی مگر یہ اب اس مطالبے سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔مولانا بھاشانی، جسے، فیلڈ مین نے ایک نہ سمجھ آسکنے والی پہیلی قرار دیاتھا،(17) خاص طورپر انقلاب کا ہر جلسے ہر تقریر میں ذکر کررہاتھا۔کراچی میں ورکروں سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ”اب وقت آگیا ہے کہ ہم باتیں کم کریں اور اپنے ہتھیار تیار رکھیں“۔ (18)

کسانوں کی بغاوت

بھاشانی ایک روایتی کسان لیڈر تھا اور گوریلا جدوجہدپر یقین رکھتاتھا۔وہ مائوزے تنگ کا پیروکار تھا۔ ایوب دور کی بے پناہ صنعتی ترقی کے باوجود پاکستان ایک زرعی معیشت کاحامل ملک تھا جس کی آبادی کی اکثریت دیہاتوں میں رہائش پذیر تھی۔شہروں اور قصبوں میں سے نکل کرانقلاب کی آواز دیہاتوں میں پہنچ کے اپنا رنگ جما رہی تھی۔یہ کسانوں کے دل ودماغ پر اور ان کی نفسیات پر ان کے اعصاب پرگہرائی اور شدت کے ساتھ چھاتی چلی جارہی تھی۔ چنانچہ جلد ہی کسانوں کی ایک بہت بڑی سرکشی دیہاتوں میں پھیل گئی اور شہروں اورقصبوں میں جاری انقلابی ابھار کی ہم سفر بن گئی۔مشرقی و مغربی پاکستان دونوں طرف کسانوں نے اپنے اپنے جاگیرداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔”جیہڑا واہوے ،اوہو کھاوے“یعنی جو کاشت کرے گا وہی زمین کا مالک ہوگا ‘کا نعرہ ہرطرف چھاگیا۔سندھ میں چمبھر ، پختونخواہ میں ہشت نگر اور مشرقی پاکستان کے کئی ایک اضلاع میں بڑی کسان تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں۔ چمبھر میں باریوں نے انتہائی جرات وبہادری کے ساتھ یکجہتی اور وحدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاگیرداروں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا اور کسان عدالتیں تک قائم کرلیں۔یہ حیدرآباد میں اپنے مزدور بھائیوں کی تحریک کے ساتھ جڑگئے اوروہاں ہونے والے مظاہروں میں بھی شریک ہوتے رہے۔زیل پاک سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں کی ایک ریلی

میں جو مزدور رہنما استاد مرتضیٰ کی قیادت میں نکلی، 800 مزدوروں کے ساتھ 700 ہاریوں نے بھی چمبھرسے شرکت کی۔اس ریلی میں بلدیہ ،روڈٹرانسپورٹ سمیت کئی اور شعبوں کے مزدور بھی شامل ہوئے ۔

اس جدوجہد کا نتیجہ تھاکہ جاگیردار غریب ہاریوں سے اپنی زیادتیوں کی سرعام معافیاں مانگتے پھر رہے تھے اوریہ بھی ماننے پر مجبور ہو گئے کہ کسان فصلوں کی بٹائی کسان عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق کرسکتے ہیں۔کوئی بیگار نہیں لیاجائے گا بائیں بازو کی کسی کسان کو بے دخل نہیں کیا جائے گا۔کسانوں کی اس تحریک سے نعرہ طلوع ہوا”ہاری حقدار،جاگیردار دستبردار“۔

مزدورکسان پارٹی MKP ایک بائیں بازو کی پارٹی تھی جو کہ مائوسٹ خطوط پر استوار کی گئی تھی۔ wikipedia کے مطابق اپنی ابتدامیں ہی اس نے کئی مختلف دھڑوں کے ساتھ مل کر کا م شروع کیاجن میں پنجاب میں میجراسحاق محمد اور مشرقی پاکستان کے کئی گروپ شامل تھے۔ 1970ء میں میجر اسحاق گروپ اس پارٹی میں ضم ہوگیا۔اس پارٹی کا مرکزکسان تھے اور یہ چینی ،ویتنامی اور افریقی عوام کی جدوجہد سے متاثر تھی۔اس کو سرحد میں فوری کامیابیاں ملیں جس کی وجہ وہاں ایوب کے دور میں ہونے والی زرعی اصلاحات اور فارم مشینری کی تنصیب کے نتیجے میں جاگیرداروں اور کسانوں کے مابین چلنے والے تنازعات تھے۔مزدورکسان پارٹی نے کسانوں کو منظم کرتے ہوئے ان کو ایک دھاگے میں پرویا جس کی اس وقت کسان بغاوت کو اشد ضرورت تھی۔اس کے نتیجے میں 1960/70ء کی دہائی میں تحریک کو شاندار تقویت میسر آئی۔اس تحریک کو نہ صرف جاگیرداروں کی نجی فوج بلکہ ریاستی جبر وتشدد کا بھی مقابلہ کرناپڑرہاتھا۔اس تحریک نے اپنے وقت میں تین حکومتوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔جاگیرداروں نے جو مختلف پارٹیوں میں شامل تھے ”اتحاد پارٹی“بنالی تاکہ اس کسان بغاوت کو مل کر کچلا جاسکے۔جبکہ سبھی صوبائی حکومتیں کسانوں کی تحریکوں کو کچلنے کیلئے ان جاگیرداروں کی مکمل پشت پناہی اور مدد کر رہی تھیں۔

کسانوں اور ریاست کے مابین ایک شدید تصادم جولائی 1971ء میں مـنڈانی پختونخواہ میں ہواجہاں 1500پولیس کے مسلح دستوں نے سارا دن کسانوں پر حملے کیے جس سے بیس کسان اور پارٹی کیڈر زخمی ہوئے۔دوسری بڑی جھڑپ نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط حکومت کے آخری دنوں میں ہوئی۔ کوئی 8000فوجی اور رینجرز مالاکنڈ تعینات کردیئے گئے تاکہ مزدورکسان پارٹی کو روکا جاسکے۔اس لڑائی میں پارٹی کے نائب صدر مولوی محمد صادق کو قتل کردیاگیا۔

مزدورکسان پارٹی نے پارلیمانی جدوجہد کو نظرانداز کرتے ہوئے 1970ء کے عام انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔اسی طرح قومی مسئلے پر بھی یہ درست موقف نہیں لے

سکی ۔اسی طرح سے یہ سندھ اور بلوچستان میں بھی خود کو منظم نہیں کر سکی۔اس کے باوجود بھی اس کی مردان،پشاور کے اضلاع سمیت مالاکنڈ اور سوات و دیر کی سابقہ ریاستوں کے علاقے میں مضبوط بنیادیں قائم تھیں۔جبکہ ہزارہ اور پنجاب میں اس نے موثر حمایت حاصل کی۔پارٹی کی پہلی مرکزی کانگریس شیرگڑھ ضلع مردان میں مئی 1973ء میں ہوئی۔علاقے کو ہر طرف مسلح سکیورٹی گارڈوں نے گھیرلیاتھا جبکہ ٹرانسپورٹروں کی طرف سے ہڑتال کرائی گئی تاکہ لوگ اس میں شریک نہ ہو سکیں۔تاہم یہ سب حربے ناکام ہوئے اور 5000افرد اس کانگریس میں شریک ہوئے۔ اپنے بس مالکان کا کہنا ماننے سے انکارکرنے والے ڈرائیوروں اور پارٹی کے پرجوش کارکنوں کی بڑی تعداد اس میں شامل تھی۔اس کانگریس میں میجر اسحاق محمد کوپارٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ 1970ء کی طرح 1977ء کے عام انتخابات میں بھی اس پارٹی نے حصہ نہیں لیااگرچہ یہ ایک درجن سے زیادہ حلقوں سے انتخابات جیتنے کی پوزیشن میں تھی۔مگر اس نے ”انتخاب نہیں انقلاب “کا نعرہ اختیار کرتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی نرم ہونے کے بعد بڑی ریلیاں نکالیں۔پشاور میں 50000 جبکہ شیرگڑھ مردان میں 30000افراد ان ریلیوں میں شریک ہوئے۔

ایک اوربڑی کسان جدوجہد 1972ء میں چشتیاں شوگر ملز پر قبضے کی شکل میں سامنے آئی ۔یہ کارخانہ دوسالوں تک مزدوروں کے کنٹرول میں رہا ۔اس میں 1200مزدور کام کرتے تھے۔ اس قبضے کو زیادہ تر اردگرد کے علاقے کے کسانوں کی بھرپور حمایت حاصل رہی جو اپنی فصلیں بھی یہاں لا کر دیتے رہے۔ مزدورکسان پارٹی کے سابق لیڈر امتیاز عالم کے الفاظ میں”ان دنوں یہ شوگر مل مزدوروں اورکسانوں کیلئے ایک کمیون کا کام سرانجام دے رہی تھی۔ہر چیز ورکروں کیلئے مفت فراہم کی جارہی تھی اور یہاں سے بہت سا سیاسی کام بھی شروع کیا گیا۔وہاں 25فل ٹائمرز کام کررہے تھے جو وہاں سے نکل کر دوسرے علاقوں میں جاتے اور مزدوروں کو منظم کیاکرتے تھے۔ہم نے شوگر ملز ورکرز کی ایک مرکزی فیڈریشن بھی قائم کر لی تھی جس کا مرکز چشتیاں شوگرملز کوبنایاگیا۔بھٹوحکومت کواس قبضے کو ختم کرنے کیلئے رینجرز طلب کرنے پڑے۔مگر کیفیت یہ تھی کہ ہم خود اندر سے ہی کمزور ہوکر ٹوٹ چکے تھے کیونکہ فیکٹری کو چلانے کیلئے درکارسرمایہ ہی نہیں تھا اور ہم کسانوں کی امداد کے ساتھ ٹریڈیونین فیڈریشن سے ملنے والے فنڈز پر ہی گزارہ کر رہے تھے“۔(19) امتیاز عالم نے یہ بھی بتایا کہ”ہم نے کسان خواتین کو بھی دیہاتوں میں منظم کیاتھا۔یہ خواتین زیادہ تر کپاس کی چنائی اور گند م کی بوائی کے موقعوں پرہی باہر نکلا کرتی تھیں ۔ انہیں فصل کی بٹائی میں سے 1/16حصہ ملتاتھا ،1974ء میں ہم نے چشتیاں میں کسان خواتین کانفرنس بھی کرائی جس میں دس ہزار کے قریب خواتین شریک ہوئیں ۔ہمارا اس کانفرنس پر بمشکل 48روپے خرچ آیاوہ بھی

سٹیج تیار کرنے اور لائوڈ سپیکر کیلئے تھا۔سبھی خواتین اپنے سفر کا اہتمام خودکرکے اور کھانا بھی گھروں سے تیار کر کے لائی تھیں"۔

پشتونخواہ کے علاوہ یہ تحریک پنجاب کے کئی قصبوں دیہاتوں میں سرایت کر چکی تھی،خانیوال،راجن پور، ڈیرہ غازیخان ،وہاڑی ،بوریوالہ سمیت کئی علاقوں میں کسانوں نے زمینوں پر قبضے شروع کرد یے تھے۔یہ تحریکیں بے دخلیوں،بیگار اور بٹائی کے مسئلے پر شروع ہوئی تھیں۔اس تحریک کے نتیجے میں انہیں فصلوں میں پہلے سے بہتر حصے ملنے شروع ہو گئے ۔

پاکستان میں کسانوں کی جدوجہد کی ایک لمبی تاریخ ہے جس نے ملک میں کسان کانفرنسوں کی روایت ڈالی۔مارچ 1948ء میں پہلی کسان کانفرنس تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائل پور(جسے بعد میں فیصل آباد بنادیاگیا) میں منعقد کی گئی تھی جس میں پنجاب کسان کمیٹی کی تنظیم وتشکیل کی گئی جس نے پنجاب بھر میں کسانوں میں موثر کام کیا۔انقلابی تحریک کی وجہ سے پنجاب کے مختلف شہروں میں کسان کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ 1970ء میں کسان کانفرنس ٹوبہ ٹیک سنگھ میں جبکہ 1971ء میں خانیوال میں ہوئی ۔ 22/23مارچ کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی کانفرنس پاکستان کی تاریخ کی کامیاب ترین کانفرنس تھی۔جس میں پاکستان کسان کمیٹی کے مطابق ملک بھر سے ڈھائی لاکھ کسانوں نے شرکت کی تھی۔اس کانفرنس میں جو اہم شخصیات شریک تھیں ان میں مولانا بھاشانی ،فیض احمد فیض ،احمد راہی اور معراج محمد خان شامل تھے۔

لوگ کسی سمندری طوفان کی طرح سے متحرك ہو چکے تھے۔پنجاب اور سندھ کے جاگیرداروں کے خون خشک ہوچکے تھے اور دماغوں سے ہوش اڑچکے تھے ۔ان کے پائوں لڑکھڑا رہے تھے۔ملائوں کو یہ ساری کیفیت ایک آنکھ بھی نہیں بھارہی تھی اور وہ تلملائے ہوئے تھے کیونکہ مزدور'کسان اورنوجوان جوکچھ کہہ رہے تھے 'جوکچھ کر رہے تھے وہ ان کے حساب سے سراسر کفر تھا کیونکہ وہ خدا کی بنائی ہوئی تقدیر کے برخلاف اپنی ذلتوں' محرومیوں اور غربت کے خاتمے کی جستجو اور جدوجہد میں ملوث تھے۔افسر شاہی تو روز ازل سے ماضی میں رہنے کی عادی چلی آرہی تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے ہی اس کے تصورات اور طورطریقے وہی اور ویسے ہی چلے آرہے تھے۔

این ڈبلیو ایف پی (پشتونخواہ) میں کسان تنظیمیں انتہائی سرگرمی سے صوبہ بھر میں کسانوں کی میٹنگیں اور جلسے جلوس کر رہی تھیں۔ 1960/70ء کی دہائیوں میں وہاں کئی کسان کانفرنسیں منعقد کرائی گئیں ۔جن میں وسیع عوامی احتجاج ،جلوسوں اور بعض اوقات مسلح جدوجہدکے ذریعے کسانوں کو درپیش مسائل و مطالبات سامنے لائے گئے۔اپریل 1967ء میں شاہ آباد قصبے (ضلع پشاور)میں ایک کسان جرگہ منعقدہواجس

میں خواتین کی طرف سے زمینوں پر قبضے اور کسانوں کی زبردستی بے دخلی کے خلاف قراردادمنظور کی گئی۔

سندھ ہاری کمیٹی نے بھی کسانوں کے مسائل اورمطالبات کیلئے جدوجہدمیں کوئی کسر نہیں اٹھا چھوڑی تھی۔21/22جون کو سکرنڈ ضلع نوابشاہ میں ایک تاریخی کسان کانفرنس شیخ عبدالمجید سندھی کی صدارت میں منعقدہوئی جس میں ضلع نوابشاہ سمیت صوبہ بھر سے کسانوں کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی،ان میں سے کئی کسان دوردراز علاقوں سے ننگے پائوں سفرکرکے پہنچے تھے۔اپنے صدارتی خطاب میں مجید سندھی نے کہا ''یہ صوبے بھر کے ہاریوں کی نمائندہ کانفرنس ہے۔ہماری جدوجہدجاگیرداروں کی ظالمانہ پالیسیوں اور ان کے قبضے کے خلاف ہے۔زمینوں پر جاگیرداروں سے زیادہ ہاریوں کا حق ہے اور ہم ہر حال میں یہ حق لے کر رہیں گے''۔(20) انقلاب نے مڈل کلاس کے تذبذب اور اضطراب کو بھی ختم کر کے دیاتھا۔ وکلا،ڈاکٹر،آرٹسٹ،سائنسدان،دانشور،شاعر،صحافی اور سماج کی سبھی پرتیں جسے حکمران طبقہ عام طورپراپنے اقتدار کے استحکام کیلئے استعمال کرتارہتاہے،اس فیصلہ کن سفر میں پرولتاریہ کے ساتھ شامل اور شریک ہو چکے تھے اور انقلاب کے تیز وتند دھارے کا حصہ بن چکے تھے۔اس عمل میں سب سے قابل ذکر تحریک صحافیوں کی تھی۔

بائیں بازو کے صحافیوں کی جدوجہد

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس(PFUJ)2جون1950ء کو قائم کی گئی ،اس کی تشکیل کا فیصلہ دوماہ قبل کراچی میں ہونے والے کنونشن میں کیاگیاتھا۔اس کنونشن میں دہلی یونین آ ف جرنلسٹس کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے۔اس کنونشن کے سرکردہ لوگوں میں منہاج برنا اور آئی ایچ رشیدشامل تھے۔اس یونین کی تاریخ شاندار جدوجہد سے بھری پڑی ہے۔اس کا ایک ناقابل فراموش واقعہ 1949ء میں انگریزی اخبار''سندھ آبزرور''کراچی میں ہونے والی 49دنوں کی طویل ہڑتال ہے۔اس ہڑتال کوسندھ یونین آف جرنلسٹس نے منظم کیاتھا۔اس نے اگلے سال پی ایف یوجے کی تشکیل میں بھی اہم کردار اداکیاتھا۔بعد ازاں''ٹائمز آف کراچی''کی 1954ء کی ہڑتال،1966ء میں روزنامہ ''انجام''کراچی کی ہڑتال اور 1969ء میں روزنامہ ''کوہستان''کی ہڑتال صحافیوں کی اس یونین کی شاندار جدوجہد کا روشن باب ہیں۔1959ء میں اس کے مطالبے پر پہلے ویج بورڈ کی تشکیل دی گئی جس نے 1960ء میں پہلے ایوارڈ کی منظوری دی ۔یہ طے کیا گیاکہ ہر پانچ سال کے بعدنیا ویج ایوارڈ لاگو کیا جائے گا۔مگر دوسرا ایوارڈ1969ء میں ہی لاگو کیاجاسکاوہ بھی انقلابی تحریک کے بے پناہ دبائو کی وجہ سے ممکن ہوا۔

ایوب حکومت کے جبر کی وجہ سے پاکستانی صحافت کو شدید دھچکے لگے۔اس حکومت نے سیاہ ترین قانون ”پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس“(ترمیم شدہ) نافذ کردیا۔اس کے تحت آزاد اخبارات وجرائد ”پاکستان ٹائمز“”امروز“اور ہفت روزہ ”لیل ونہار“کوایک مارشل لا حکم کے تحت سرکاری تحویل میں لے لیاگیا،جو پروگریسو پیپرز لمیٹڈکے تحت شائع ہورہے تھے اور جومعروف ترقی پسندمیاں افتخارالدین کی ملکیت تھے۔آمریت نے اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ایک ادارہ ” نیشنل پریس ٹرسٹ “بھی قائم کردیاجس نے کم وبیش 14معتبرومعروف روزناموں اورہفت روزوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ اس ٹرسٹ کے قیام کا مقصدپریس کو اپنے کنٹرول اورقابو میں رکھنا تھا اور سرکاری وفادار وکاسہ لیس یونینوں کی تشکیل تھا۔یہ بھی اسی دورمیں ہی ہوا کہ نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان(APP)کو سرکاری تحویل میں لے لیاگیا۔اس ایجنسی کو تحویل میں لینے کا مقصد”ایجنسی کے انتظامی و معاشی امور کو بہتر اور موثربنانا“قراردیاگیا۔مگر اس کا حقیقی مقصد اپنی مرضی کی خبروں کی تشکیل و تشہیر کرنا ہی تھا۔پی ایف یو جے نے ان سب آمرانہ اقدامات کی سخت مذمت کی۔اس نے آرڈیننس کے نفاذ کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی اپیل کرتے ہوئے ،آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی (APNS)اور کونسل آف پاکستان نیوزپیپر ایڈیٹر (CPNE)جو دونوں مالکان کی ہی تنظیمیں ہیں مگر مختلف اور الگ الگ ہیں،کے ساتھ مل کر ایک جوائنٹ ایکشن کمیٹی تشکیل دی جس نے 9ستمبر1963ء کو ملک بھر میں ہڑتال کی۔بعد میں مالکوں کی ان دونوں تنظیموں نے الگ ہوکر حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا اور ایک ضابطہ اخلاق طے کرنے پر متفق ہوگئیں۔ تین دہائیوں سے زیادہ عرصے سے یہ دونوں تنظیمیں میڈیامالکان پر مشتمل چلی آرہی ہیں۔یہ ارب اور کروڑپتی مالکان اپنے محنت کشوں اورصحافیوں کا بے دردی سے استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ حکومت نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ اس آرڈیننس کو معطل رکھا جائے گا۔مگر یہ یقین دہانی جلد ہی جھوٹی ثابت ہوگئی جب روزنامہ ”اتفاق“پر جو ڈھاکہ سے شائع ہوتا تھا اور اپوزیشن کا ترجمان بناہواتھا،اسی ظالمانہ آرڈیننس کی روشنی میں پابندی لگا دی گئی۔60کی دہائی میں یہ اخبار مشرقی پاکستان کے لوگوں کی آواز بن چکاتھا۔تفضل حسین کا ادارتی صفحے پر چھپنے والا کالم ”راج نیتک منچا“(سیاسی پلیٹ فارم)کو مشرقی بنگال میں بے انتہا عوامی پذیرائی مل رہی تھی۔جس سے گھبرا کے ایوب حکومت نے 17جون سے 11جولائی1966ء تک اخبار کو سنسر لگاتے ہوئے بند کردیا۔اس کے بعد پھر 17جولائی 1966ء سے لے کر 9فروری1969ء تک اسے بند کردیا گیا۔تفضل حسین جو اخبار کاایڈیٹر تھا ،کوکئی بار جیل میں ڈالا گیا۔”اتفاق “کو10فروری1969ء کو دوبارہ شائع کیاجاسکا۔

منہاج برنا نے PFUJ کی تاریخ کے حوالے سے اپنے مضمون میں لکھا ہے " 1968ء آزادی صحافت کیلئے جدوجہد کے حوالے سے یونین کی تاریخ میں اہم ترین سال تھا۔یہ سارا سال نئے سال کے آغاز تک(جب ملک پر یحییٰ آمریت مسلط ہوئی) ایوب آمریت کے خلاف عوام کی عظیم ودرخشاں انقلابی جدوجہد سے مزین تھا۔ گھبرائے اور بوکھلائے ہوئے ایوب نے جبر و تشدد کا وطیرہ اپنایا ہوا تھا۔ پریس پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں لگائی جارہی تھیں۔ 1966ء میں روزنامہ اتفاق پر پابندی لگانے کے بعد حکومت نے روزنامہ "پوربانی"ڈھاکہ اور ہفت روزہ" چٹان"لاہورکو بھی بندکردیا۔ صحافیوں کو بغیر مقدمات کے قید کردیاگیا جبکہ "نوائے وقت"لاہور،"عبرت"حیدرآباد،"پاکستان آبزرور" "آزاد" اور "سنگ باد"ڈھاکہ کیلئے سرکاری اشتہارات پر پابندی لگا دی گئی۔اس کے ساتھ حکومت نے جابرانہ "پریس ایڈوائس "کا نظام بھی مسلط کردیاجسے ایک باقاعدہ اور مسلسل حربے کے طورپر بروئے کار لایاجاتا رہا۔یونین کی فیڈرل ایگزیکٹو کونسل نے کراچی میں اپنی15سے17 دسمبر تک ہونے والی میٹنگ میں اس ساری صورتحال کا جائزہ لیا اورایک تفصیلی قرارداد مرتب کی گئی جس میں کہاگیا کہ' حالیہ مہینوں کے اندر ایک جمہوری و تعمیری آلے کے طورپر قومی پریس کا کام کرنا ناممکن بنا کے رکھ دیاگیا ہے۔صورتحال اتنی بھیانک ہو چکی ہے کہ لوگوں کا پرنٹ میڈیا پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا ہے۔صحافیوں کی سماج کے غیرجانبدارنگران کی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔کونسل اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ قومی پریس نے اس سے زیادہ بھیانک مرحلہ نہیں دیکھا ۔لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آزادی صحافت کی جدوجہداور اس پراعتماد کی بحالی اس وقت کا سب سے اہم ترین تقاضا بن چکا ہے۔یہ ساری صورتحال اس حکومت کی پچھلی ایک دہائی کی جابرانہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے"۔

"تاہم کونسل اس پر مطمئن ہے کہ ملک بھر کے صحافیوں کی آزادی صحافت کیلئے جدوجہد کی روایت اب بھی مستعدی سے جاری وساری ہے اور اس کیلئے جوکچھ بھی ممکن ہوسکتاہے کیا جارہاہے۔پچھلے دوماہ کے دوران صحافیوں نے یہ ثابت کردکھایا ہے کہ ان کو جھکایا نہیں جاسکتا۔کئی میٹنگیں ،جلسے جلوس،ریلیاں اور مظاہرے اس عرصے میں منظم کیے گئے ہیں ۔10دسمبر کو ملک بھر میں کی جانے والی کامیاب ہڑتال نے ان کے حوصلے اور عزم کو ظاہر کیاہے کہ وہ صحافت کی آزادی کیلئے کسی بھی قسم کی قربانی سے گریز نہیں کریں گے۔اس حوالے سے کونسل پریس ورکرز،کیلی گرافرز،پروف ریڈرز اور ہاکروں کا تہہ دل سے شکریہ اداکرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہے کہ انہوں نے صحافیوں کی اس جدوجہد میں بھرپور ساتھ دیا اور کونسل امید کرتی ہے کہ اتحاد ویگانگت کا یہ عمل مزید فروغ پائے گا"۔

"اس سارے عرصے میں ایک طرف قانون نافذکرنے والے وحشی اداروں نے

صحافیوں تودوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں کوجسمانی تشدداوراذیت کا نشانہ بنایا ۔ڈھاکہ ،کراچی، لاہوراورپنڈی میں صحافیوں، پریس فوٹوگرافروں یہاں تک کہ ان کے دفاتر کوٹارگٹ بنالیاگیا ۔ڈھاکہ میں مشتعل عوام نے ”مارننگ نیوز“اور دینک پاکستان“کے دفاتر کو تہس نہس کرڈالا ۔یہ دونوں اخبارحکومتی ادارے نیشنل پریس ٹرسٹ کی ملکیت تھے۔چٹاگانگ سے روزنامہ”یونٹی“اور لاہور پنڈی کے ”کوہستان “کے دفاتر پر حملے کیے گئے “۔(21)

یحییٰ آمریت کے نافذہوتے ہی اس کے وزیراطلاعات جنرل شیر علی کی نگرانی میں پی ایف یو جے کے خلاف شاید اس کی تاریخ کا بدترین جبرواستبداد شروع کردیاگیا۔حکومت کے کاسہ لیس چند سیاستدانوں کی ملی بھگت کے ساتھ، جن کے مالی مفادات حکومت سے وابستہ تھے ،یونین کے سرکردہ رہنمائوں کوتذلیل وتضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔اس مہم کیلئے کچھ روزناموں اورلاہو ر سے چھپنے والے ایک مخصوص ہفت روزے کواستعمال کیا جاتارہا۔کردار کشی کی ایک بیہودہ مہم شروع کردی گئی جس کا مقصد صحافت،ریڈیو،ٹیلیویژن اوردیگر اداروں میں سے ”کمیونسٹوں اور اسلام دشمن عناصر کا قلع قمع کرنا“ قرار دیا گیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے ایوب دور میں پاکستان ٹائمز اور امروز کو ریاستی تحویل میں لیے جانے کی وکالت اور حمایت کی تھی۔ ان میں سے ایک سرکردہ لیڈرمجلس احرار سے وابستہ نوابزادہ نصراللہ نے بیان جاری کردیا کہ زیادہ تر اخبارنویسوں خاص طورپر نیشنل پریس ٹرسٹ میں کام کرنے والوں کی اکثریت ”سرخوں“پر مبنی ہے لہٰذا اسلام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کیلئے لازمی ہے کہ ان سے اداروں کو پاک صاف کردیاجائے۔(22)ایک ہفت روزہ”زندگی“ نے تو پی ایف یو جے کے رہنمائوں کے خلاف مسلسل مضامین چھاپنے شروع کردیئے جن میں مارشل لا حکام سے استدعا کی جاتی رہی کہ ان کو ملازمتوں سے نکال دیاجائے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترقی پسند اخبارنویسوں کے خلاف زہر اگلنے والے ان تنخواہ داروں کوکبھی بھی آزادی صحافت اور جمہوری اقدار کی بحالی کیلئے ایک حرف تک لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

پی ایف یو جے کی طرف سے ایک اور طاقتور ہڑتال15اپریل 1970ء کو مشرقی و مغربی پاکستان میں کی گئی ۔دس دنوں تک جاری رہنے والی یہ ہڑتال کئی حوالوں سے یادگار ہے ۔مالکوں کی تنظیم اے پی این ایس نے دوسرے ویج بورڈ کا تجویزکردہ ایوارڈدینے سے صریحاًانکارکردیاتھا۔اس کے مطابق پچھلے دس سالوں میں رکی ہوئی اجرتوں میں 35%اضافہ کرنے کا کہاگیاتھا۔اس وقت ویج بورڈ اور اسکے ایوارڈکا تعلق صرف صحافیوں سے ہوتاتھا جبکہ اخبار ات اور نیوزایجنسیوں کے دوسرے محنت کشوں کا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ہائی کورٹ میں اپنی پٹیشن ہارنے کے باوجود مالکوں کی تنظیم نے ایوارڈ پر عملدرآمد کرنے سے انکارکردیا جس پر پی ایف یوجے نے ہڑتال کااعلان

کردیا۔

چودہ مالکان اور ایڈیٹروں نے بدحواس ہوکرہڑتال سے کچھ روز پہلے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں ہڑتال کو"کمیونسٹوں اور بھاشانی"کی سازش قراردیتے ہوئے مارشل لا حکومت سے مطالبہ کیاگیا کہ پی ایف یو جے کے خلاف مارشل لا ضابطوں کے تحت فوری کاروائی کی جائے۔ اس ہڑتال کا دوسرا بڑا روشن پہلو یہ تھا کہ اس نے سبھی محنت کش صحافیوں' پریس فوٹوگرافروں اورکیلی گرافروں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھاکردیا۔جیسا کہ پہلا اور دوسرا ویج ایوارڈ صرف صحافیوں کیلئے ہی مختص تھا،پی ایف یو جے نے بارہامطالبہ کیا کہ یا تو باقی محنت کشوں کیلئے الگ بورڈ تشکیل دیاجائے یا پھر ان کو بھی اس کا حصہ بنا دیاجائے۔اس کی دلیل تھی کہ اخبار وجرائد محض صحافیوں کی محنت سے ہی نہیں شائع ہوتے بلکہ دفاتر کی چھتوں کے نیچے کام کرنے والے سبھی محنت کشوں کی محنت شاقہ اس میں شامل ہوتی ہے۔اورجنہیں وہی مالک اجرتیں دیتے ہیں۔اور ان محنت کشوں پر بھی معاشی 'سماجی حالات اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کا ایک جیسا ہی اثرپڑتاہے۔اس لئے ہڑتال کیلئے جو چارنکاتی ایجنڈا جاری کیاگیاان میں ایک غیرصحافی محنت کشوں کیلئے عبوری ریلیف کا مطالبہ بھی شامل کیاگیاتھا۔اس کے نتیجے میں مالکان کو سبھی محنت کشوں' صحافیوں غیرصحافیوں دونوں کو عبوری امداد دینی پڑ گئی۔

1970ء کی اس ہڑتال کے بعد یونین اور اس سے ملحقہ تنظیموں کے 250سرکردہ رہنمائوں اور صحافیوں کو وزارت اطلاعات کی ہدایات کے تحت ان کی متعلقہ انتظامیہ نے ملازمتوں سے برخاست کردیا۔پاکستان ٹائمز،جنگ، نوائے وقت،امروز،مارننگ نیوز اور مشرق وہ اخبارات تھے جن سے انہیں نکال دیا گیا تھا۔ 25مارچ1970ء کو فوج نے روزنامہ "اتفاق"کے دفتر کو جلا ڈالا جس کے بعد سے یہ اخبار بند ہوگیاتاہم بعد میں یہ اخبار 21مئی1971ء کو حکومتی سرپرستی میں دوبارہ شروع کر د یا گیا۔ 10 دسمبر کو ڈھاکہ میں معروف صحافی سراج الدین کو ایک مذہبی جنونی نے پہلے اغوااور پھر قتل کر دیا۔ وہ 1964/65ء میں مشرقی پاکستان یونین آف جرنلسٹس کے صدررہے جبکہ 1970/71ء میں پی ایف یو جے کے نائب صدر تھے۔صحافیوں کی شاندار جدوجہد ضیاء آمریت کے دور میں بھی جاری رہی۔صحافی ان اولین لوگوں میں سے تھے جنہیں آزادی اظہار کا مطالبہ اور جدوجہدکرنے کے جرم میں کھلے عام کوڑوں کی سزا دی گئی۔

دوسری جانب نظریاتی حوالے سے صنعتکاروں اورتاجروں نے رجعتی مذہبی پارٹیوں نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کی خدمات لینے کا فیصلہ کیا کیونکہ ایوب کی پوزیشن انتہائی کمزورپڑچکی تھی۔ان جماعتوں نے واویلا شروع کردیا کہ جب تک سیاسی نمائندوں کو اقتدار منتقل نہیں ہوجاتا تب تک ایوب حکومت کو برقرار رکھا

جائے۔یہی وہ پوزیشن تھی جسے ایوب کا وزیرقانون پیش کرتاپھر رہا تھا۔ 2 مارچ 1969ء کوجماعت اسلامی کے قائم مقام امیر میاں طفیل نے بیان جاری کیا کہ” ایوب حکومت کا اس مرحلے پر جانا غلط ہوگا ایساہواتو یہ گول میزکانفرنس کے فیصلے کی روشنی میں عوام کی خواہشات کی نفی کے مصداق ہوگا۔“(23) یہ گول میز کانفرنس پہلے 26فروری اور پھر10مارچ کو ہوئی جس کے چوتھے مرحلے میں حکومت کا ردعمل سامنے آیا۔ایوب حکومت اس کانفرنس کے شرکا کے دو مطالبات ماننے پر راضی ہوگئی جس پر اپوزیشن لیڈر بھی متفق ہوگئے؛ان میں بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر الیکشن اورپارلیمانی نظام شامل تھے۔تاہم ایوب کی طرف سے ان مراعات کی پیشکش نے تحریک کوکسی طور متاثر نہیں کیا اور یہ جاری وساری رہی۔عوام نے بورژواجمہوریت کے قیام کے مرحلے کو قبول کرنے سے انکارکردیا۔انقلاب محنت کش طبقات کوسوشلسٹ تبدیلی کی طرف مائل کرچکاتھا۔تحریک کو جمہوری خطوط کی طرف لے جانے والی بورژوا قیادت تحریک کی اس نہج کے باعث ختم ہو چکی تھی۔

فوج میں بے چینی

یقینی طوراس انقلاب کی وجہ سے مسلح افواج میں پیداہونے والے اثرات و اضطراب کے بارے میں ناکافی معلومات دستیاب ہیں۔تاہم 25مارچ1969ء کو ایوب کی اقتدار سے رخصتی میں فوج میں پائے جانے والی بے چینی کا بہت بڑا عمل دخل تھا۔جنرل یحییٰ کی مصالحانہ اور اصلاح پسندانہ پالیسیوں کے پیچھے بھی فوج میں موجود اسی اضطراب کا ہی عمل دخل تھا۔جنگ شروع کرنے اور پاکستانی قوم کے تعصب کو،خاص طورپر مغربی پاکستان کے اندر جہاں سے بہت بھاری تعداد میں فوج جنگ کیلئے استعمال ہونی تھی،فروغ دینے کے پیچھے ایک بڑی وجہ صرف انقلاب کو پٹڑی سے اتارنا نہیں تھا بلکہ فوج کے اندر پھیلے اضطراب کا قلع قمع کرنا بھی تھا۔لیکن صورتحال اس قدر پیچیدہ اور کشیدہ ہوچکی تھی کہ حکمران نہ صرف جنگ کرنے بلکہ آدھا ملک گنوانے پر بھی تیار ہو گئے تاکہ ہر حالت میں سرمائے کی حکمرانی کو بچالیاجائے۔

آگے چل کر ہم مختلف جرنیلوں کی کتابوں سے فوج کے اندر موجود بے چینی کا حوالہ دیں گے جس کا انہوں نے کسی حد تک مبہم انداز میں ذکر کیا ہے۔فوج کے اندر پائی جانے والی بے چینی کا انداز ہ 1970ء کے انتخابات میں کچھ فوجی چھائونیوں میں سے بھیجے جانے والے پوسٹل بیلٹس کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ ہوجانے والی انقلابی سوشلزم کی لہر نے وردی میں موجود محنت کشوں کے شعورکو بھی اپنی گرفت میں لے لیاتھا۔فلپ ای جونز کسی حد تک چھائونیوں میں انقلاب

کے اثرات کودریافت کرنے اور اپنی کتاب "PPP-Rise to Power"میں پیش کرنے میں کامیاب رہا۔اس سے ان رپورٹوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ فوج کی افسرانہ پرت نے کسی بھی سیاسی پارٹی کو ووٹ نہیں دیا۔جی ایچ کیو کو فوج کے الیکشن نتائج سامنے لائے جانے کے بارے میں شدیدسکیورٹی اورسیاسی تحفظات تھے۔یہ بھی ممکن تھا کہ جی ایچ کیو فوج کو بائیں بازو کے نظریات کی یلغار سے محفوظ رکھنا چاہتاہوجو الیکشن مہم میں زوروشور سے مرکزی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔لیکن جس قدر بھی نتائج معلوم ہو سکے ہیں ان سے بآسانی پتہ چل جاتا ہے کہ فوج کے اندر پیپلز پارٹی کو وسیع حمایت میسر تھی۔اسی حقیقت نے ہی بھٹو کو الیکشن کے بعد یحییٰ خان اور مجیب الرحمان کے ساتھ مذاکرات میں اپنی برتری جتانے میں اہم کرداراداکیاتھا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ الیکشن کے نتائج فوج کے اندر انقلابی اضطراب کی موجودگی اور شدت کو عیاں اور ثابت کرتے ہیں۔

چھائونیوں کے انتخابی نتائج(24)

1970ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات

(پوسٹل بیلٹ کے ذریعے ڈالے گئے ووٹوں کی شرح فیصد)

چھاؤنی	مسلم لیگ	پیپلز پارٹی	جماعت اسلامی	دوسری اسلامی جماعتیں	آزاد	دیگر
واہ	3.2	67.2	16.7	5.2	1.9	5.8
جہلم	21.2	61.2	7.1	5.6	1.4	3.6
ائیر فورس بیس ایریا	11.6	37.8	11.9	13.1	25.5	-
سرگودھا کینٹ	8.0	58.3	8.8	8.1	16.9	-
شور کوٹ روڈ	-	67.6	-	22.8	9.6	-
لاہور گیریژن	29.2	58.2	-	-	0.7	11.9

لاہور کینٹ	25.7	64.7	-	-	0.7	8.0
سیالکوٹ لائنز	7.2	72.3	8.4	8.8	3.1	0.2
سیالکوٹ کینٹ	20.8	55.7	8.0	14.6	0.7	0.2
گوجرانوالہ	23.4	67.4	7.5	1.7	-	-
ملتان	-	55.9	-	44.1	-	-

اس انقلابی تحریک کے دوران متعدد ایسے مواقع آئے جب فوج کے افسروں نے مزدوروں' طالبعلموں اور نوجوانوں کے مظاہروں پر فائرنگ کا حکم ماننے سے انکارکردیا ۔ایسے بھی مواقع تھے کہ جب فوج اور پولیس مظاہرین کے ساتھ کچھ کرنے کی بجائے ایک طرف کھڑی رہی۔ انقلابی مظاہروں اورہڑتالوں کی حمایت کرنے کے الزام میں کئی درمیانے رینک کے فوجی افسروں کوکورٹ مارشل بھگتنا پڑا۔یہ انقلابی ابھار اوراس میں جذبوں کی شدت تھی کہ طاقتور فوج کو بھی محنت کشوں کے ان جذبوں کے مقابلے میں پسپائی اختیار کرنی پڑگئی جو انقلاب کی تڑپ نے ان میں پیداکردیے تھے۔ کراچی میں ہونے والے ایسے واقعات میں سے ایک اس کیفیت کی بھرپور غمازی کرتاہے۔ 1996ء میں مصنف کے ساتھ ایک انٹرویو میں ایک ریٹائرڈ میجر نے جو اس انقلاب کے وقت کراچی میں تعینات تھا ،اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط کے ساتھ اس واقعے کے بارے میں بتایا ”میں فروری 1969ء میں کراچی میں تھامجھے حکم ملا کہ میں کراچی کے ایک مشہور علاقے بند روڈ(جوکہ اب محمدعلی جناح روڈ کہلاتی ہے)میں مزدوروں کے ایک بڑے مظاہرے کو منتشرکروں۔اس مظاہرے میں کراچی کے مختلف علاقوں کی مختلف صنعتوں سے 50000سے زائد افرادشریک تھے جس کی قیادت طلبہ اور مزدوروں کے بائیں بازو کے راہنما کر رہے تھے۔ایمپرس مارکیٹ کے قریب 16کے قریب ٹینک موجود تھے جو اس کا راستہ روکنے کیلئے کھڑے کیے گئے تھے۔یہاں سے مظاہرین کو انتباہی سگنل جاری کیے جارہے تھے۔میں فوج کے کچھ افسروں کے ساتھ ان ٹینکوں کے آگے یوں کھڑاتھا جیسے کسی جنگی کیفیت میں تھا۔ایک افسر نے مظاہرے کی قیادت سے رابطہ کر کے انہیں سخت فوجی انداز میں منتشرہوجانے کی ہدایات جاری کیں۔مزدوروں نے صاف انکارکردیا اور آگے بڑھنے لگے۔مزدور اب زیادہ پرجوش انداز میں سوشلسٹ انقلاب کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ

رہے تھے“۔

”فوجی افسر نے ایک بار پھر قیادت سے رابطہ کیا اور اس بار کچھ نرم لہجے میں ان سے منتشر ہوجانے کو کہا۔ انہوں نے دوبارہ انکار کردیا جس پر اس افسر نے سڑک پر چاک سے ایک لکیر کھینچی اور اعلان کیا کہ جوبھی اس لکیر کو عبور کرے گا اسے گولی ماردی جائے گی۔اس پر تو جیسے مظاہرین کو آگ لگ گئی۔ پہلے ہتھوڑی درانتی والے سرخ پرچم اٹھائے ہوئے ،سوشلسٹ فتح تک جدوجہد کی عبارتوں کے حامل بینر ہاتھوں میں لیے ہوئے مظاہرین آگے بڑھتے چلے گئے اور لائن عبور کرلی،اس کے بعد افسر لائنیں لگاتا گیا اور مظاہرین عبور کرتے رہے۔اس نے پانچ لائنیں لگائیں اور مظاہرین ان پانچوں ڈیڈ لائنوں کو عبور کرتے چلے گئے۔اس کے بعد ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کا قافلہ پیچھے کی طرف ہٹنا شروع ہوگیا۔ہم پسپا کر دیئے گئے تھے۔مجھ سمیت سبھی افسروں نے اسے اپنی سبکی محسوس کیا۔مگر ہم کس طرح اپنے ہی عوام، اپنے ہی لوگوں پر گولیاں چلاتے جو اپنی محرومیوں اور ذلتوں سے نکلنے کیلئے جدوجہد کررہے تھے۔ہمارے پیچھے ہٹنے پر مجمع خوشی سے جھوم اٹھا اور انہوں نے جوشیلے انداز میں تالیاں بجائیں۔محنت کشوں کے چہروں اور جذبوں سے اپنے اتحاد ویگانگت کی ایک تاریخی جھلک واضح اور نمایاں تھی۔فوج کے بڑے اور بھاری بھرکم ٹینک اور ان کی ہیبت، عوام کے اس جوش و جذبے کو شکست دینے اور انہیں منتشر کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھی“۔(25)

اس قسم کے واقعات سے صاف عیاں اور ثابت ہوتا ہے کہ انقلاب کا جوش وجذبہ متحد ومتحرك عوام کی نفسیات سے موت سمیت ہر قسم کا خوف نکال دیا کرتا ہے۔یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ ریاست کو 1968/69ء کے انقلاب کے دوران ہونے والی طبقاتی جنگ میں پرولتاریہ کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔فوجیوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی ان دنوں چھائونیوں میں ”بتی بند“ کے بعد ہونے والی سرگوشیوں پر مبنی گفتگو کو یاد کرتی مل جاتی ہے۔وہ اپنے کمانڈنگ افسروں اور جرنیلوں کی طرف سے اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے حقارت آمیز اورذلت انگیز حاکمانہ رویوں کو یاد کرتے تھے ۔اپنی ان سرگوشیوں میں یہ سپاہی سوشلزم کی بھرپور حمایت کیا کرتے تھے۔

طلبہ اور نوجوانوں کی تحریک نے سارے سماج کو آتش فشاں بنادیا تھا۔ مزدور کارخانوں پر قبضے کیے جارہے تھے اور ان کی پہیہ جام ہڑتالیں ملک کو جام کیے جارہی تھیں۔کھیت مزدوروں، کسانوں، مزارعوں اور ہاریوں نے اپنے اپنے جاگیرداروں کی زمینوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا ۔اور ان کے محلات و عیش گاہوں کو جلایا جارہا تھا جو انہی کسانوں کے خون پسینے کو نچوڑ کر تعمیر کی گئی تھیں۔کھیتوں کھلیانوں میں جاری اس جدوجہد نے شہروں میں محنت کش طبقے کی جاری جدوجہد کو تقویت بخشے رکھی۔اس زندہ و تابندہ جدوجہد میں فوج کے سپاہیوں اورنچلے درجے کے افسران کی

شرکت و شمولیت پاکستان میں استبداد واستحصال کے حامل سرمایہ دارانہ نظام کے تابوت میں آخری تختہ ثابت ہو جاتی۔اگر اس وقت ایسے حالات' ایسی کیفیت میں ایک انقلابی پارٹی ہوتی جو فوج کے جوانوں کی اس حمایت کومنظم و متحرک کرتی تو اس تحریک کو انقلابی سوشلزم کی فتح میں تبدیل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتاتھا۔ اس سے انسانی تاریخ کا دھارا تبدیل ہو سکتا تھا۔

نوٹس

1۔ ٹراٹسکی، انقلاب روس کی تاریخ، (پاتھ فائنڈر)، صفحہ 17

2۔ برٹش پیپرز1958-69، (آکسفورڈ)، صفحہ 734-739

3۔ برٹش پیپرز1958-69، (آکسفورڈ)، صفحہ 743

4۔ رائے فاکس، 20نومبر 1968ء

5۔ برٹش پیپرز1958-69، (آکسفورڈ)، صفحہ 775

6۔ برٹش پیپرز1958-69، (آکسفورڈ)، صفحہ 795

7۔ مصنف سے انٹرویو، ستمبر2008ء، لاہور

8۔ ایضاً

9۔ سٹینلے وولپرٹ، زلفی بھٹوآف پاکستان، صفحہ 126

10۔ ایضاً، صفحہ 127

11۔ ایوب خان، ایوب خان کی ڈائری1966-72ء ، جمعرات28نومبر1968ء ، (آکسفورڈ)، صفحہ287

12۔ ایضاً، اتوار 8دسمبر 1968ء ، صفحہ 289

13۔ ڈاکٹر مبشر حسن، پاکستان کے بحران اور ان کا حل، صفحہ 49-55

14. ایوب خان، ایوب خان کی ڈائری72-1966ء ،اتوار9مارچ1969ء ، (آکسفورڈ)، صفحہ305
15. ایضاً، جمعرات، 20مارچ1969ء ، صفحہ 308
16. بشیر بختیار، فلپ ای جونز کے ساتھ لیبر ہال میں انٹرویو، نسبت روڈ لاہور،
31اکتوبر1973ء ، شائع شدہ "پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان"، صفحہ 166
17. فیلڈمین ، بحران سے بحران تک (انگریزی)،صفحہ 261
18. پاکستان ٹائمز، 19مارچ1969ء
19. مصنف سے انٹرویو، ستمبر 2008ء
20. سکرنڈ کانفرنس، ہفت روزہ لیل و نہار، کراچی، 19جولائی 1970ء
21. منہاج برنا، پی ایف یو جے ایک تحریک، www.pfuj.info
22. ایضاً
23. ڈان 3مارچ 1969ء
24. فلپ ای جونز ،" پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان"(انگریزی)، (آکسفورڈ)، 2003،
صفحہ 324
25. مصنف سے انٹرویو، جون 1996ء ، راولپنڈی

انقلاب کی گواہی
1968-69ء کی انقلابی بغاوت کے سپاہی

انسان اپنی تاریخ خود بناتے ہیں۔ لیکن ایسا وہ اپنی مرضی سے نہیں کرتے ' وہ جن حالات میں ایسا کرتے ہیں وہ انہوں نے خود منتخب نہیں کیے ہوتے بلکہ ماضی سے وراثت میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماضی کی تمام نسلوں کی روایات زندہ انسانوں کے ذہنوں میں ایک ڈرائونے خواب کی طرح بسی ہوتی ہیں۔ اور جب وہ خود میں اور حالات میں انقلابی تبدیلی لاتے ہیں' کچھ نیا تخلیق کرتے ہیں جو ماضی میں نہیں ہوتا۔ تو یہی وہ انقلابی بحران کے حالات ہوتے ہیں جب وہ ماضی کی طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور ماضی کے نام ' جنگی ترانے اور لباس زندہ کرتے ہیں تاکہ عالمی تاریخ کو تبدیل کرنے کے لیے برسرپیکار ہوسکیں"۔(1)

کارل مارکس(1818-1883ء)

1968/69ء کے عظیم واقعات میں لاکھوں مزدوروں' کسانوں اور طالبعلموں نے شرکت کی تھی۔انسانوں کی ایک پوری نسل پاکستان میں اپنی تقدیریں بدلنے کیلئے تاریخ کے میدان میں اتر پڑی تھی جو کامیابی کیلئے لڑی اور ایک انقلاب کیلئے ان سے جو کچھ بن پڑاوہ کر کے دکھادیا۔ پچھلے چالیس سالوں کے دوران بہت سے افراد جو ان زندہ واقعات میں سرگرم رہے اب ہم میں نہیں رہے ہیں مگرایسے کچھ لوگ اب بھی موجودہیں جن کے سینے ان زندہ و تابندہ واقعات سے ابھی تک سلگ رہے ہیں اور جن کی یادیں ان روشن دنوں کی حدت سے منور ہیں۔ہمیں ایسے ہی کچھ ساتھیوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں سے چند ایک کے ساتھ مصنف کے دیرینہ مراسم بھی ہیں۔ہم نے اس حوالے سے ان دوستوں کے انٹرویوکیے اور ان سے اس انقلاب کی یادیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو شاید اب سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئی۔

عثمان بلوچ (کراچی)

اس انقلاب کے نمایاں ترین ساتھیوں میں سے ایک بڑانام مزدوررہنما عثمان بلوچ کا ہے،عثمان کو اس عظیم انقلابی تحریک میں بہت نمایاں شہرت حاصل ہوئی۔کراچی میں مزدوروں کے ایک علاقے سے تعلق رکھنے والے عثمان کو ایک افسانوی کردار کی طرح سے یادکیاجاتاہے جس سے ا س تحریک کے دوران جرات وبہادری کی بڑی بڑی داستانیں بھی منسوب ہوئیں جن میں سے کچھ کی عثمان نے تردید بھی کی ۔ مصنف کے ساتھ اپنے انٹرویومیں اس نے انقلابی تحریک کو انتہائی جوش وجذبے کے ساتھ یاد کیا۔ 60کی دہائی میں وہ ایک نوجوان تھا جس کے والد گریکس سالٹ کمپنی ماڑی پور کراچی میں کام کرتے تھے اوروہاں کی یونین کے لیڈر تھے۔ان کی رہائش لیاری میں تھی جہاں ہزاروں مزدور رہتے تھے جو زیادہ تر غیر روایتی شعبہ جات سے تعلق رکھتے تھے۔اس کے والد اکثر اپنے مزدورساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر یونین کے معاملات اور مالکان کے برتائو کے بارے میں اور ان سے تنازعات پر گفتگوکیاکرتے تھے۔جسے یہ نوجوان بڑی توجہ سے سناکرتاتھا۔

یہ وہ دن تھے جب مزدوروں کے حقوق تسلیم نہیں کیے گئے تھے اور مالکان اپنی مرضی سے سب کچھ کیاکرتے تھے۔اگر کوئی بھی اپنے حقوق کے بارے میں بات یا مطالبہ کرتا تو اسے مادر وطن کا غداراور بھارت کا ہمدرد قرار دے دیاجاتاتھا۔بہت سے دوسرے نوجوانوں کی طرح سے عثمان بھی سوشلزم کے انقلابی نظریات سے متاثرہورہاتھا اور مارکسی لٹریچر پڑھ رہاتھا۔اس نے جوانی میں ہی لینن کی دوکتابوں ”ریاست اور انقلاب“ اور ”کیا کیا جائے“ اور دستوفیسکی کی ”جرم و سزا“ کو پڑھ لیاتھا۔اپنی جوانی میں ہی اسے ریاست کے کردار کے بارے میں ادراک حاصل ہونا شروع ہوگیاتھا ۔جس واقعے نے اسے اور کئی دوسرے نوجوانوں کو سب سے زیادہ متاثرکیا تھا وہ 1963ء میں کراچی میں ہونے والی عام ہڑتال تھی جوکئی دنوں تک چلی اور جس میں بھاری تعداد میں مزدورو ں نے حصہ لیاتھا۔ اس نے مزدوروں کے شعور پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔سب سے اہم سبق اس ہڑتال سے جو سامنے آیاوہ ٹریڈیونین قیادت کی اپنے ہڑتالی محنت کشوں کے ساتھ کی جانے والی غداری تھی۔مزدوراپنے حقوق کیلئے لڑنے کو تیار تھے جبکہ ان کی قیادت ظالم انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات اورمصالحت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔عثمان نے مجھے بتایا کہ اکثر لیڈرحضرات پولیس کی ایک وین میں آئے اور ورکروں سے اپیل کی کہ وہ ہڑتال کو ختم کر دیں۔کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے حاکم اعلیٰ ڈپٹی کمشنر نے لیڈروں کے ساتھ کیے گئے سبھی معاہدے یک جنبش قلم منسوخ کردیئے اور حکم دیا کہ اس کے احکامات پر

عملدرآمد یقینی بنایا جائے۔لیڈروں کی مصالحت نے محنت کشوں کے ان پر اعتمادکو ہلاکے رکھ دیا۔اس ہڑتال کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ اسے صنعتی علاقے سے باہرعام لوگوں کے ساتھ نہیں جوڑا گیاتھا جس کی وجہ سے یہ شہریوں کی حمایت اورہمدردی حاصل نہیں کرسکی تھی۔ہڑتال کے بعد ریاستی ادارے اور رائے عامہ مزدوروں کے خلاف ہوتی چلی گئی۔

ایک اور اہم واقعہ جو عثمان نے بتایاوہ1967ء میں اس وقت پیش آیا جب ایوب خان کراچی شپ یارڈپر ایک نئے بحری جہاز ایس ۔ایس۔ شمس کا افتتاح کرنے آنے والاتھا۔صدر پاکستان کے والہانہ استقبال کی بھرپورتیاریاں زوروں پر تھیں۔ایک ظہرانہ بھی دیاجارہاتھا۔افتتاح سے پہلے شپ یارڈ کے مزدوروں نے اپنی اجرتوں میں اضافے ، بونس اور بہتر حالات کار کے مطالبات پیش کر دیے۔ایوب جو اس وقت مکمل اقتدار کے مزے میں تھا اور فیلڈمارشل بھی تھا۔اس نے انتہائی رعونت سے مزدوروں کی بات ماننے سے انکارکردیا ۔جس سے مزدورغصے میں آگئے ،انہوں نے ظہرانے کیلئے سجی دھجی سبھی میزیں الٹ دیں اور کراکری کو اٹھاکے سمندرمیں پھینک دیا۔جبکہ انہوں نے ایوب کے خلاف سخت نعرے بازی بھی شروع کردی۔

عثمان بلوچ کا اہم کارنامہ کراچی اٹامک نیوکلیر پاورپلانٹ(KANUPP)میں یونین کی تشکیل تھا۔ ان دنوں میں کینیڈاکے تعاون سے اس کی تعمیرکی جارہی تھی اور اسے ریاست کے اہم سٹریٹجک ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔چنانچہ یہاں ٹریڈ یونین ازم سمیت ہر قسم کی سرگرمی مجرمانہ قرارپائی تھی ۔ ان دنوں تعمیراتی کام کے مزدوروں کے ساتھ غلاموں کی طرح کا برتائو کیاجاتاتھا اور ان سے جانوروں کی طرح کام لیاجاتاتھا۔ ان کو کم

اجرتیں ملتی تھیں اور سوشل سکیورٹی کا کوئی نام ونشان تک نہیں ہوتا تھا۔ سارے مغربی پاکستان سے تعمیراتی مزدور کام اورروزگار کی تلاش میں کراچی کی طرف کھنچے آرہے تھے۔یہاں تک کہ منگلاڈیم پروجیکٹ سے فارغ ہونے والے مزدور بھی ان میں شامل تھے۔کراچی کی ٹریڈ یونین قیادت کی اکثریت غیر روایتی شعبہ جات کے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے خائف تھی۔عثمان بلوچ نے ایسے مزدوروں کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھایااور انہیں ان کے حقوق کے حصول کیلئے رہنمائی فراہم کرنا شروع کردی۔عثمان کے بقول ان دنوں یہ خاصا پیچیدہ اور مشکل مرحلہ ہوتاتھا کہ آپ باہر سے آئے ہوئے مزدوروں کا اعتماد جیت سکیں۔مگر ان کے ساتھ قریبی رابطے اور ان کے فارغ اوقات میں روزانہ کی میٹنگوں کے ذریعے ،عثمان نے نہ صرف ان کا اعتماد جیتا بلکہ ان کے ساتھ ذاتی سرگرم اورپرجوش تعلقات بھی مستحکم کرلیے۔کچھ مہینوں کے اندر ایک یونین کی تشکیل کا مرحلہ طے پاگیاجس کا صدر عثمان بلوچ کو بنایا گیا۔ جب وہ لیبر ڈیپارٹمنٹ اس کو

رجسٹر کرانے کیلئے گئے تو ان کو صاف انکار کردیاگیا کہ اس قسم کی نیوکلیئر پاورپلانٹ جیسی حساس جگہوں پرکسی قسم کی سرگرمی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

مگر مزدوروں کا اپنا ہی مسئلہ اور ایجنڈاتھا۔انہوں نے 26اکتوبر 1968ء کی شام پلانٹ پر قبضہ کرلیا ۔ مزدوروں نے سارے گیٹ بندکرکے گارڈز کے فرائض سنبھال لیے۔سبھی غیرملکی انتظامی افسران محصور ہوکے رہ گئے۔یہ محاصرہ کئی گھنٹے ہی جاری رہا اور پھر مزدوروں نے رضاکارانہ طورپر اسے ختم بھی کردیا۔یہ ریاست کیلئے ایک واضح انتباہ اور اعلان تھا۔مزدوروں نے یہ منصوبہ بنایاتھا کہ اس طریقے سے وہ اپنے غصے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کریں گے۔اس محاصرے کے بعد پلانٹ کے 2500 مزدوروں کے سبھی مطالبات لیبرڈیپارٹمنٹ کی فوری مداخلت سے ، رجسٹریشن اور اجرتوں کی بروقت ادائیگی سمیت تسلیم کرلیے گئے ۔ یحییٰ کے مارشل لاکے بعد فوج نے ہر سٹریٹجک ادارے کا کنٹرول سنبھال لیاتھا مگر اس ادارے کومارشل لا لگنے سے ایک ماہ پہلے ہی کنٹرول کرلیا گیا تھا۔

10اکتوبر1969ء کو عثمان اپنے 62مزدورساتھیوں کے ہمراہ MLC(میکڈونلڈ لیٹن کیسٹن) ویسٹ وہارف سے اس وقت گرفتار کرلیاگیا جب وہ ادارے میں تعمیراتی کام کرنے والوں کو منظم کرنے میں مصروف تھا۔گرفتاری کے وقت وہ انتظامیہ کے ساتھ ان مزدوروں کے مطالبات کیلئے مذاکرات کر رہاتھا۔اسے ایک سال کی سزاسنا دی گئی۔اس کی سرگرمیوں اور مقبولیت سے ٹریڈیونین کی روایتی قیادت اس سے حاسد اور خائف ہونے لگی اورانہوں نے عثمان بلوچ پر کمیونسٹ ہوجانے کا الزام عائد کر دیا۔ عثمان بلوچ کے لی مارکیٹ اورگزری کے تعمیراتی مزدوروں سمیت رشیدٹیکسٹائل ملز، ولیکا ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کے ساتھ بھی گہرے روابط اور تعلقات استوار تھے۔ وہ کسی طور کوئی نامی گرامی مزدور لیڈر نہیں تھا مگر مزدوروں اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ اس کے دکھ سکھ کے رشتوں نے اسے اپنے وقت کا مقبول ترین مزدور لیڈر بنا دیا۔وہ لینن کا ذوق وشوق سے مطالعہ کیاکرتاتھا

اوراس کا مداح تھا،وہ مزدوروں کے روزمرہ کے مسائل پرلیفلیٹس چھاپتارہتا تھا جس کیلئے وہ فنڈزبھی مزدوروں سے ہی لیتاتھا۔ہرمزدور پچاس پیسے یا ایک روپیہ فنڈدیتاتھا ،ان دنوں مزدور کی ماہانہ اوسط اجرت پچاس روپے تک ہوتی تھی۔فنڈزاکٹھاکرنے کیلئے مزدوروں کی ایک خصوصی ٹیم تشکیل دی جاتی تھی۔اس وقت کراچی میں دوردراز کے مختلف علاقوں اورقومیتوں کے مزدور جمع ہوتے جارہے تھے جن کیلئے کوئی بھی ایساایک پلیٹ فارم موجودنہیں‌تھا جس پر وہ متحدومنظم ہوسکتے ۔اس وقت ڈھیروں ٹریڈ یونین فیڈریشنز موجودتھیں مگر ان کے بالائی ڈھانچوں کو مزدوروں کے روزمرہ کے مسائل سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہوتاتھا۔عثمان نے ان سب

مختلف رنگوں‘علاقوں‌زبانوں اور قومیتوں کے مزدوروں کو اکٹھا کرنا اور انہیں‌ایک دوسرے کے قریب لاناشروع کیا۔شادی بیاہ اوردیگر سماجی تقریبات کے ذریعے طبقاتی جڑت اور ہم آہنگی پیداہونی شروع ہوگئی۔اس نے مزدوروں کو اس بات پر قائل اور آمادہ کیا کہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شراکت کتنی اہمیت رکھتی ہے،اس سے قطع نظرکہ مزدور کا رنگ‘ نسل یا قوم کون سی ہے۔

ایک اور اہم قدم جو ترویج دیاگیا وہ سالوں سخت کام کے بعد چھٹی لے کراپنے گھرجانے والے ہر مزدوربھائی کو الوداع کہناتھا۔ عام طورپر انتہائی دورافتادہ شمالی علاقہ جات کے مزدور دوتین ماہ کی طویل چھٹی پر جاتے تھے۔جب وہ واپس کام کیلئے لوٹ کر آتے توفیکٹری انتظامیہ ان کی سابقہ ملازمت کو شمار کرنے سے انکار کردیاکرتی تھی اور انہیں نئے سرے سے کام شروع کرنے کا کہتی۔اس طرزاستحصال کی وجہ سے انہیں کم اجرت پرکام دیا جاتااوروہ اسے قبول کرلینے پر مجبورہوتے تھے۔یوں‌چھٹی ان کیلئے کام سے ہی چھٹی کاباعث بن جاتی نہ کہ آرام وسکون کا۔انہیں‌بہت منت سماجت کے بعد ہی کام پردوبارہ رکھاجاتا۔انہیں دوردراز اپنے اہل خانہ کیلئے کمانا پڑتا تھا جبکہ ان کی بچتیں بھی نہ ہونے کے برابرہواکرتی تھیں۔

اپنے کسی دوردراز گھرجاتے ساتھی مزدورکو الوداع کرنے کی رسم کی بنیاد عثمان بلوچ نے ڈالی تھی۔یہ رسم معاشی طورپر مزدوروں کیلئے انتہائی سود مند ثابت ہوئی۔ سب سے پہلے ایک مزدورساتھی گھرجانے والے مزدور ساتھی کے لیے خالی بوری لے کر آتا تھا ۔جبکہ باقی ساتھی اس جانے والے کیلئے راشن اور دوسری اشیالے کر آتے تھے۔ان میں چینی‘ چائے‘گھی‘آٹاوغیرہ ہوتاتھا جو یہ مزدور اپنی اپنی جیبوں سے خریدکرلاتے۔جبکہ کئی اسے الوداع کہنے ریلوے سٹیشن تک جایاکرتے۔جب یہ مزدور اپنے گھر جاتے تو انتہائی خوش اور مطمئن ہوتے تھے کہ ہم خالی ہاتھ گھروں کونہیں جارہے ہیں۔یوں وہ زیادہ اطمینان اور خوشی سے گھروں میں اپنا وقت گزارتے تھے۔اس کے بعد واپس آنے والے مزدور کو کام پر دوبارہ نہ رکھنا انتظامیہ کیلئے مشکل ہوتا گیا کہ اب مزدور متحد ہوکر اپنادبائو بڑھا دیاکرتے تھے۔جب کوئی مینیجر کسی مزدورکوپہچاننے سے ہی مکر جاتاتھا تووہ سب بتاتے کہ ہم نے ہی تو اسے بہت سی چیزیں دے کر گھر بھیجا تھا۔ یوں اس سانجھ اوریکجہتی کی وجہ سے وہ اپنے روزگار پر واپس آجاتا۔ یہ باقی دوسری

روایتوں کی طرح ایک انتہائی شاندار اور جاندار ثقافت تھی جو اس وقت رواج پائی۔

ایسی ہی ثقافتی یکجہتی کی ایک اور شاندارمثال زیب تن ٹیکسٹائل ملز میں عمل میں لائی گئی جہاں عثمان مزدوروں کا رہنماتھا۔اس نے مزدوروں سے چندہ اکٹھا کرکے اس سے جمع ہونے ولی رقم سے وہاں چھوٹا سا ایک ہوٹل کھولا۔مزدوروں کو وہاں مفت کھانا ملتا جس کے پیسے مزدور ہی اکٹھے کرتے تھے۔ مزدور یہاں کھانے پینے کیلئے اکٹھے ہوتے

تھے اور یوں یہ جگہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنتی چلی گئی۔جہاں فارغ اوقات میں چائے اور بحثیں شروع ہوجاتی تھیں۔قرب وجوار کی فیکٹریوں سے بھی مزدور وہاں آنے لگ گئے۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کنٹین کی اہمیت اس کی جگہ کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔اور ایک وقت آیا کہ ہر وقت درجنوں مزدور وہاں جمع ہوتے تھے جو اپنے روزمرہ مسائل پر بحثیں کرتے‘ احتجاجی سرگرمیوں کے بارے میں لائحہ عمل بناتے‘ ثقافتی سرگرمیاں کرتے اوراپنے دکھ سکھ بانٹتے رہتے تھے۔جب تحریک شروع ہوئی تو یہی جگہ تھی جہاں سے مزدورجمع ہوکر سرگرمیاں مرتب اور منظم کیاکرتے تھے۔انتظامیہ نے سرتوڑ کوشش کی کہ یہ کسی طرح بندہوجائے مگر مزدوروں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔

ایک اہم واقعہ فروری 71ء میں اس وقت پیش آیاجب مزدوروں نے ولیکا ٹیکسٹائل ملز پر قبضہ کرلیا،عثمان بلوچ ہی تھا جواس جدوجہد کا روح رواں تھا۔مصنف کو اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے عثمان نے کہا کہ شروع میں ہمارا ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں تھامگر یہ تو مزدوروں کا اپنا ہی جوش جذبہ تھا کہ وہ اس حد تک جانے کوتیارہوگئے اور ایسا جراتمندانہ قدم اٹھالیا۔اس مل میں ایک انتہائی سرگرم مزدور سلیم ہوتاتھاجو مل مالکان کے خلاف جدوجہدمیں عثمان کے ساتھ شانہ بشانہ کام کررہا تھا۔عثمان کو اندیشہ تھاکہ اسے گرفتار کرلیاگیا تواس پر بدترین تشدد کیاجائے گا جس کے مزدوروں پر حوصلہ شکن اثرات مرتب ہوسکتے تھے۔مگر اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک مکمل ہڑتال بھی ابھی غیردانشمندانہ قدم ہوگی۔اس دن مل کے اندر اور باہرپولیس کی بھاری نفری تعینات کی گئی تھی جو سلیم اور دیگر مزدوروں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔عثمان بلوچ چاہتاتھا کہ سلیم کو کسی نہ کسی طرح فیکٹری سے باہر نکال کر کہیں چھپادیاجائے،یوں وہ گرفتاری سے بچ جائے گا جسے انتظامیہ ہر حال میں‌شفٹ تبدیلی کے وقت پکڑناچاہ رہی تھی۔ دوسرا رستہ یہ تھا کہ مزدوروں سے اپیل کی جائے کہ شفٹ نہ تبدیل ہو اور پرانی شفٹ ہی کام کرتی رہے۔ اس سے پولیس کو اسے گرفتار کرنے میں مشکل آئے گی۔جب شفٹ بدلنے کا وقت آیا تو انتظامیہ نے سلیم سے بحث مباحثہ شروع کردیاتاکہ وہ کسی طرح اشتعال میں آجائے۔پولیس کی بھاری نفری اور پھر انتظامیہ کی سلیم کے ساتھ تکرار سے مزدوروں میں اشتعال پھیلنا شروع ہوگیا اور انہوں نے گھنٹیاں بجاکر کام روکنا شروع کردیا۔فیکٹری کے سب دروازے بندکردیئے گئے اور پولیس کو باہر دھکیل دیا گیا۔

قبضے کے بعد مزدوروں نے سب سے پہلے خام مال کو سنبھالا تاکہ کوئی شرپسند اسے آگ نہ لگا

سکے۔مزدوروں کی ایک ہنگامی میٹنگ کی گئی جس میں طے ہوا کہ انتظامیہ یا پولیس کے کسی بھی فردکو فیکٹری حدودکے اندر نہیں آنے دیاجائے گا۔کچھ ہی بحث کے

بعد ایک انتظامی کمیٹی منتخب کرلی گئی جس نے جلدی سے ساری فیکٹری کا کنٹرول سنبھال لیا۔سپروائزرسٹاف کی چھٹی کرادی گئی۔مل کوچلانے کیلئے مختلف نوعیت کے اجتماعی فیصلے کیے گئے۔ اگرچہ یہ قبضہ چند دنوں تک ہی جاری رہامگر اس سے ایک بات ضرور آشکار ہوگئی کہ مزدور مل کو چلانے کی مکمل صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔اور یہ بات دیگر فیکٹریوں کے مزدوروں پر بھی عیاں ہوگئی اور ان کیلئے مثال بن گئی۔فیکٹری میٹنگ میں یہ فیصلہ کیاگیاتھا کہ پرانی پڑی ہوئی مشینری کو بیچنے کی بجائے اس کی مرمت کرکے اسے کام کے قابل بنایاجائے گا۔اسی طرح اکائونٹس اور اجرتوں کے بارے میں بھی کئی فیصلے کیے گئے مگران پرمکمل عملدرآمدنہیں کیاجاسکا۔اس سارے واقعے میں کوئی ایک چیز بھی گم یا چوری نہیں ہوئی ہاں البتہ جب پولیس فیکٹری میں داخل ہوئی تو کچھ سویٹرز اور جرابیں انہوں نے اٹھالی تھیں۔مزدوروں نے فیکٹری کی ہر چھوٹی بڑی چیز کومحفوظ رکھا۔کچھ دنوں بعد پولیس ‘فوج اور انتظامیہ نے مزدوروں سے کنٹرول چھڑانے کیلئے کریک ڈائون کردیا۔سرگرم مزدوروں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایاگیا جبکہ باقیوں پر بھی ظلم کا بازار گرم کر دیا گیا۔ 1972ء میں کراچی میں بے شمارفیکٹریوں پر مزدوروں نے کنٹرول کرلیاتھا۔ان میں سے ایک اہم دائودملز پرہونے والاقبضہ تھا جس کی قیادت عزیزالحسن اور ریاض احمد کر رہے تھے۔حکومت نے ان دونوں کو گرفتار کرلیا اور انہیں ہتھکڑیاں لگاکر عدالت میں پیش کیاگیا۔یہ قبضہ دس دنوں تک جاری رہاتھا۔

اس تحریک کا ایک اور اہم واقعہ وہ تھا جب عثمان بلوچ نے امریکی وزیردفاع رابرٹ میکنماراکو تھپڑ رسیدکردیاتھا۔وہ حیدرآبادمیں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کررہاتھا جب عثمان بلوچ اپنے حیدرآباد کے ایک معروف مزدورلیڈراور ساتھی احسان عظیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ۔ میکنمارا اپنی ساری سامراجی رعونت سمیت بیٹھا ہواتھا جبکہ پاکستانی افسرشاہی غلاموں کی طرح اس کی آئوبھگت کیے جارہی تھی۔اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے عثمان نے کہا کہ میں نے سوالات کے وقفے کے دوران اس سے امریکی محنت کشوں کی جدوجہد اور شکاگو کے مزدوروں کے حوالے سے سوال کیا جس پر اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں مزدوروں کے حقوق کی مکمل پاسداری ہوتی ہے اوروہ ہر قانونی معاملے میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔عثمان نے اسے کہا کہ بینک آف امریکہ جس کی برانچ پاکستان میں بھی ہے ،میں یونین سازی کی اجازت نہیں۔یہ بات کرتے وقت میں اس کے نزدیک پہنچتاچلاگیا۔میرے سوال پر میکنمارا کچھ پریشان ساہو گیا اور کہنے لگا کہ ہم یہاں ہر کسی ایرے غیرے کے منہ لگنے نہیں آئے ۔اس توہین آمیز فقرے کا جواب بلوچ نے میکنماراکے گال پرایک تھپڑکی شکل میں دیا۔عثمان نے امریکی سامراج مردہ باد کا نعرہ لگایا۔جس پر بھگدڑ سی مچ گئی۔عثمان کو ایک بارپھر گرفتار کر لیا گیا۔

پاکستان کی مزدورتحریک کا ایک اور بڑا واقعہ 6جون1972ء کوفیروزسلطان ملز میں پیش آیاتھاجب پیپلزپارٹی کی حکومت

برسراقتدار تھی۔اس واقعے کو بیان کرتے وقت عثمان بلوچ کی آنکھیں غصے ،دکھ اور اذیت سے سرخ ہوتی گئیں اور اس کی سانس تیز ہوتی چلی گئی۔

اس مل کی یونین کی قیادت کنیزفاطمہ کرتی تھی جو عثمان کی شہرت اور مقبولیت سے ہمیشہ خائف رہتی تھی۔وہ کراچی شپ یارڈ یونین کی بھی لیڈر تھی ۔کنیز فاطمہ نے مصنف کو انٹرویودیتے ہوئے بتایا کہ مزدور اجرتوں میں اضافے کی مانگ کر رہے تھے۔جس کے بعد میں نے انتظامیہ سے بات کی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی اتنا گھمبیر مسئلہ نہیں جس پراتنا شورمچایا جائے یہ دودنوں میں ہی طے ہو جائے گا۔اس گفتگو کے دوران کنیز فاطمہ نے عثمان بلوچ کی مہم جویانہ طبیعت پر اس کی سخت مذمت کی۔

عثمان بلوچ کے مطابق فیروزسلطان ملزکے مزدور اجرتوں کی عدم ادائیگی پر احتجاج کررہے تھے، اس کے ساتھ ہی انہیں بونس کی ادائیگی سے بھی انکارکردیاگیاتھا۔انتظامیہ مزدوروں کے رویے سے کئی سالوں سے تنگ آئی ہوئی تھی اور انہیں سبق سکھانے اورکچلنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ پولیس کو بلاکر اسے مزدوروں کے خلاف کاروائی کرنے کا کہہ دیاگیا۔

پولیس انسپکٹر نے مزدوروں کو دیکھتے ہی اپنے پستول سے فائرنگ کردی جس سے تین مزدور ہلاک ہو گئے۔انتظامیہ نے دو مزدوروں کی لاشیں لے جانے کی کوشش کی مگر مزدوروں نے ان میں سے ایک شعیب خان کی لاش واپس لے لی اور اسے اٹھاکر پٹھان کالونی لے گئے جو ہزاروں مزدوروں کی رہائشی آبادی تھی۔عثمان بلوچ زیب تن ملز سے ہزاروں مزدوروں کا جلوس لے کر پہنچا جو فیروزسلطان ملزکے مزدوروں کے ساتھ آملا۔اسی دن ہی ٹریڈیونینز فیڈریشن کی ایک میٹنگ بھی ہونی تھی جس میں مزدوروں کے مطالبات ترتیب دیئے جانے تھے۔پولیس کو اطلاع ملی تو اس نے میٹنگ کی جگہ پر چھاپہ مارا،سبھی ٹریڈیونین لیڈرزیر زمین چلے گئے۔

اس کیفیت میں عثمان بلوچ اکیلاہی رہ گیا جسے مزدوروں کو سنبھالناتھا۔جب پولیس فائرنگ سے ہلاک ہونے والے مزدورکی لاش پٹھان کالونی پہنچی توہزاروں کی تعدادمیں جمع ہوجانے والے مزدوروں میں سخت اشتعال اور غم وغصہ پھیل گیا اور انہوں نے احتجاج شروع کردیا۔عثمان بلوچ نے مزدوروں سے کہا کہ لاش کو ایک جلوس کی شکل میں گورنرہائوس لے کر چلا جائے۔ مزدور انتہائی جوش میں تھے اور راستے میں جو بھی رکاوٹ نظر آئی وہ اسے تہس نہس کرتے چلے گئے۔کراچی میں جس مزدورکو بھی اس واقعے کا پتہ چلا وہ یکجہتی کیلئے پہنچنا شروع ہو گیایوں ان کی تعداد بڑھتی ہی چلی

گئی۔جب یہ جلوس پٹھان کالونی سے نکلنے لگا تو پولیس کی بہت بھاری تعدادان پربندوقیں تانے موجودتھی۔کالونی سے نکلتے ہی پولیس نے ان پر فائرنگ شروع کردی اورتین مزید مزدور جاں بحق کر دیئے گئے۔پولیس نے اعلان کیاکہ جو بھی آگے بڑھے گا اسے مار دیا جائے گا۔جلوس میں شریک مزدوروں کا جوش وجذبہ بھی بھڑکاہواتھا اور وہ ہر صورتحال سے نمٹنے کیلئے تیار تھے۔جبکہ پولیس کو بھی حکم تھا کہ انہیں کسی طور آگے نہیں بڑھنے
دیاجائے۔

پولیس نے جلوس کے شرکاکو دھمکیاں دینی شروع کر دیں جس پر عثمان نے مزدوروں سے کہا کہ بیس قبریں مزید بھی تیار کی جائیں۔"میرا یہ کہنے کا ایک ہی مقصدتھا کہ مزدوروں کے حوصلے کو بلند رکھا جائے۔ ہم حکومت کو پیغام دینا چاہتے تھے کہ ہم بدترین حالات کیلئے بھی تیار ہیں مگر اپنے مطالبات سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ان قبروں کی تصویریں اگلے دن روزنامہ مشرق میں بھی شائع ہوئیں۔

پھر حکومت اور انتظامیہ کے نمائندوں نے ملاقات میں کہا کہ ہم بیٹھ کر بات چیت کے ذریعے آرام وسکون سے معاملات طے کرناچاہتے ہیں۔اس وقت تک بڑی تعداد میں مزدور گرفتار بھی ہو چکے تھے۔عثمان کے الفاظ میں وہ متذبذب تھا کہ مذاکرات کیلئے جائے یا نہ جائے۔کئی مزدوروں نے عثمان سے کہا کہ وہ مذاکرات کیلئے نہ جائے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اسے گرفتار کرکے اس پر بدترین تشدد کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے قتل بھی کیاجاسکتاہے۔مگر پھر بھی اس نے جانے کا فیصلہ کیا یہ سوچتے ہوئے کہ پیپلزپارٹی کی نئی حکومت آئی ہے اور ایسا نہ ہو کہ میرے کسی اقدام کی وجہ سے یہ اپنے مزدورپروگرام سے ہی دستبردار ہوجائے۔پارٹی کے وزیر محنت ستار گبول کے ساتھ عثمان بلوچ کے مذاکرات شروع ہو گئے جو اسی علاقے لیاری سے ہی منتخب ہواتھا جہاں عثمان بلوچ بھی رہتاتھا۔

گبول کو مزدوروں کے مسائل و معاملات کے بارے میں آگاہی نہ ہونے کے برابرتھی۔مذاکرات کے دوران عثمان نے جب بھی ایک نیا ایشو سامنے رکھا تو گبول پیٹ میں خرابی کا کہہ کر کھڑاہوجاتا اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا۔عثمان نے اس سے پوچھا کہ اسے معدے کی زیادہ تکلیف تو نہیں ہے!ایک بار جب گبول ٹائلٹ جانے کا کہہ کر گیا تو اس دوران ایک ملازم چائے لے کر آگیا اس نے بلوچی زبان میں عثمان کو بتایا کہ وہ افسروں کے سامنے بات کرنے سے ڈرتاہے،اصل معاملہ یوں ہے کہ ساتھ والے کمرے میں ایک بکائو مزدور رہنما موجود ہے جو وزیرموصوف کورہنمائی اورہدایات دے رہا ہے۔وہ آدمی دراصل اپنے وقت کا ایک معروف مائواسٹ تھا۔عثمان نے وزیرموصوف سے پوچھا کہ کیا حکومت اپنے سوشلسٹ پروگرام پر عملدرآمدکرنے کا ارادہ رکھتی ہے یا پھر

مزدوروں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی پڑے گی۔عثمان نے پٹھان کالونی سمیت مزدوروں کے سبھی رہائشی علاقوں میں بجلی،سڑکوں،پانی ،سیوریج سمیت کئی دیگر سہولتوں کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔گبول نے وعدہ کیا کہ سبھی مطالبات تسلیم کرلیے گئے ہیں اور ان پر عملدرآمدہوجائے گا۔مگر اصلاح پسندوں سے کوئی وعدہ وفا نہیں کیا جاسکااور یہ سب مذاکرات محض جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی ایک چال اور ڈھونگ ہی تھا۔

اس واقعہ نے لانڈھی،سائٹ اورکراچی کے دیگر صنعتی علاقوں سمیت حیدر‘آبادملتان‘ لاہور اور دوسرے شہروں کے مزدوروں پرگہرے اثرات مرتب کیے۔اگلے ہی دن سبھی ٹریڈیونین لیڈروں نے عثمان کو مہم جو ،خبطی‘

موقع پرست وغیرہ قراردے دیا،پیپلزپارٹی کے لیڈروں نے اسے کمیونسٹ جبکہ سٹالنسٹوں نے اس پر پیپلزپارٹی کا کٹھ پتلی ہونے کا الزام عائد کردیا۔پاکستان نیشنل فیڈریشن آف ٹریڈیونینز کی ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں عثمان کو مزدوروں کے مفادات کا دشمن قرار دیاگیا۔اس میٹنگ سے قبل فیڈریشن بھٹو کی سخت مخالف تھی۔مگر اس واقعے کے بعد ان کی بھٹو کے ساتھ کراچی میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ معاملات طے کیے اور فیصلہ کیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ بھرپورتعاون جاری رکھا جائے گا۔فیڈریشن والوں نے بھٹو سے کہا کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں مگر عثمان کے ساتھ آپ خودبات کریں۔جس پربھٹو نے عثمان کو دھمکی دی کہ یا تو تم بازآجائویاپھر انجام کیلئے تیار رہو۔تب سے عثمان اوربھٹوکے مابین قائم طویل تعلق ختم ہوگیا۔

بھٹو، ایوب کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد ایک مقبول لیڈر کے طورپر ابھرناچاہتاتھا۔وہ ایسے لوگوں کے بارے میں پتہ کرتا رہتا تھا جن کی مزدوروں اورعام لوگوں میں مقبولیت اور شہرت ہو۔عثمان کے بھی پٹھان کالونی،فرنٹیر کالونی اور سائٹ کے رہائشیوں سے تعلقات تھے۔بھٹو عام طورپر کراچی کے مزدوروں کی ہمدردی اورحمایت کے حصول کیلئے عثمان بلوچ سے مشاورت کرتارہتاتھا۔عثمان نے ہی بھٹو سے کہاتھا کہ وہ لیاری جاکرمزدوروں کے چھوٹے سے ہوٹل، رحمان ہوٹل میں جاکر ان کے ساتھ کھانا کھائے۔اور پھر اس کے بعدوہاں قریب ہی واقع چاکیواڑہ چوک میںسلیمانی چائے والے سے چائے پیئے اور قریبی کھوکھے سے پان لے کر کھائے۔”جب تم اپنا بٹوہ نکال کر پیسے دینے لگو گے تو وہ کہے گا ارے بھٹوصاحب تواپنا بھائی ہے تیرے سے پیسے نہیں لے گا۔اگر اس نے ایسا کہہ دیا تو سمجھ لو تم مزدوروں کا دل جیتنے میں کامیاب ہو چکے ہو“۔بھٹو اگلے دن اپنی کارمیں لیاری کی مٹی سے اٹی گلیوں میں سے ہوتا ہوا اس چھوٹے سے رحمان ہوٹل میں پہنچا اور پھر وہاں سے سیدھا سلیمانی چائے والے کے پاس چلاگیا۔بھٹو نے اس کے ساتھ کھلے دل سے گپ شپ لگائی اور گرمجوشی کے ساتھ اس سے باتیں کیں۔جب اس نے

پان اور سگریٹ کے پیسے دینے چاہے تو چائے والے نے اسے کہا کہ چھوڑیں جی آپ تومیرے بھائی ہو۔یوں پہلی بار بھٹو نے لیاری میں اپنے قدم جمائے، تب سے اب تک یہ پیپلزپارٹی کا گڑھ چلا آرہاہے۔

ان دنوں محنت کش عام طورپر ہفتہ وارچھٹی کے موقع پر 20/30 کی ٹولیوں میں سینما دیکھنے جایاکرتے تھے۔عثمان نے بھٹو سے کہا کہ وہ اس موقع پربمبینو سینما جائے جب شو ختم ہورہاہومگر ایسا تاثردے کہ وہ وہاں سے گزررہاتھا ۔میں بھی اپنے ساتھیوں سمیت وہاں پہنچ جاؤں گا وہاں بہت دوست اکٹھے ہوں گے۔اگلے دن بھٹو شوختم ہونے کے وقت سینماپہنچا جہاں ایک انگلش فلم لگی ہوئی تھی۔عثمان اپنے تیس ساتھیوں سمیت فلم دیکھنے پہنچاہواتھا۔اس نے جیسے ہی بھٹو کو دیکھا تو ساتھیوں سے کہا وہ دیکھو بھٹو آیا ہواہے آئو اس سے ملتے ہیں۔یہ سب بھٹو کے پاس پہنچ گئے اور کچھ ہی دیر میں بھٹو کے پاس ہجوم اکٹھا ہوگیا۔عثمان بلوچ آج بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ

صرف سوشلزم ہی سرمایہ داری نظام کی دی گئی محرومیوں کا واحد حل ہے۔

ڈاکٹر مبشرحسن (لاہور)

پیشے کے اعتبار سے انجینئرڈاکٹرمبشر حسن کا شمار پیپلزپارٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔پارٹی کا تاسیسی کنونشن بھی مین بلیوارڈ گلبرگ میں واقع مبشرحسن کے گھرکے لان میں ہی ہواتھا۔کنونشن میں شریک کسی کوبھی شاید اس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ وہ ایک تاریخ ساز میٹنگ میں شریک ہورہاہے جس میں ایک نئی پارٹی تشکیل دی جارہی ہے کہ جس پارٹی نے پاکستان کی تاریخ میں مختصر ترین وقت میں عوام کی سیاسی روایت بن جاناہے۔ان 41 سالوں کے دوران کیا کچھ نہیں بدلا مگر یہ گھر اب تک ویسے کا ویسا ہے۔اس کا فرنیچر' اس کا طرز تعمیر یہاں تک کہ ڈاکٹر مبشر کی گاڑی ووکس ویگن تک بھی وہی ویسی کی ویسی ہے۔مین بلیوارڈ کے اس علاقے کا' اس وقت کا شاید ہی کوئی گھر بچاہو جو ایک بڑے عظیم الشان پلازے میں نہ ڈھل چکا ہو۔یہاں جائیدادوں کی قیمتیں انتہائوں کو پہنچی ہوئی ہیں۔مگر یہ ڈاکٹر مبشرکاہی کمال ہے کہ یہ گھر ابھی تک ویسے کا ویسے قائم رکھاہواہے۔

چالیس سال پہلے کے ان واقعات پر اپنے گھر میں گفتگوکرتے ہوئے ڈاکٹر مبشر حسن نے 1968/69ء کے بارے میں اپنے احساسات سے آگاہ کیا۔ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے وقت انکی آنکھیں جیسے انہی انقلابی لمحات کے جگمگاتے جذبات سے منورہورہی تھیں۔ڈاکٹر مبشر نے بتایا کہ پیپلزپارٹی کی بنیادی دستاویزات کی تیاری میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ لگاتھا۔جنوری 'فروری 1967ء میں ریلوے کی ہڑتال نے ایک عجیب وغریب سرشاری کی کیفیت طاری کر دی تھی۔اس ہڑتال نے بائیں بازو میں ایک نئی امید اور امنگ بھر دی تھی۔اور بہت سے بائیں بازو کے کارکن جو سٹالنزم کی

جکڑبندیوں اور گھٹن سے اکتا چکے تھے ان کو ایک نئے راستے اور وسیلے کی جستجوتھی۔یہی وہ جستجو اورلگن تھی جو کہ پی پی پی کی تشکیل کا سبب اور اس کے سوشلسٹ پروگرام کی بنیاد بھی بنی۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے بقول پارٹی کی بنیادی دستاویزتین مقالوں کی روشنی میں تیار ہوئی تھی جو بھٹو،جلال الدین اکبر رحیم اورڈاکٹر مبشر نے تیار کیے تھے۔بھٹو نے ایک نئی پارٹی کی ضرورت،سماجی ومعاشی و سیاسی بحران،رحیم نے سوشلزم کی ضرورت اور سماج کی تبدیلی جبکہ مبشر نے معاشی پالیسیوں کی تفصیلات کو اپنا موضوع بنایا۔جن میں صحت‘تعلیم اور انفراسٹرکچر کو سوشلسٹ تناظر میں پیش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر کے بقول اس تاسیسی کنونشن میں کسی بھی قسم کی کے مذہبی کلمات نہیں پڑھے گئے تھے جو عمومی طورپر آج پاکستانی سیاست کا وطیرہ ہے۔مبشرنے اس بات پر زوردیا کہ پارٹی کا چیئرمین بھٹو پاکستان کے کسی بھی جاگیردار کے مقابلے میں سب سے زیادہ سرمایہ داروں کے خلاف تھا۔یہی وجہ تھی کہ سارا روایتی بایاں بازو نوخیز سرمایہ داروں کا حمایتی تھا جبکہ بھٹواور پیپلزپارٹی نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بلندکی اور بورژوا حکمرانی اور نظام کے خلاف نعرہ لگایا۔تاہم مبشر حسن سے گفتگو کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ 1967ء کے کنونش میں شریک تقریباًسبھی شرکا سائنسی

سوشلزم اور مارکسی فلسفے و معیشت کے بارے میں بہت ہی کم یا بالکل ہی نہیں جانتے تھے۔اس کے باوجوداس تاریخی کنونشن کے سبھی شرکا سوشلزم کے حوالے سے جوش وجذبے سے معمور تھے۔یہ کنونشن ایوب آمریت کے جبر کے سائے تلے منعقدہواتھااور انتظامیہ نے اس کے انعقاد کو روکنے کیلئے کئی حربے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ہمیں کوئی ہال یا عمارت استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی جہاں عام طورپر ایسی تقریبات کی جاتی ہیں۔چاروناچار میرے گھرمیں یہ کنونشن کرانے کا فیصلہ کیاگیا۔

یہ کنونشن ایک نیم خفیہ اور پراسرار ماحول میں منعقدہورہاتھاکیونکہ حکومت کو اس بات کا تصور تک بھی نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ پارٹی کیا کیا کرے گی۔ایوب خان کو خود بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔اس نے اپنی ڈائریوں میں بھی لکھاہے کہ ”سرکاری پریس کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ بھٹو دودن کا کوئی کنونشن کررہاہے جس میں وہ کوئی نام نہادپیپلز پارٹی بنانے جارہاہے۔رپورٹوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب فضول اور بچگانہ سرگرمی ہے،وہ طلبہ کو غلط استعمال کررہاہے ۔وہ آگ سے کھیل رہاہے ۔لیکن ہم اس کی سرگرمیوں پر نظررکھے ہوئے ہیں۔اگر اس نے حدود سے تجاوزکیا تو اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی“(2)

اپنی بحث میں مبشرحسن نے ایک اوراہم پہلو کی بھی نشاندہی کی کہ ایوب کے رخصت ہونے کے باوجود تحریک نہیں رکی تھی،جیسا کہ عام طور پر تاثر پایا جاتاہے۔

تحریک نے ہی 70ئکے الیکشن میں فیصلہ کن کردار ادا کیاتھا۔حالانکہ ان کا مقصد ہی یہی تھا کہ تحریک کا رخ موڑدیا جائے اورالیکشن کی طرف لے جاکر اس کے انقلابی جذبے کو انتخابی جذبے میں تبدیل کردیاجائے۔الیکشن کے دوران پیپلزپارٹی انتہائی تیزی کے ساتھ پھلتی پھولتی چلی جارہی تھی۔لاہور جو ان دنوں آج کی نسبت بہت کم آبادی کا حامل شہر تھا،یہاں پارٹی کے 450تنظیمی یونٹ اس انقلابی دھارے کے نتیجے میں قائم ہو چکے تھے۔ بلاشبہ یہ کسی بالشویک پارٹی کے یونٹ نہیں تھے کیونکہ جس تیزی کے ساتھ انقلابی واقعات وقوع پذیر ہوتے چلے جارہے تھے ،ان حالات کی موجودگی میں انقلابی‘ نظریاتی اور تنظیمی تعلیم وتربیت کے امکانات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم یہ جیسی تیسی ایک کمزورکاوش تھی جس کی کوئی نظریاتی اساس تھی نہ ہی اس کے ڈھانچے لیننسٹ جمہوری مرکزیت کے تنظیمی اصولوں پر مبنی تھے۔نہ تو ان کی پیش بندی کی گئی تھی ،نہ ہی قیادت اس کیلئے تیار تھی اور نہ ہی اسے توقع تھی کہ حالات اس قدر تیزی سے اس نوعیت اور شدت کے ساتھ سامنے آتے جائیں گے۔سوشلزم کیلئے جوش‘ جذبہ‘ امنگ اور ترنگ دیدنی تھا مگر اس کیلئے درکار نظریے کی گہری سمجھ بوجھ اورانقلاب کرنے کی حکمت عملی مفقود تھی کہ جس سے تحریک کو انقلاب میں تبدیل کردیاجاتا۔

ڈاکٹر مبشر حسن کا کہنا تھا کہ لاہور میں قائم ہونے والی پارٹی تنظیمیں سوویتوں کی طرح سے ہی تھیں جو سماج کو چلانے کیلئے عمل میں لائی گئی تھیں۔انہوں نے جرائم کے کئی مراکز جن میں جوئے خانے کے اڈے وغیرہ شامل تھے کی نشاندہی اور قلع قمع کیااس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے اپنے علاقوں کے اندر سماجی نظام چلانے کی ذمہ

داری بھی سرانجام دینا شروع کر دی تھی۔ڈاکٹر مبشر نے کہا کہ کم از کم لاہور کی حد تک تو ایساہی کیاگیا تھاکیونکہ وہ خود یہاں قیادت کررہاتھا۔کمیٹیوں نے کئی ٹھگوں اور دیگرجرائم پیشہ گروہوں کا پتہ چلایا اورپھر شہریوں کی مددومعاونت سے ان کی سرگرمیوں اور تشددکی کاروائیوں کا سدباب بھی کیا۔ملائوں کا ان کمیٹیوں میں کوئی سماجی کردار نہیں تھا۔ان کمیٹیوں کو لاہور میں سبھی مزدوروں کے کوارٹروں اور پسماندہ علاقوں میں موثر کنٹرول حاصل تھا۔ان کمیٹیوں کو ایک طرف پولیس سمیت دیگرریاستی اداروں کے جبرواستحصال کو روکنے کا ذریعہ بنایاگیا تو دوسری طرف یہ نظم ونسق کے نظام کو سنبھالنے اور ضروری اشیاکی مناسب بروقت فراہمی کا کام بھی سرانجام دے رہی تھیں۔یہی کمیٹیاں ہی بعد ازاں الیکشن مہم کے دوران پیپلزپارٹی کی سرگرمیوں اور الیکشن میں اس کی شاندار کامیابیوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئیں۔انہی کی بدولت پاکستان کی تاریخ کے واحد غیرمتنازعہ نتائج سامنے آئے۔اس الیکشن میں بڑے بڑے نامی گرامی اور کبھی بھی شکست نہ کھانے والے امیدواروں کوپیپلزپارٹی کے نچلے اور

درمیانے طبقے کے امیدواروں نے تاریخی شکست سے دوچار کردیا۔

بھٹو کو سننے کیلئے لاکھوں لوگ جمع ہو جاتے تھے۔دوردراز سے بھی اس کے جلسے میں شریک ہونے کیلئے لوگ آتے تھے وہ اس کی تقریریں سننے کیلئے بیتاب ہوتے ،ان دنوں یہ تقریریں دن بدن انقلابی ہوتی جارہی تھیں۔ڈاکٹر مبشرحسن خود بھی اس الیکشن میں لاہور کے ایک شمال مشرقی حلقے سے امیدوار تھاجس کی 92%آبادی پرولتاریہ پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تر ریلوے مزدوراوران کے اہل خانہ شامل تھے۔اس حلقے سے مبشر حسن نے 87000ووٹ لے کر کامیابی حاصل کی تھی جبکہ جماعت اسلامی کے امیدوار نے 15000ووٹ اور سٹالنسٹ امیدوار کو صرف 4000ووٹ مل سکے 'وہ بھی ایک ایسے حلقے سے جو پرولتاریہ کا سب سے بڑاگڑھ تھا۔ڈاکٹر مبشرحسن نے ملک میں سب سے زیادہ ووٹ لیے تھے اور وہ پیپلزپارٹی کے اندر سوشلزم کی نمائندگی اور علمبرداری کرنے والوں کا سرخیل تھا۔

ذاکرحسین (مالاکنڈ)

پشتونخواہ میں جس کا برطانوی راج سے لے کر ابھی تک سرکاری نام این ڈبلیو ایف پی چلا آرہا ہے' انقلاب کی طوفانی لہریں اتنی ہی شدید تھیں جتنی کہیں اور۔کامریڈ ذاکر اس وقت سکول جانے والا ایک طالبعلم تھا جب 1968/69ء کا انقلاب پھٹ پڑاتھا۔ذاکر پر ان واقعات نے گہرے اثرات مرتب کیے اور اسے چھوٹی عمر میں ہی انقلابی کردیا۔کچھ ہی سالوں کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے یوتھ اینڈ سٹوڈنٹس ونگ پشتونخواہ کا صدر بن گیا۔مصنف کے ساتھ اپنی ملاقاتوں میں ذاکر نے ان واقعات کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیاکہ جن میں پشاور' مردان سمیت کئی شہروں اور علاقوں میں طلبہ اور نوجوانوں نے اس انقلابی تحریک میں جوش جذبے اور ولولے سے شرکت کی تھی۔سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس تحریک نے اپنا زور یونیورسٹیوں 'کالجوں اورسکولوں میں دکھایا جیسا کہ باقی ملک میں بھی ہواتھا۔لیکن پھر جلدہی نئے اور نوخیز پرولتاریہ نے بھی تاریخ کے اس میدان میں قدم رکھ دیا۔کئی فیکٹریوں میں ہڑتالیں اور قبضے ہونے شروع ہوگئے۔ان میں اہم مردان کی شوگرملز،بنوں ملز،کالونی ٹیکسٹائل ملز نوشہرہ،چارسدہ پیپر اینڈ شوگرملزسوات کی سلک پروسیسنگ فیکٹریز سمیت پشاور اور مالاکنڈ کی کئی ملیں شامل تھیں۔1972ء میں یہاں پولیس کی ہڑتال ہوئی جس نے سارے ملک کو ہلاکررکھ دیاتھا۔ملک کے ایک حساس صوبے میں قانون نافذ کرنے والے ادارے نے قانون کے خلاف ہی ہڑتال کر دی تھی۔مختلف بارایسوسی ایشنیں،انجینئراورسماج کے کئی دوسرے شعبے بھی اس انقلابی تحریک میں

بھرپورشریک ہو چکے تھے۔ اس خطے میں چلنے والی کسان تحریک(1960ء کی دہائی کے آخر اور 1970ء کی دہائی کے شروع میں)طبقاتی ابھار کے تاریخی عمل کافطری نتیجہ تھی۔اس تحریک کے پس پردہ عناصر سماجی ترقی کے عمل میں پوشیدہ تھے جو سرمایہ داری کے تحت پرانے سماجی بندھنوں کے خاتمے اورنئی سماجی شکلیں قائم کرنے کا تقاضا کررہے تھے۔یہ سماجی عمل پرانے جاگیرداری ڈھانچوں کو توڑنا چاہ رہاتھا۔زمینوں کے مالکان اپنے مزارعین پر بدترین تشدد کرتے چلے آرہے تھے۔یوں یہ سماجی تضادات پھٹنا شروع ہو چکے تھے۔اگرچہ یہ تحریک کسی طورکسان اقتدار حاصل نہیں کر سکی تھی اور ردانقلابی رجعتی میلانات کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔مگر یہ تحریک بڑی حد تک سماجی ڈھانچے میں نئی بنیادی تبدیلیوں کو ضرور جنم دے گئی تھی۔اس کی وجہ سے جاگیرداروں کا زمین پر اجارہ ختم یا کمزورہوگیا اور نئی سماجی پرتیں بھی زمین کی مالک بن گئیں۔اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ سے بیگار یا جبری مزدوری کا بھی خاتمہ ہوگیا۔اسی طرح یہ عرصہ قدیم سے چلی آرہی قبیح رسم ”بندھک مزدور“کو بھی ختم کرنے میں کامیاب رہی۔ماضی کی سبھی وہ جابرانہ روایتیں جو کسانوں کا مقدر بنی ہوئی تھیں ان کو اس تحریک نے تہس نہس کرکے رکھ دیا۔جس کی وجہ سے کسانوں کو کچھ سکھ چین کا زمانہ میسر آگیا۔برطانیہ کے سامراجیوں نے اپنے نوآبادیاتی تسلط کے دوران ایک جاگیردار اشرافیہ تشکیل دے کر اپنے استبداد کو تقویت دی تھی۔سامراج سے نوآبادیات کی طرف کے سفرمیں ایک نئی طرز کی گماشتہ بورژوازی(کمپراڈور بورژوازی) پیدا ہوئی ،جو اپنی طرز ، نوع اورتقاضوں کی وجہ سے رجعتی تھی،جسے یہ سب ان کے آقائوں کی طرف سے تفویض کیاگیاتھا۔

جاگیردارانہ طرزکے پیداواری تعلقات کی وجہ سے پختون علاقہ سخت گیر ظالمانہ ثقافت و مزاج کی گرفت میں چلا آرہاتھا۔زائدپیداوار اور پھرتاریخی ترقی کی وجہ سے تجارت نے قدم رکھا اوریوں سماجی ترتیب میں تبدیلی پیداہونی شروع ہو گئی۔جس سے کسانوں کی نسلوں سے رکی ہوئی نفسیات میں بھی ارتعاش اور بدلائو آناشروع ہوگیا۔پاکستان کے دیگر طبقات کی طرح سے پختون کسان بھی جدوجہد میں بھرپور شریک ہوئے۔اگر ایک سائنسی بنیادوں کی حامل انقلابی قیادت اور قوت موجودہوتی توکسانوں کی یہ شاندار جدوجہد عظیم اور تاریخی مقاصدکو یقینی طورپر حاصل کر سکتی تھی۔ موضوعی عنصر کہیں موجودہی نہیں تھا۔اس تحریک نے نئی اورچھوٹی زمینداری تو پیداکردی مگراس نے بھی سوائے مالکان کی ایک نئی پرت پیداکرنے کے کچھ نہیں کیا۔ اور اس سے زرعی سماج میں کوئی انقلابی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکی۔تحریک پشتونخواہ کے دیہاتی علاقوں پرہی مشتمل رہی ۔شہروں کے صنعتی مزدور طبقے یہاں تک کہ درمیانے طبقے سے اس کی جڑت بہت محدودرہی۔ اس علاقے میں دیہی سماج کا

طبقاتی ڈھانچہ چار طبقات کا حامل تھا' زمین کے مالکان،کسان 'کھیت مزدور اورٹھیکے پر زمین کاشت کرنے والے۔تحریک کی قیادت نے محض کسانوں تک ہی اپنی توجہ محدود رکھی جبکہ دیگر استحصال زدہ زرعی پرتوں اور شہری مزدوروں کو چھیڑا بھی نہیں گیااور انہیں الگ تھلگ رکھاگیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ مفادات کے ٹکرائو نے تحریک کے اپنے اندر ہی نازنخرہ اوربگاڑپیدا کردیاتھا۔اور دیہی مزدورطبقات سمیت کوئی بھی اتحادی پرت اس تحریک کے ساتھ نہیں جوڑی جاسکی ۔ ان فطری اتحادی طبقات کے درمیان فاصلے اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔اور آپس میں تال میل کی ذرابرابربھی گنجائش نہیں بچی۔جس کی وجہ سے کسان تنہا رہ گئے اور جغرافیائی اعتبار سے یہ کسان تحریک بہت ہی محدود علاقے تک سمٹ کر رہ گئی۔یہ تحریک چارسدہ،مالاکنڈ،سوات کے کچھ علاقوں اورمردان کے علاقے رستم تک ہی رہی۔جغرافیائی محدودیت اور طبقاتی تنگ نظری کی وجہ سے اس میں ایک اور خرابی در آئی وہ یہ کہ رجعتی قوتیں اس میں شامل ہو گئیں اور ان کی وجہ سے قبائل کے آپس میں جھگڑے شروع ہوگئے۔مثال کے طور پر ہشت نگر چارسدہ میں اسے احمد زئی اور مہمند قبائل کے مابین لڑائی کا نام دے دیاگیا۔مالاکنڈ میں یہ یوسف زئی اور روغانی قبائل کی لڑائی قرار پائی۔جبکہ مردان میں یہ یوسف زئی اور مہمند قبائل کا جھگڑابن گیا۔اورپھر یہ تحریک ملک کے دوسرے حصوں سے بھی کٹی رہی۔

اگرچہ پشتونخواہ میں چلنے والی یہ کسان تحریک ابھی تک فاتح نہیں ہو ئی تاہم اس نے بہت ہی مثبت تبدیلیوں کا ایک سلسلہ ضرور جنم دیا۔یہ **1968/69**ء کی تحریک کا ایک انتہائی اہم حصہ تھی اور یہ مستقبل کیلئے علاقے اور خطے میں امید اورجدوجہدکی شاندارعلامت بن کے سامنے آئی۔اپنی تمام تر کمزوریوں خامیوں کے باوجود کسانوں اور جاگیرداروں کے مابین شدید اورخونریز لڑائیاں ہوئیں۔مالاکنڈضلع میں ایک کسان لیڈر صوفی محمدصادق اور ایک جاگیردارمکرم خان اس لڑائی میں مارے گئے۔ہشت نگر میں ایک بہت بڑے زمیندار واوا خان کو شکست فاش ہوئی۔ اس کی زمینوں پرکسانوں نے قبضہ کرلیااور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔اسی طرح سے دیر اور سوات میں سینکڑوں ایکڑوں کے مالکان جنہیں خان کہاجاتاتھا کی زمینوں پر کسانوں نے قبضے کر لیے تھے۔

منوبھائی(راولپنڈی)

معروف کالم نگار اور ڈرامہ نویس منوبھائی **1968/69**ء میں راولپنڈی پریس کلب کے جنرل سیکرٹری تھے۔منوبھائی پچھلے پچپن سالوں سے ملک بھر کے معتبر جریدوں

اوراخبارات میں مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔منوبھائی نے اس تحریک میں حکومت کے خلاف کئی احتجاجی مظاہرے منظم کیے تھے۔منو بھائی نے اس تحریک میں پنڈی کینٹ کے شروع ہونے والے راستے پر طالبات کے دھرنے سے متاثر ہوکر اپنا مشہور ومعروف ڈرامہ" جلوس" لکھا تھا۔یہ طالبات نالہ لئی کا پل عبور کر کے چھائونی کو جانا چاہ رہی تھیں مگر پولیس نے انہیں روکے رکھا۔طالبات چھ گھنٹوں تک دھرنا دیے بیٹھی رہیں بعد ازاں بیگم نصرت بھٹو وہاں پہنچیں اور وہ طالبات کے جلوس کی قیادت کر کے چھائونی داخل ہوگئیں۔جب منوبھائی لیاقت باغ میں پی ایف یو جے کے اجتماع کی تیاری میں مصروف تھے تو اس وقت کے وزیراطلاعات جنرل شیر علی نے رابطہ کرکے دس ہزار روپے کی رشوت کی آفر کی جو شکریے کے ساتھ ٹھکرا دی گئی۔اس گستاخی پر منوبھائی کا ملتان تبادلہ کردیاگیا۔جب مصنف نے منو بھائی سے 1968/69ء کی یادداشتوں کے بارے میں بات کی تو منوبھائی جیسے جذبوں کی کسی سرشاردنیا میں پہنچ گئے۔منوبھائی نے بتایا کہ لاہورکے مال روڈپر آئے روز لاکھوں لوگ جمع ہوجاتے تھے۔مردوں نے سرخ پگڑیاں تو عورتوں نے سرخ دوپٹے پہنے ہوئے ہوتے تھے۔اتنی بڑی تعدادمیں کبھی سرخ دوپٹے اور پگڑیاں اس سے پہلے اور اس کے بعد میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ان دنوں کے اہم واقعات سناتے ہوئے منوبھائی نے لاہوراچھرہ میں ایک اجتماع کا احوال سنوایاجس میں جماعت اسلامی کا امیر مودودی اپنے ایک ہاتھ میں روٹی اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھام کر لوگوں سے پوچھ رہاتھا کہ تمہیں کیا چاہیے روٹی یا قرآن؟لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارے گھروں میں قرآن توہے مگر روٹی نہیں' اس لیے ہم روٹی کو ووٹ دیں گے ۔

بھٹو کو پھانسی ہوجانے کے بعدمنوبھائی نے بیگم نصرت بھٹو سے روزنامہ مساوات کیلئے انٹرویو لیا تھا۔ نصرت بھٹو نے بتایا کہ جب وہ بھٹو سے آخری بار ملنے موت کی کال کوٹھڑی میں گئی توبھٹو نے مجھ سے پوچھا کہ میری پارٹی میرے لیے کیوں کچھ نہیں کر رہی؟جس پر میں نے جواب دیا کہ ذوالفقار تم کون سی اپنے پیچھے کوئی بالشویک پارٹی چھوڑ کر آئے ہو کہ وہ تمہارے لیے کچھ کرے!

ایک اور اہم دلچسپ واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے منو بھائی نے کہا کہ ہم 70کی الیکشن کمپین کے سلسلے میں بھٹوصاحب کے ساتھ جی ٹی روڈ کے ذریعے لاہورسے جہلم کی طرف جارہے تھے، مصطفی کھر (سابق گورنرپنجاب)کار چلا رہاتھا جبکہ حنیف رامے (سابق وزیراعلیٰ پنجاب)میرے ساتھ پیچھے بیٹھا ہواتھا۔جب کار گجرات پہنچی تو فیکٹریوں کے مزدوروں کے ایک جلوس نے بھٹو کے قافلے کو روک لیا،ان مزدوروں نے اپنی قمیضیں اتاری ہوئی تھیں،ان میں سے کچھ تپتی ہوئی سڑک پر لیٹ گئے۔انہوں نے بھٹو سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ تقریر کرے۔بھٹو ہچکچارہاتھاکیونکہ پہلے ہی ہمیں جہلم پہنچنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔مگر مزدوروں کا جوش و جذبہ دیکھتے ہوئے کھر

نے بھٹو سے کہا کہ ان کے ساتھ کچھ بات کر ہی لی جائے۔بھٹو نے ایک انتہائی جوشیلی انقلابی تقریر کرتے ہوئے مزدوروں کو ولولے سے بھردیا ۔بھٹو تقریر کرکے واپس کارمیں آیا اورقافلہ جہلم کی طرف روانہ ہونے لگا تو مزدوروں نے ہماری کار کے بونٹ پر اپنی ہتھیلیاں بجاتے ہوئے سوشلزم سوشلزم کے نعرے لگانے شروع کر دیئے ۔ جب نعرے لگاتے ہوئے یہ مزدور گزر گئے توکچھ لمحوں بعد بھٹو نے فرنٹ سیٹ سے پیچھے مڑکر دیکھتے ہوئے کہا''سوشلزم ہمارے لیے معنی بے شک نہ رکھتا ہو' لیکن ان کے لیے یہ اہم معنی رکھتا ہے!

معراج محمد خان(کراچی)

1960ء کی دہائی کی ابھرنے والی قیادت میں سے ایک اہم نام معراج محمد خان کا ہے جس کا طلبہ سیاست میں بہت معتبر وموثر مقام تھا۔ایوب دورمیں نوجوانوں کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے معراج کا نام علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کے سلسلے میں مصنف کے ساتھ اپنی ملاقات اورگفتگو کے دوران معراج محمدخان نے کہا کہ میں تو اتنے بڑے طوفانی واقعات کا محض ایک چھوٹا سا قطرہ تھامگر ایک ایسا قطرہ جو کانٹوں پر ناچنے کا دلدادہ تھا۔

معراج کی عمر اب بڑی حدتک ڈھل چکی ہے ،پھیپھڑوں کے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے اب زیادہ دیر بات کرنا بھی مشکل ہو چکا ہے اورسرگرمیوں میں شرکت بھی محال ہو چکی ہے۔جب معراج گفتگوکیلئے بیٹھنے والے کمرے میں آئے تو سانس بھی زورزور سے ہی چل رہی تھی اورکھانسی بھی شدید تھی۔معراج کا یہ کمرہ اس کی بڑی بڑی تصاویر سے سجا ہواتھا جس میں وہ پاکستان کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے لاکھوں کے عوامی اجتماعات سے خطاب کررہاتھا۔گفتگو کے خاتمے کے وقت معراج محمدخان نے کہا کہ میں تو سوچ کر آیاتھا کہ بس پندرہ منٹوں کے اندر ہی ہماری بات ختم ہو جائے گی مگر جب میں نے اپنی یادداشت میں سے **1968/69**ء کے تاریخی لمحات ا ورواقعات کوکھنگالنا شروع کیا توانہوں نے مجھ میں اتنی طاقت اورحرارت پیدا کردی کہ میں مسلسل پانچ گھنٹے بول گیا۔

میں ایک چھوٹا سا بچہ اورہائی سکول کا طالبعلم تھا جب کوئٹہ سے کراچی آیاتھا۔فٹبال کھیلنا مجھے بہت اچھا لگتاتھا ،مگر میں ایک بہت اچھا مقرر بھی تھا۔ میں نے اپنے جاندار انداز کی وجہ سے کراچی بھر کے کالجوں کے طلبہ کے مابین ایک تقریری مقابلہ جیتاتھا۔اس مقابلے کے وقت کمیونسٹ پارٹی کے کچھ ارکان بھی وہاں ہال میں موجود تھے جنہوں نے مجھے پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔اس کے بعد میری

کمیونسٹوں کے ساتھ بحثیں شروع ہوگئیں۔ یوں انقلابی سیاست کی طرف میراسفر شروع ہوگیا۔

معراج محمدخان نے NSF کو طلبہ حقوق کی ایک پرجوش نمائندہ تنظیم میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ 1957ء کے یونینوں کے الیکشن میں NSF نے کراچی کے 90% کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کامیابی حاصل کرلی۔ڈائومیڈیکل کالج اور ڈی جے سائنس کالج NSF کے مضبوط گڑھ تھے۔کراچی کے دیگر معروف طلبہ قائدین میں حسین نقی،فتحیاب علی خان،خرم مرزا،نفیس صدیقی،علی مختار رضوی، امیرحیدرکاظمی،سید سعیدحسن ،آغاجعفر،وحیدبشیر،نوازبٹ،جوہرحسن اور علی یاورشامل تھے۔معراج محمد خان 1967ء تک NSF کا صدررہا۔جس کے بعد رشیدحسن خان کو 1970ء میں لاہورمیں ہونے والی کونسل میٹنگ میں NSF کاصدر بنادیاگیاجس کا تعلق ڈائومیڈیکل کالج سے تھا۔ معراج محمدخان نے بعد ازاں قومی سیاسی دھارے میں آنے کا فیصلہ کیااور پارٹی کی ہدایات کی روشنی میں پاکستان پیپلزپارٹی میں شامل ہوگیا جو اس وقت ایک بڑی سیاسی قوت کے طورپر سامنے آچکی تھی اور جب بھٹو ایک بڑے مقبول عام سیاسی رہنما کے طورپر ابھرچکاتھا۔70ء کے الیکشن میں بھٹونے معراج خان کو لالوکھیت کراچی سے امیدواربنادیاجہاں وہ عوام میں احترام کا حامل ایک مقبول لیڈر تھا۔ ایوب حکومت اکثروبیشتر معراج کے پیچھے پڑی رہتی تھی کہ اسے گرفتارکرلیاجائے اور وہ اسی علاقے میں آکر چھپ جاتاتھا۔مصنف کو معراج خان نے بتایا کہ لالوکھیت میں گرفتاری سے بچنے کیلئے بھاگتے وقت وہ کسی بھی کھلے دوازے سے کسی گھر میں داخل ہوتا توگھروالوں کو صرف اتنا بتاتا تھا کہ میں معراج محمدخان ہوں اور پولیس میرے پیچھے ہے۔تو وہ اس کے ساتھ انتہائی عزت احترام سے پیش آتے اور بچاتے ہوئے ادھر اُدھر سے نکلنے کا رستہ بھی بتادیتے ۔جب پولیس اس گھر میں داخل ہوتی تو ان پر برس پڑتی اور ان پر تشدد کرتی مگر کوئی بھی میرے بارے میں پولیس کو کچھ بھی نہیں بتاتاتھا۔

وہ اس حلقے سے بھاری اکثریت کے ساتھ الیکشن جیتنے والا متوقع امیدوارتھامگر اس دوران وہ جیل میں تھا تو کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر اسے ملنے آیا اور حکم دیا کہ بھٹوکوپارٹی کا ٹکٹ واپس کر کے الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کردیاجائے۔معراج خان کے بقول وہ اس فیصلے پر انتہائی حیران ہوا۔میں نے انہیں جواب دیا کہ میں پارٹی کے ڈسپلن کی پابندی کروں گا مگر مجھے اس فیصلے سے اختلاف ہے۔بھٹونے پھر ایک اور غیرمعروف آدمی کووہ ٹکٹ دے دیا جو جماعت اسلامی کے امیدوار سے صرف پانچ ہزار ووٹوں کے معمولی فرق سے ہارگیا۔معراج محمدخان کو بھٹو نے کابینہ میں شامل کیاتھا مگر کسی وزارت کے بغیر۔ بعدازاں NSF اور معراج محمد خان دونوں بھٹو حکومت سے اس وقت باہر ہوگئے جب بھٹونے 1973ء میں اپنے سوشلسٹ ایجنڈے پر مصالحت شروع

کردی اور حکومت مزدور دشمن پالیسیوں پراتر آئی۔کچھ سالوں کے بعد بھٹوسے اختلاف ہوجانے کے بعدمعراج محمدخان نے پیپلزپارٹی چھوڑ دی اور قومی محاذآزادی کے نام سے اپنی جماعت بنالی اور ساتھ ہیNSF کا اپنا ایک دھڑابھی قائم کرلیا۔اور یوں طلبہ سیاست کا نامور ودرخشندہ ستارہ سیاسی تنہائی کا شکارہوتا چلاگیا اور دوبارہ کبھی پہلی سی شہرت اور ساکھ حاصل نہیں کر سکا۔7نومبر1967ء کو NSF کے طلبہ کی پولیس کے ہاتھوں شہادت کے ذکر پر معراج بہت ہی جذباتی ہو گئے ۔اس واقعہ نے 1968/69ء انقلاب کی بنیادرکھی تھی۔اس نے بتایا کہ ہم تو اس تیاری میں لگے تھے کہ پنجاب میں مزاحمتی تحریک کو تیز کیاجائے۔ہمیں بھی توقع نہیں تھی کہ پولیس فائرنگ سے نوجوان طالب علم کی ہلاکت اتنے بڑے ایک انقلاب کو جنم دینے کا باعث بن جائے گی۔

پرویز ملک (اٹک)

کامریڈپرویز ملک 1968/69ء کے انقلاب کے دنوں میں کیمبل پور ،جو آج کل اٹک کہلاتاہے ،میں NSF کے نہایت سرگرم کارکن تھے۔ مصنف کو اس حوالے سے انٹرویودیتے ہوئے کامریڈ ملک نے بتایا کہ جب 1968ء میں ایوب نے ”دس سالہ جشن ترقی“ منانے کا اعلان کیا توNSFنے اس کے مقابلے میں”دس سالہ عہد تنزلی“منانے کا فیصلہ کرتے ہوئے مطالبات کا ہفتہ منانے کا اعلان کردیا۔7نومبر کے واقعے نے تو واقعات کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کو جنم دے دیا۔ہرطرف غصے اور بغاوت کا اظہار شروع ہوتا چلاگیا۔کوئی ایک شہر قصبہ یا دیہات ایسا نہیں تھا جہاں لوگ سڑکوں پرنہ نکل آئے ہوں۔ایوب کے خاتمے اور سماج کو بدلنے کے نعرے ہر طرف لگنے شروع ہوتے گئے۔عوام صرف احتجاج ہی نہیں بلکہ اس نظام کو ہی اکھاڑ پھینکنے کیلئے سرکش ہو چکے تھے اور وہ مروجہ پیداواری رشتوں کو ماننے سے انکاری ہوتے جارہے تھے۔گھروں اوردکانوں ،بسوں اور ٹرینوں کے کرائے دینے بند کر دیئے گئے تھے۔

راولپنڈی میں ڈویژنل سطح پرایک سٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔ جب کمیٹی کے صدر شیخ عبدالرشید کوگورڈن کالج سے گرفتار کیاگیاتو سارے ڈویژن میں شٹرڈائون اور پہیہ جام کر دیاگیا۔بی بی سی نے خبر نشر کی تھی کہ سارا علاقہ اس ہڑتال کی وجہ سے جام ہوکر رہ گیاتھا۔اسی دوران کیمبل پورمیں NSF تشکیل پاچکی تھی اور اس ضمن میں ایک آرگنائزنگ کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ایک ضلعی کنونشن منعقد کراکے ایک ضلعی یونٹ بھی تشکیل دیاگیاتھا۔ایوب خان کی رخصتی سے پہلے ہی ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار ہونے والے سبھی سیاسی قیدیوں کو رہاکردیاگیا۔ NSFکی

مرکزی قیادت میں سے گرفتار ہونے والے چار لیڈروں کو کیمبل پور جیل سے رہا کیا گیا تھا جب وہ رہا ہوئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور ایک بہت بڑی ریلی کے ساتھ شہر میں لایا گیا ۔ہزاروں لوگ ان کو دیکھنے سننے کیلئے جمع ہوئے جن سے انہوں نے خطاب کیا۔پرویزملک کو ان میں سے تین کے نام یاد تھے،شہریارمرزا،منیر عزیر سعود اور کنورقطب الدین ۔چوتھے طالبعلم لیڈرکا تعلق بلوچ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن سے تھا۔ تین تو چلے گئے جبکہ شہریارمرزا وہیں رک گیااورایوب حکومت کی رخصتی تک کیمبل پورہی میں قیام کیا۔اپنے قیام کے دوران شہریارمرزا نے علاقے کے تعلیمی اداروں کے دورے کیے،میٹنگیں کیں اور انقلابی جلسوں سے خطاب کیا۔ شہریار کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے NSF کو بھی منظم ومضبوط اورمزید فعال بنایا گیا۔ راولپنڈی میں یہ واحدتنظیم تھی کہ جس کا اپنا آفس تھا اور جس میں پیپلزپارٹی بھی حصہ دارتھی۔اس دوران ہم

نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے ارکان سے بھی محمودالحسن منٹوکے گھر پر جا کر ملاقات کی،جس میں نوابزادہ نصراللہ ،مولوی فرید احمد،چوہدری محمدعلی اور کچھ دیگر قائدین شریک تھے۔جب مولوی فرید نے مرزا کا تعارف ایک مقبول عوامی لیڈر کے طورپرکرانے کی کوشش کی تو اس نے ٹوک دیا اورکہا کہ میں جو بھی ہوں اپنی تنظیم، اپنے نظریات کی وجہ سے ہوں اور تنظیموں میں افرادکی اتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے نہ حیثیت۔مرزا نے اپنے مطالبات ان کے سامنے رکھے مگر ان کے رویے سے مایوس ہوکر واک آوٹ کر گیا۔ واپسی پر مرزا نے ہمیں کہا کہ یہ سب رجعتی ردانقلابی لوگ ہیں جو ریاست اورنظام کو بچانے کی تگ ودومیں لگے ہوئے ہیں۔ہمیں ان جیسوں کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔کیونکہ ان کے مفادات مزدوروں کے مفادات کے دشمن ہیں۔ شہریار مرزا نے کہا کہ اگر آج پاکستان میں ایک انقلابی پارٹی ہو تی تو ملک میں جاری انقلابی کیفیت بلاشبہ ایک سوشلسٹ انقلاب کیلئے تیار ہو چکی ہے۔پھر ایوب کی رخصتی ہوگئی اور یحییٰ کا مارشل لا آگیا،تحریک میں جزوقتی وقفہ آگیامگر یہ پھر دوبارہ چل پڑی۔اسی دوران گورنمنٹ کالج نوشہرہ پشتونخواہ میں پولیس فائرنگ سے ایک طالبعلم ظاہرنقوی جو NSF کا سرگرم کارکن بھی تھا ہلاک کردیا گیا جس کا تعلق ہمارے شہر سے تھا۔شایدیہ اکتوبر69ء کا واقعہ ہے، اس قتل پراحتجاج کیلئے سارے شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔پولیس نے بدترین لاٹھی چارج کیا اورآنسوگیس کے گولوں کی برسات کردی مگرمشتعل لوگوں نے پولیس کو بھاگ جانے پرمجبور کردیا۔ظاہر کے چہلم کی تقریب ایک بڑے جلسے کی شکل اختیار کر گئی جس میں اس کے کالج سے سینکڑوں طلبہ شریک ہوئے۔پولیس نے اجتماع پر ہلہ بول دیا اور کئی طلبہ گرفتار کر لیے۔جس پر چہلم کے سبھی شرکا جوہزاروں کی تعدادمیں تھے تھانے پہنچ گئے اور مجبوراًانتظامیہ کو

سبھی گرفتارشدگان کو رہا کرنا پڑگیا۔

منظوررضی(کراچی)

ریلوے ورکرز یونین کے رہنما منظور رضی کے مطابق پاکستان میں ٹریڈیونین کی بنیاد مرزاابراہیم (1999-1905ء)نے رکھی تھی۔ 11اگست 1999ء کو 94سال کی عمر میں انتقال کرجانے والے مرزاابراہیم کی زندگی کا ایک چوتھائی حصہ سلاخوں کے پیچھے گزراتھاجبکہ بدنام زمانہ لاہور کے شاہی قلعے میں قیدوبندکی بربریت اس کے علاوہ ہے۔مرزاابراہیم نے 1924ء میں راولپنڈی میں ایک خشت مزدورکی حیثیت سے محنت مزدوری شروع کی تھی جبکہ کچھ عرصہ ایک برطانوی افسر کے گھر میں مالی کے طورپر بھی کام کیاتھا۔اس کے بعد مرزا کو جہلم میں ریلوے میں ملازمت مل گئی۔اور پھر یہی ریل کی ملازمت مرزاکی شناخت بنتی چلی گئی۔تاہم مرزا کی سیاسی زندگی کا صحیح معنوں میں آغاز تب ہوا جب اس کا1930ء میں لاہور تبادلہ ہوا۔لاہور نوآبادیاتی دور سے ہی سیاست وثقافت کا ایک مضبوط گڑھ اور محورومرکز بن چکا تھا۔ یہاں مرزاکا ٹریڈ یونین تحریک اور بائیں

بازوکے ساتھ رابطہ اور تعلق قائم ہوا۔ان دنوں ریلوے میں دویونینیں ہواکرتی تھیں ۔ایک نارتھ ویسٹرن ریلویزNWR،جس کا صدر ایک برطانوی جے بی ملز تھاجوکہ ایک ریلوے گارڈتھا۔جبکہ ایم اے خان اس کا جنرل سیکرٹری تھا۔دوسری یونین یونائٹڈیونین ایک پاکٹ یونین ہوتی تھی جس کی سربراہی محمد دین مرزاکے پاس تھی۔مرزا نے NWR میں شمولیت کرلی ، اسے ورکشاپس کا صدر منتخب کرلیاگیا۔بعد میں مرزاابراہیم نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شمولیت اختیار کرلی اور ٹریڈیونین تحریک کا انتہائی سرگرم رکن بن گیا جس کے نتیجے میںوہ ریلویزفیڈریشن کا مرکزی نائب صدرمنتخب ہوگیا۔جبکہ صدر وی وی گری تھا جو بعد میں بھارت کا صدر بھی بنا۔بھارتی مغربی بنگال کا لمبے عرصے تک وزیراعلیٰ رہنے والاجیوتی باسو بھی ان دنوںمیں مرزاابراہیم کی قیادت میں ٹریڈیونین تحریک میںسرگرم کردار ادا کرتارہا۔

1946ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلابی سال تھا۔دوسری عالمی جنگ کے بعد حکومت ریلوے کے ہزاروں مزدوروں کو ملازمت سے برطرف کرناچاہتی تھی۔یہ جوازپیش کیاگیا کہ جنگ کے بعد ان کے کام کرنے کی مزید ضرورت نہیں رہی۔ یکم مئی 1946ء کوریلوے کے مزدوروں نے مرزاابراہیم کی قیادت میں عام ہڑتال کر دی،جو ان دنوںNWRکا مرکزی صدر تھا۔اس دن صبح سات سے گیارہ بجے تک جاری رہنے والی مزدورں کی ایک بہت بڑی میٹنگ کے بعد ریل کا پہیہ روک دیاگیا۔اس کے بعد 27جون کو رات بارہ بجے

ایک اورہڑتال کا اعلان کردیاگیا۔فیڈریشن سے وابستہ کئی یونینوں نے خود کو اس سے الگ کرلیا مگر مرزاابراہیم نے فوری طورپر ایک ہڑتالی کمیٹی قائم کر دی، 96000مزدوروں نے اس ہڑتال کے حق میں ووٹ دے دیا۔مرزاابراہیم کواس ہڑتال سے خودکو الگ رکھنے کیلئے ایک لاکھ روپے اور ورکشاپ میں بطور اسسٹنٹ ورکس مینیجر تعیناتی کی پیشکش کی گئی مگر مرزا نے اسے ٹھکرادیا۔

حکومت کو لامحالہ مزدوروں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑ گئے۔ہڑتال سے صرف ان کی ملازمتیں ہی نہیں بچیں بلکہ ان کی اجرتوں میں 20روپے فی مزدور اضافہ بھی تسلیم کرلیاگیا۔مگر مرزاکو اس سرگرمی کے جرم میں بٹوارے سے پانچ مہینے پہلے ملازمت سے نکال دیاگیا۔وہ اس وقت واٹر مین کے طورپر ملازمت کر رہاتھا۔تقسیم کے بعد وہ پاکستان ٹریڈیونین فیڈریشن PTUF کی تعمیر وتشکیل میں سرگرم ہوگیا۔جو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے منسلک تھی۔فیض احمد فیض اور سی آر اسلم جیسے معروف کمیونسٹوں کو ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں صنعتی مزدوروں کو منظم کرنے میں مددومعاونت کریں گے۔فیڈریشن نے مرزاابراہیم کو اپنا صدر منتخب کرلیا۔فیض احمد فیض کی موجودگی علامتی تھی مگر وہ اس کے نائب صدر بن گئے۔ 1951ء میں پنڈی سازش کیس میں انہیں دھرلیاگیا اور لاہورکے شاہی قلعے میں تشددوبربریت کا نشانہ بنایاگیا۔منظوررضی خودبھی 60ء کی دہائی کی شاندار جدوجہد کا اہم متحرك کردار رہا،اس نے مصنف کو 1967ء کی کراچی میں ریلوے کی ہڑتال کے بارے میں تفصیلات بتائیں ۔

کراچی ریلوے کی ہر جگہ انقلابی سرگرمیوں کا گڑھ بن چکی تھی۔ہرریلوے سٹیشن ،ورکشاپ، انجنوں، مرکزی دروازوں پرسرخ جھنڈے اور انقلابی بینرز لگے ہوئے ہوتے تھے۔ ہڑتالی مزدوروں کے سٹڈی سرکلوں میں مارکس اور لینن کو پڑھا اورسنا جاتاتھا۔ریاست اسے روکنے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔مکمل پہیہ جام ہوچکاتھااورایک انقلابی جوش وجذبہ ہر طرف جھلکتا اور چھلکتا نظرآتاتھا۔منظوررضی مرزاابراہیم کا ایک مخلص اور وفادار ساتھی رہامگر چالیس سالوں کی رفاقت کے بعد منظور نے اعتراف کیا کہ دومرحلوں کا نظریہ ہی مرزا ابراہیم جیسے عظیم لیڈرکی1970ء کے الیکشن میں شکست کی بنیادی اور سب سے بڑی وجہ تھی۔مرزا نے اس الیکشن میں حصہ لیا مگر اس بار اس کی عظمت کوووٹروں اورمزدوروں نے تسلیم کرنے سے گریز کیا اور بھٹو کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ریلوے مزدوروں نے مرزاکیلئے پیپلزپارٹی کی ٹکٹ کیلئے لابنگ بھی کر لی ہوئی تھی اور یہ ٹکٹ ملنے والا بھی تھا مگر مرزا دومرحلوں کے نظریے کے زیراثررہا۔اوروہ نہیں چاہتاتھا کہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ سے الیکشن لڑے۔مگر دوسری طرف پیپلزپارٹی زبانی طورپر ہی سہی سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ لگا چکی تھی۔

پروفیسر محمد یحییٰ(ڈیرہ اسماعیل خان)

اس انقلاب نے پاکستان کے پسماندہ اور دورافتادہ علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیاتھا۔ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والے پروفیسر محمد یحییٰ اس انقلاب میں شامل ہزاروں کارکنوں میں سے ہی ایک ہیں۔راقم کے ساتھ اپنی گفتگو میں پروفیسریحییٰ نے ان دنوں کے زندہ واقعات کے منظر وپس منظرکے بارے میں بتایا۔ ہمارے علاقے میں NSF اور "دہقان قلم"نامی ایک تنظیم طبقاتی شعورکو اجاگرکرنے میں اہم اور سرگرم کرداراداکررہی تھی۔بھٹوکی یہاں آمد سے پہلے ہی کامریڈ شائستہ بلوچ،حمیدخاکوانی اورکامریڈحق نوازگنڈاپورپیپلزپارٹی کے تاسیسی کنونشن میں شرکت کرکے آچکے تھے۔ بھٹو سے پہلے ہمارے یہاں کی بائیں بازو کی روایت مدن موہن مالویا سے وابستہ ہے جو کامریڈ بھگت سنگھ کا ساتھی تھا۔گاندھی کی عدم تشددتحریک "اہنسا" جو قومی آزادی کی تحریک میں سے انقلابی رحجان کے خاتمے کیلئے شروع کی گئی تھی،کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جب اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے کئی افرادکوہلاک کرنے کے بعدخودکو بھی ہلاک کرڈالاتھا۔ ہمارے ہاں ایک اور کامریڈ سرفراز بھی تھا جوبظاہر کانگریس میں ہوتا تھا مگر وہ بالشویک انقلاب کا بہت زیادہ مداح تھا۔

جب بھٹو نے ڈیرہ اسماعیل خان آنا تھا تو اس سے پہلے کئی قسم کی رکاوٹیں کھڑی اور پیداکرنے کی کوششیں کی گئیں۔تاکہ یہ دورہ سبوتاژ کیاجاسکے۔کنونشن مسلم لیگ غنڈوں اور بدمعاشوں کی بارہ بسیں بھرکر لائی تاکہ جلسہ گاہ میں لوگوں کو تتر بتر کیاجاسکے۔ایک بہت بڑا بینر لکھواکر آویزاں کرایا گیا جس پر درج تھا"بزدل بھٹو واپس جائو"۔تاہم اس سب کے باوجود پیپلزپارٹی کے ایک درجن سے زائد بانی ارکان دن رات اس جلسے کی تیاری میں

لگے ہوئے تھے۔کیلے کے درختوں سے مزین کئی استقبالی گیٹ سجا دیئے گئے تھے۔جن پر پارٹی پرچم اور پارٹی کے نعروں کے بینرزبھی لگائے گئے تھے۔ یہ نعرے شہر بھرکی دیواروں پر بھی لکھ دیئے گئے تھے۔جب مسلم لیگی غنڈوں نے ان جھنڈوں اور بینروں کو پھاڑنا شروع کیا تو مین بازار میں پارٹی کارکنوں کے ساتھ ان کا تصادم ہوگیا۔یہ دوطبقوں کے نمائندوں کی لڑائی تھی ایک طرف جاگیرداروں کے پالتو غنڈے تھے تو دوسری طرف مزدوروں اورکسانوں کے نمائندے تھے۔ بالآخر حق نواز گنڈاپور کی ہدایت پر لوگ ان بارہ بسوں کے سامنے لیٹ گئے۔تاکہ وہ جلسہ گاہ کو خراب نہ کرپائیں۔کارکن لاٹھیوں سے ان غنڈوں کا مقابلہ کرتے رہے ،پھرساراباراربندکردیاگیا ۔

بھٹو نے 31دسمبر1968ء کو یہاں جلال پارک میں جو اب حق نواز پارک کہلاتاہے

عوامی جلسے سے خطاب کرنا تھا۔محمدنواز ایڈووکیٹ نے بار سے خطاب کی دعوت دی ہوئی تھی جبکہ یکم نومبرکو ورکرزکنونشن سے خطاب تھا۔جب یہ غنڈہ عناصر پہنچے توکارکنوں' مزدوروں اورکسانوں نے ان کو پکڑلیا اور مارمار کر جاگیرداروں کے ان پالتو غنڈوں کا بھرکس نکال دیا۔مگر ایک طریقہ جو اس جلسے کو خراب کرنے میں کامیاب رہا وہ یہ تھا کہ پارک کے اندر پانی چھوڑ دیاگیا۔جلسہ گاہ میں توکوئی نہ جاسکامگرلوگ اپنے قائدکوسننے کیلئے بہت بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ڈپٹی کمشنر سجادحسین کوحکم دیاگیاتھا کہ ہر طرح ہرطریقے سے اس سیاسی پروگرام کو سبوتاژکردیاجائے۔مگر دوسری طرف بھی لوگ تھے جو ایک ایسے قائد کو سننے کیلئے آئے تھے جو اپنی تقریروں میں سماج کو بدلنے کی باتیں کرنے آرہاتھا۔ ہزاروں لوگ سرکلرروڈپر امڈ آئے ہوئے تھے اور اس جھگڑے کا انجام کرناچاہ رہے تھے۔ جب بھٹو نے دیکھا کہ پارک میں جلسہ ممکن نہیں رہا تو وہ لوگوں کو لے کر مین بازارکی طرف بڑھا۔بھٹو شاہانی منزل جو کہ بھکر کے شہانیوں کی ملکیت تھی ،کے نیچے واقع ایک دکان کے پاس پہنچا اور اوپرچڑھنے لگا چوکیداروں نے بھٹوکو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔

بھٹوشائستہ بلوچ اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ اوپربالکونی میں پہنچ گیا۔اس یادگار جلسے کی تصاویر آج بھی موجودہیں۔حق نواز گنڈاپو نے ایک گوریلے جنگجو کی طرح سے بندوق سنبھالی ہوئی تھی۔بھٹو نے ابھی ایک منٹ کی تقریر کی تھی کہ پولیس نے ہلہ بول دیا۔مگر اس کے باوجود بھی بھٹو کے یہ 70 سیکنڈ ڈیرہ اسماعیل خان کا مزاج بدل گئے۔اس نے ان لمحوں میں پوچھا ”کیا تمہیں آٹا ملتا ہے؟کیا تمہیں گھی ملتا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا”نہیں“بھٹو نے کہا کہ آج چینی مہنگی ہو چکی ہے ،غریب انسان کیلئے زندگی گزارنا محال ہوچکا ہے۔پیپلزپارٹی تمہیں یہ سب کچھ دے گی ،روٹی کپڑا اور مکان۔اور یہ سوشلزم کے ذریعے مہیا کرے گی“۔(3) اس کے پولیس نے لوگوں پر حملہ کردیا اور عینی شاہدین کے مطابق ایک بھیانک سفاك اور بدترین لاٹھی چارج کیاگیا ۔شہر میں پہلی بار آنسوگیس فائرکی جارہی تھی اور سار اشہر لڑائی کا میدان بن چکا تھا۔ مگر جلسے میں آئے لوگ اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے جس پر

پولیس نے فائر کھول دیئے۔جس سے بے شمار لوگ زخمی ہوگئے تھے“۔ یحییٰ کے بقول وہ خود بھی میلوں دور سے بھٹو کی تقریر سننے آیاتھا۔بھٹو اس کے بعد قرب وجوار کے کئی چھوٹے بڑے شہروں کلاچی ، ٹانک، گالوٹی، وغیرہ بھی پہنچا تاکہ عوام سے اپنے لیے حمایت حاصل کر سکے۔ایوب خان نے ایک بارکہاتھا کہ ایک چھوٹے سے قصبے سے شروع ہونے والی چنگاری آگ بن کر سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیاکرتی ہے۔ایوب کا اشارہ ڈیرہ اسماعیل خان کے اسی واقعے کی طرف تھاجس میں کنونشن مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی کا تصادم ہواتھا جبکہ اس سے قبل راولپنڈی میں ایک طالب علم پولیس

فائرنگ سے ہلاک ہوچکاتھا۔ان واقعات کے بعد ساراملک ایشیا سرخ ہے کے نعروں سے گونج اٹھاتھا۔

حق نوازگنڈاپور ایک سچا اور کھراپرجوش انقلابی تھاجس کی وجہ سے تحریک ہر دم رواں دواں رہی۔ وہ پیپلزپارٹی کا بانی رکن تھا ،اس نے ہالہ کنونشن میں بھی شرکت کی تھی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے سچا سوشلسٹ تھا ۔اور اس نے چھوٹی عمر سے ہی جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے خلاف لڑائی شروع کر دی تھی۔جب جاگیردار پیپلزپارٹی میں شامل ہونے لگے تو وہ بھٹو سے ناراض ہوگیااور اپنی ہی کسان پارٹی بناکر کوہ سلیمان کے پہاڑوں کی **12000**فٹ بلندی پر چڑھ گیا۔دودرجن ساتھیوں سمیت اس نے وہاں سٹڈی سرکل شروع کر دیے۔جہاں وہ بڑے شامیانوں میں رہتے اور اپناکھانا پکاناخودہی کرتے تھے۔آج بھی وہ جگہ ویسے ہی بارونق ہے روزانہ وہاں کھاناپکتاہے اورلوگوں میں مفت تقسیم کیاجاتاہے ۔کامریڈکے ساتھی اس کی یاد کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔تاہم گنڈاپور **1969**ء میں پارٹی میں واپس آگیاتھا۔

گنڈاپورہر جمعہ کے دن بینروں پر لکھے سوشلسٹ نعروں کے ساتھ جلوس نکالاکرتاتھا۔وہ کسی نہ کسی بڑے چوك پر پہنچ جاتا اور جلسہ شروع کردیتا تھا۔ان جلسوں جلوسوں کے زیادہ تر شرکا کسان اور مزدورہواکرتے تھے۔ان جلسوں کے مرکزی مقررین میں فاروق شائستہ ، صفدر بخاری، زرداد اور خودگنڈاپور شامل ہوتے تھے۔بھٹو کے دورے کے بعد پیپلزپارٹی کوعلاقے میں پذیرائی ملنے کی رفتار میں مزیداضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ محنتی اور سرکش قسم کے کارکن گھرگھر جاتے اور پارٹی کا پیغام پہنچاتے۔

بھٹو کے دورے کے بعد پیپلز پارٹی نے لوگوں میںوسیع عوامی بنیادیں حاصل کرنی شروع کر دیں۔ سخت کوش ،سخت جان کارکنوں نے گھر گھر جاکر لوگوں سے بحثیں کیں اور انہیں پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی اور ڈیرہ اسماعیل خان سوشلزم کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ جن سے خوف زدہ ہو کر کئی جاگیردار اپنے تحفظ کے لیے پیپلز پارٹی میں شامل ہوتے گئے، حق نواز گنڈا پور پارٹی کا صوبائی اور مرکزی رہنما تھا ۔ وہ جب ایک دیہات سے دوسرے دیہات کی طرف سفر کرتا اور لوگوں کوانقلابی نظریات سے آگاہ کرکے ان کے دل جیتنے کے سفرپر نکلتاتو اس کے پاس سارے دن کیلئے روٹی کاایک ٹکڑا اور پیاز ہوتا تھا۔ وہ گائوں گائوں پھر کر

جاگیرداری ، سرمایہ داری کے جبرو استبداد اورلوٹ مار کے خلاف اور سوشلزم کے نظریات پر لوگوں کو لیکچردیتا اور انہیں بڑی تعداد میں پارٹی میں شامل کرتا ۔ اس کے لیکچر سننے کے لیے عام لوگوں کی بڑی تعداد اکٹھی ہوجایا کرتی تھی۔ اسے بنیاد پرستوں کے ایک مرکز کو آگ لگانے کے الزام میں گرفتار کیاگیا جسے انتہا پسند پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور نوجوانوں پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن چودہ دن کی طویل

بھوک ہڑتا ل کے بعد حکومت اسے ،اس کے ساتھیوں سمیت رہا کرنے پر مجبور ہوگئی ۔وہ ایک مقبول عام لیڈر کے طور پر ابھرا۔ اور وہاں کے تمام قبائل کے جاگیردار اس سے خوف زدہ ہوگئے ۔ انہیں یہ وہم ہوگیا کہ حق نواز انہیں تباہ کردے گا۔25اگست 1970ء کی رات وہ ایک نواحی گائوں بڈھ میں ایک سوشلسٹ سٹڈی سرکل کر کے واپس آرہا تھا کہ راستے میں چند نامعلوم افراد نے اسے قتل کردیا۔ حکومت نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ آسمانی بجلی گرنے سے ہلاک ہواہے۔ ا س کا قتل علاقے کے غریب لوگوں کے لیے بہت بڑا دھچکا اور نقصان تھا ۔ڈیرہ اسماعیل خان شہرتین دن تک اس کے سوگ میں بندرہا۔ یہاں تک کہ ہوٹل اور میڈیکل سٹور بھی بندرہے۔ اس کی تدفین کے موقع پر لاکھوں لوگ انقلاب کے شہید کی آخری رسومات میں شریک ہوئے۔ بھٹو اس کی تدفین کے دوسرے دن آیا اوراس کی قبر پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی۔

کچھ لوگوں نے افواہیں اڑائیں کہ وہ آسمانی بجلی سے ہلاک ہوا ہے مگر حقیقی صورت حال وہی ہے جو اس کے بیٹے طفیل گنڈا پورنے پروفیسر یحییٰ کو بتائی کہ اسے مقامی جاگیرداروں کے غنڈوں نے قتل کیا تھا۔ حق نواز گنڈہ پورکی دوسری برسی کے موقع پر بھٹو نے ڈیرہ اسماعیل خان جیسے پسماندہ علاقے میں گومل یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ وہ پارک جہاں بھٹو اپنے پہلے جلسے میں تقریر نہیں کرسکا تھا۔ ا س کا نام تبدیل کر کے حق نواز گنڈہ پور پارک رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد سے یہ جگہ انقلابی عوامی جلسوں کا مرکز بنی چلی آرہی ہے۔

سوہنا خان بلوچ ان دنوں ڈیرہ اسماعیل خان کے مین بازار میں چائے کا ہوٹل چلاتا تھا۔ جب بھی کوئی مولوی چائے پینے وہاں آتا تو اس پر فقرے کستا اور سوشلزم کی تعریف کیاکرتا ۔ اس نے اپنے چائے خانے کا ماحول ہمیشہ سیاسی بنائے رکھا اور وہ غریب ،مزدوروں کے ذاتی مسائل کو نظام کے استحصال کے ساتھ جوڑتا ۔ مثال کے طور پر اگراس کی جگہ کے کرائے میں اضافہ ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ یہ اس لیے ہوا ہے کیونکہ اس دکان کا مالک ایک مولوی ہے ۔ وہ مزید کہتا تھا کہ اسی وجہ سے اس چھوٹے ہوٹل کو بھی بھٹو قومی تحویل میں لے لے گا۔ کالو خان منیاری کا بھی یہی حال تھا جو ایک ترقی پسند انسان تھااور جس کی اپنی ایک دکان تھی ۔ وہ ہرآنے جانے والوں کو سوشلسٹ نظریات کے بارے میں بتاتا رہتا۔ اخبارات میں بھٹو کے بارے میں جو بھی خبر چھپتی وہ اسے اپنا موضوع گفتگو بناتا۔ اس کا بیٹا بلند اقبا ل بعد میںNSF میں شامل ہوگیا۔ اور سرگر م کارکن بنا۔

ان دنوں معراج محمد خان مقبولیت کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ بھاٹیہ بازار میں ڈاکخانے کے نزدیک NSF کا

ایک دفتر بنایا گیا۔ یہ دفتر کنور اقبال نامی ایک شخص نے تعمیر کیا تھا۔ جسے ”ایشیاء سرخ ہے “کے نعرے سے والہانہ عشق ہوگیا تھا۔ ”روزنامہ مساوات “اور سوشلسٹ

میگزین ”نصرت“ اس آفس میں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ شین عادل اور یونس تھہیم، داؤد خان ، بلند اقبال، تسلیم فیروز، صلاح الدین گنڈا پور جیسے کامریڈ ز اور کئی دوسرے ٹریڈ یونین رہنما اس آفس میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ہر یوم مئی کے موقع پر یہ سب لوگ سرخ جھنڈوں کے ساتھ سارے شہر کا چکر لگاتے ہوئے ایک جلسہ کرتے اور شکاگو کے شہیدوں کو یاد کیا کرتے ۔ ان جلسوں میں مزدوروں کے لیے بہتر اجرتوں اوربہتر حالات زندگی کے مطالبات پیش کیے جاتے ۔ ان میں سے بہت سے رہنما اپنی احتجاجی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہوئے اورانہیں سات سال تک کی سزائیں بھی سنائی گئیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے میں ایسے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا نظریہ پاکستان کے پسماندہ ترین علاقوں میں بھی عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہواتھا۔

شاہد محمود ندیم (لاہور)

شاہد ندیم ایک ڈرامہ نویس، تھیٹر اور ٹیلی ویژن کے ہدایت کارو پروڈیوسر ، ایک بائیں بازو کے دانشور اور اپنی طرز کے سرگرم سیاسی کارکن ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند تھیٹر کوزندہ رکھنے میں اس کا کردار مثالی رہا ہے۔ 1980ء کی دہائی کے آخر میں اس کے ریاستی مشینری کے خلاف بنائے گئے ڈراموں نے عوام میں بے انتہامقبولیت حاصل کی۔ اسے حال ہی میں ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر پاکستان ٹیلی ویژن (ریاستی ٹیلیو یژن نیٹ ورک)کے عہدے سے برخاست کیا ہے ۔ اس کی برخاستگی زرداری حکومت کے لگائے گئے ایک دائیں بازو کے نمائندے کی طرف سے عمل میں لائی گئی۔ اس کتاب کے حوالے سے اپنے تجربات کو بیان کرتے ہوئے شاہد محمود نے مصنف کو بتایا کہ ”میں نے گورنمنٹ کالج سے 1967ء میں گریجوایشن کی اور اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج کی عمارت ایک پرانے طرز تعمیر کا شاہکار تھی اور اپنے پرانے تعلیمی ریکارڈ ، کھیلوں ، مباحثوں کی وجہ سے مشہورتھی ۔اس کالج کے طلباء کے بارے میں تاثر تھا کہ یہ سیاست اور کسی قسم کے احتجاج اورتحریکوں میں شامل نہیں ہوتے۔ میں ان طالب علموں میں تھا کہ جب ایوب خان اپنی کامیابی کا جشن منانے کے سلسلے میں گورنمنٹ کالج کے دورہ پر آیا تو میں نے خود اس کاخوشی سے استقبال کیا تھا۔ مگر پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی دنیا ہی کچھ اور تھی ۔ یہ ایک قسم کے سماجی ، اور ثقافتی جزیرے کی طرح ہے۔ یہ کھلی ، لبرل ، اور کسی حد تک طلباء کی نگرانی کرنے والی ایجنسیوں سے بچی ہوئی جگہ بھی تھی ۔مزید برآں طالبات کی زیادہ تعداد گریز اورکشش دونوں رویوں کو جنم دے رہی ہوتی ہے۔ کیفے ٹیریا کے اردگر د واقع لان، اورنہر کے ساتھ

ساتھ بنے ہوئے راستے رومان پسندوں کے لیے ایک بہترین ماحول فراہم کرتے تھے۔
یونیورسٹی کے طالب علم مختلف سماجی

طبقوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں شہروں کے بالا دست طبقات سے تعلق رکھنے والے بھی ، دور دراز پسماندہ علاقوں سے آئے ہوئے دیہاتی طالب علم بھی اور نودولتیوں کے بگڑے ہوئے بچے بھی ، اور ا ن کے ساتھ اونچے درجے کے صنعتی اور جاگیردار خاندانوں کے طلبا اور برقع پوش مگر محنت کرنے والی طالبات بھی ان میں شامل ہوتی تھیں۔ وہاں مارکسی سٹڈی سرکلوں اور تبلیغی جماعت کے اجتماعات دونوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ شراب آسانی سے مل جاتی تھی،شاعری عام ہوتی تھی اورگرم نظریاتی بحثیں بھی ذوق وشوق سے سنی جاتی تھیں۔ طالب علموں میں جو ش اور جذبہ ہوتا تھا۔ ان میں اعتماداور اظہار کی فراوانی ہوتی تھی اور وہ ایک بہتر مستقبل کی امید سے لبریز ہوا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ جگہ مختلف سوچوں اور مختلف ثقافتوں کے حامل لوگوں کا مرکز تھا۔

میں نے اس ماحول کو اپنے لیے بہت ہی دلچسپ اورپرکشش پایا، اس میں وسعت اورچاشنی تھی جس کی وجہ سے میں سیاسی اور سماجی طور پر باشعور ہوتا چلاگیا۔ اور تبدیلی کے عمل میں حصہ لینے کے لیے میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے مباحثے کا ایک گروپ ”نئے لوگ“کے نام سے تشکیل دیا۔ جہاں ہم کہانیاں، نظمیں ، مضامین پڑھا کرتے اور سنجیدہ سیاسی بحثیں کیاکرتے تھے۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ اسی فورم پر پڑھا۔ یہ” نئے لوگ“ کی ایک میٹنگ تھی جس میں ہمارا تعارف کچھ بائیں بازو کے اساتذہ اور سوشلسٹ دانشوروں کے ساتھ ہوا جو اکثر و بیشتر کیمپس میں آتے رہتے تھے۔ انہوں نے میرے جیسے غیر متعلقہ کئی طالب علموں کو اپنی طرف راغب کیاجوسماج کو بدلنے کی جستجو رکھتے تھے۔ لیکن ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ان لوگوں میں عزیز الحق، عزیز الدین ، خالد محمود، اور انیس عالم جیسے معتبر لوگ شامل تھے۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب ہم نے محسوس کیا کہ پنجاب یونیورسٹی میں کوئی سٹوڈنٹس یونین نہیں ہے۔ یونین پر جنرل ایوب خان کی حکومت نے کچھ سال پہلے پابندی عائد کردی تھی۔ اور اس کی بجائے بلواسطہ چنی ہوئی سوسائٹیاں مسلط کی گئیں۔ یہ بنیادی جمہوریت کے جیسا ہی ایک نظام تھا جسے ایوب خان نے قومی سطح پر مسلط کیا ہواتھا۔ مجھے اور میرے بہت سے دوستوں کو محسوس ہوا کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا جارہا تھا اور ہم سے ایک مضبوط طلباء ادارے کا انتخاب کرنے کا حق چھین کر ہماری توہین کی جارہی تھی۔ سیاسی پارٹیوں کے مروجہ سیاسی ونگ بدقسمتی سے یونین کی پابندی کو قبول کرچکے تھے۔ اور کوئی ایسا پلیٹ فارم موجود نہیں تھا جس کے ذریعے طلباء یونین کی بحالی کی تحریک چلائی جاسکتی۔ پنجاب یونیورسٹی کو ایک آمر وائس چانسلر حمید احمد خان کے ذریعے چلایا جارہا تھاجو اپنے مزاج میں ایوب خان سے

مشابہت رکھتا تھا۔ وہ ایک انتہائی طاقتور وائس چانسلر تھا جو قدیم طرز کے خوف اور سخت کنٹرول کے ذریعے انتہائی سخت نظم ونسق کی پالیسی کا قائل تھا۔ اساتذہ اور طلباء دونوں اس کی سختی سے خوف زدہ رہتے تھے۔ سٹوڈنٹس افیئر ڈیپارٹمنٹ ، انٹیلی جنس ایجنسیوں اور پولیس کے ادارے کی حیثیت اختیار کرگیا تھاجوطلباء کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ کسی کو یونین کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کچھ ہمت کر کے چند ایک خود ساختہ انقلابیوں سے اس معاملے میں

بات چیت کی مگر انہیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ طلباء یونین کی بحالی کو فضول اور وقت کا ضیاع سمجھتے تھے۔ مگر میں نے اپنی بات کرنا نہیں چھوڑی یہاں تک کہ غیر سیاسی ،غیر سنجیدہ دوستوں سے بھی اس بارے میں بات کرتا رہا جس کے نتیجے میں دو ہم نوا ساتھی میسر آگئے۔ ہم نے اپنے تئیں طلباء یونین کی بحالی کیلئے ایک خفیہ کمیٹی تشکیل دی اور پمفلٹس اور ہاتھ سے لکھے ہوئے پوسٹرز تقسیم کرنے شروع کردیئے۔

سب سے ڈرامائی واقعہ شعبہ نفسیات کی نمائش کے موقع پر پیش آیا۔ وائس چانسلر اس نمائش کے افتتاح کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے کوٹ کی جیب میں یونین کی بحالی کے حوالے سے ہینڈ بلوں کا ایک بنڈل پہنچ چکا تھا جو میں نے اسے اس وقت ڈالا جب وہ میرے سٹال پر آلات کے معائنے کے لیے پہنچا۔ جب وائس چانسلر نے گھر جاکر ان کوپڑھا تو وہ حیران رہ گیا ۔ اپلائیڈ سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کو فوری طور پر بلایا گیا اور اسے کاروائی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اسے کہا گیا کہ تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں صرف سات لڑکے ہیں اور تم انہیں بھی کنٹرول نہیں کرسکتے۔بیشتر ماہرین نفسیات کی طرح ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ڈاکٹر غلام جیلانی بھی ایک ہونق انسان تھاجواکثر و بیشتر اعصابی تنائو کا شکار رہتا تھا۔ اس واقعے کے بعد یونین کی بحالی کی تحریک عام ہوچکی تھی۔ ہم کیمپس کے اندر چھوٹے چھوٹے مظاہرے کرنے کے قابل ہوگئے جس میں ہم نعرے لگاتے اور جوشیلی تقریریں کرتے اور یونیورسٹی کے اوپر مسلط آمرانہ حکمرانی سمیت ملک کے اوپر مسلط آمرانہ حکومت کے خلاف بھی نعرے لگاتے۔ مختلف شعبوں کے طالب علم آہستہ آہستہ ہمارے مظاہروں میں شریک ہوتے گئے ۔ یہاں تک کہ کچھ بائیں بازو کے طلباء بھی ہمارے ساتھ آملے۔

اسی دوران سوسائٹیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ ملک میں‌ہونے والے بنیادی جمہوریت کے الیکشن کی طرح ان سوسائٹیوں کا انتخاب بھی بالواسطہ ہوتا تھا۔ ہر ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے ان سوسائیٹیوں کے ممبروں کا انتخاب کرتے جو بعد میں ایک ایڈھاك کمیٹی کا انتخاب کرتے تھے ۔ ہم نے ا س پر طویل بحث و مباحثہ کیاکہ کیا ہمیں ان الیکشن میں حصہ لینا چاہیے یا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ ان میں حصہ لینے کا مطلب انہیں

قانونی طور پر درست تسلیم کرنا تھا۔ جبکہ ان کا بائیکاٹ کر کے ہم یونین پرست عناصر سے کٹ کر رہ جاتے۔ میرا موقف یہ تھا کہ اگر ہم اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ہم اس بیہودہ طریق کار کو ننگا کرتے ہوئے یونین کی بحالی کی حمایت کا اعلان کردیں گے۔ مجھے اعتماد تھا کہ ہمارے امیداوار جیت جائیں گے۔ آخر کار میرے موقف کو درست تسلیم کیا گیا۔ ہم نے یونین پرست پلیٹ فارم سے الیکشن میں حصہ لیا اور اکثریت سے جیت گئے۔ الیکشن جیتنے کے فوراً بعد ہم نے یونین کی بحالی کی حمایت کا اعلان کردیا۔ سوسائٹی کے صدور کی بڑی اکثریت نے ایڈہاک کمیٹی کے کنوینر کے طور پر مجھے امیدوار لانے کی حمایت کی۔ مگر اس الیکشن سے پہلے ہی پاکستان میں انقلابی واقعات نے جنم لینا شروع کردیا۔

یہ اکتوبر **1968**ء کی بات ہے جب فورٹریس سٹیڈیم میں ایوب آمریت کے دس سالہ جشن کی تقریبات منائی جارہی تھیں۔ وہاں ہر روز پریڈ ، نمائش اور مظاہرے کیے جاتے اور آمر کی شان میں قصیدہ گوئی کی جاتی تھی۔ دوسرے اداروں کی طرح پنجاب یونیورسٹی کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ سٹیڈیم کو بھرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ طالب علم بھیجے جائیں۔ ہر روز ہر ڈیپارٹمنٹ سے کہا گیا کہ وہ سٹیڈیم میں لازمی اپنے طلباء کو بھجوائے۔ ہم نے خفیہ طور پر ایک گیت تیار کیا جس میں فوجی آمر کی تعریف کی بجائے اس کی مذمت کی گئی تھی اورجس میں ہم نے دس سالہ جشن کی بجائے دس سالہ اداسی کو موضوع بنایا۔ ہم سینئر آرمی افسروں اور بیوروکریٹس کے ہمراہ بریگیڈئیر انکلوژر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب پریڈ شروع ہوئی اور اناؤنسر نے ایوب خان کی عظیم نجات دہندہ کے طور پر تعریف شروع کی تو ہم نے اپنا لکھا ہوا گیت ایک فلمی گانے کی طرز پر با آواز بلند گنگنانا شروع کردیا۔ اس کے ابتدائی کلمات یوں تھے:

”ان دس سالوں نے ہمیں بے انتہا اداس کیا ہے ۔ہم نے ایک نہیں دو نہیں یہ سارے دس سال ضائع کیے ہیں۔“ یہ گیت سننے کے بعد فوجی افسروں اور بیوکریٹس کے چہرے سرخ ہوتے چلے گئے ۔ وہ حواس باختہ ، پریشان اور بھڑک گئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمیں کچا کھاجائیں۔ لیکن ہم طالب علم بھی نوجوان لڑکے ، لڑکیوں پر مشتمل تھے اور ایک دوسرے کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ واقعہ ڈاکٹر جیلانی کے لیے گہرا صدمہ ثابت ہوا اور اس کے اعصاب مزید تناؤ کا شکار ہوگئے۔ میرے ہم جماعت طلباء سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا کہ مجھے شاہد ایک بلا کی شکل میں خواب میں نظر آتا ہے ۔ انہی دنوں ہم کلینیکل سائیکالوجی کا مضمون پڑھ رہے تھے ۔ اس کلاس میں ہم اپنے ادارے کے سربراہ کے خواب کو ہی زیر بحث لاتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد یونین کی بحالی کی ہماری چھوٹی سی احتجاجی مہم جمہوریت

کی بحالی کے ساتھ شامل ہوگئی۔ یہ بہت ہی انقلابی اور جوش و جذبے والے دن تھے جب ساری دنیا میں انقلاب اور آزادی کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ یہ تحریکیں دن بدن زور پکڑتی جارہی تھیں۔ ویت نام جنگ کے خلاف مہم نے ساری دنیا کے امن پسند نوجوانوں کو ایک عالمگیر جوش اور جذبے سے سرشار کردیا تھا۔ امریکہ ، برطانیہ ، فرانس اور جرمنی میں انقلابی طالب علموں نے اپنی تحریک کے ذریعے سرمایہ دارانہ سماج کو ہلاکر رکھ دیا تھا۔ ایک عالمی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ ہم باقاعدگی کے ساتھ یورپ میں ہونے والے واقعات اور خاص طور پر طلباء اور پولیس کے درمیان ہونے والے جھگڑوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہماری تحریک کو حوصلہ دینے والا ایک اور ذریعہ مشرقی پاکستان میں طلباء احتجاج تھا جو دن بدن بڑھتا چلا جارہا تھا۔ ہمارے لیے مشرقی پاکستان کے طلباء سیاسی طور پر زیادہ مضبوط ، مستحکم، منظم اور متحرک قوت کے طور پر مثال بنتے چلے گئے۔

ایک اور طاقت جو ہماری سرزمین پر زور پکڑ رہی تھی وہ سندھ سے تعلق رکھنے والا مقبول عام نوجوان کرشماتی

لیڈر ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ ایوب خان کی کابینہ کو چھوڑنے کے بعد اور پاکستان پیپلز پارٹی کو قائم کرکے بھٹو نے ایک مقبول عام سوشلسٹ نعرہ بلند کرتے ہوئے جرأت کے ساتھ ایوب خان کے آمرانہ اقتدار کو چیلنج کیا۔ ہم میں سے بہت سے نوجوانوں کے لیے بھٹو بطور ایک نوجوان ، ایک کرشمہ، ایک جرأت مند انسان اور ایک ترقی پسند کے طور پر ابھرا۔ میں بھی انہی نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنا جو مضمون لکھا وہ بھٹو کے متعلق تھا جس کا عنوان تھا ”صحرا میں اگنے والا پھول“ ۔ بھٹوجب ایوب خان کی کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد ریل کے ذریعے لاہور پہنچا تو میں بھی ان لاکھوں انسانوں میں سے ایک تھا جو اس تاریخی اور پاگل کردینے والے استقبال میں شریک تھا۔ اس کے بعد نومبر آیا ، جس میں راولپنڈی کے پولی ٹیکنیکل کے طالب علم عبدالحمید کو ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے فائرنگ کر کے شہید کردیا تھا۔ راولپنڈی سے پھوٹنے والے یہ مظاہرے لاہور اور پھر کراچی میں پھیل گئے اور اس کے بعد ایسا لگا کہ جیسے سارے پاکستان کے نوجوان اس کا انتظار کررہے تھے۔ آمریت کے دس سال ، چاپلوسانہ جمہوریت ، سیاسی کارکنوں پر جبرو تشدد، امیری اورغریبی کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ‘ چھوٹے صوبوں میں تنہائی کا احساس، اور نوجوانوں کو آزادیاں نہ ملنے کا احساس ان سب نے مل کر طالب علموں کو ایک زندہ و جاوید سیاسی تحریک کی لڑی میں پرودیا۔ ہم نیو کیمپس کے طالب علم پہلے ہی بھڑکے ہوئے تھے اور یونین کی بحالی کی تحریک کے ساتھ ساتھ دس سالہ جشن کے خلاف سرگرمیوں میں شریک اور ملوث تھے۔ راولپنڈی میں ہونے والے قتل نے ساری کیفیت کو بدل کے رکھ دیا۔ ہم نے اس قتل کے خلاف نیو

کیمپس سے شہر میں واقع اولڈ کیمپس تک احتجاجی مارچ کا فیصلہ کیا۔ یہ فاصلہ چھ کلومیٹر سے زیادہ بنتا ہے۔طلباء سے ملنے والے رسپانس نے ہمیں حیران کر کے رکھ دیا۔ سولڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل جلوس جھنڈے اور پلے کارڈ ہاتھوں میں لیے ہمارے ساتھ اس ریلی میں شریک ہونے کے لیے تیار تھا۔ اس ریلی میں ایف۔ سی کالج ، سمیت دوسرے کالجز کے طلبا و طالبات بھی شامل ہوگئے۔ ہمیں شہر کے مرکز میں واقع اولڈ کیمپس تک پہنچتے ہوئے چار گھنٹے لگ گئے۔ یہ ریلی منظم اور پر امن تھی۔ یہ نئے سے پرانے کیمپس کی طرف ابتدائی ریلی تھی۔ جس کے بعد یہ ایک نہ رکنے والا سلسلہ بن گیا۔ اب ہمارے رابطے ایم۔ اے ۔ او کالج، اسلامیہ کالج اور دیا ل سنگھ کالج سے بھی قائم ہوچکے تھے۔ ہم نیو کیمپس سے شروع ہوکر کینال بینک روڈاور وہاں سے اپر مال سے ہوتے ہوئے چیئر نگ کراس یا ریگل چوك پر پہنچ جاتے ۔ جہاں دوسرے کالجوں کے طلباء آکر ہمارے ساتھ شریک ہوجاتے تھے۔چیئر نگ کراس اورریگل کے درمیان کا علاقہ طالب علموں سے بھر جاتا ، ٹریفک کا بہائو اور نظم و نسق طلباء کی ذمہ داری بن کر رہ گیا۔ خود میں نے بھی کئی بار ٹریفک وارڈن کی ڈیوٹی سرانجام دی۔ ٹریفک کے بہائو کو کنٹرول کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی حرکت کا انداز مجھے ایک نیا منفرد تجربہ محسوس ہوا۔ میں آج تک طاقت کے اس احساس کو یاد کرتا ہوں کہ جب ایک چبوترے پر کھڑے ہو کر کاروں، سکوٹروں وغیرہ کو میں جب چاہتا روك دیتا اور جب ہاتھ ہلاتا انہیں جانے دیتا۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہمارے رابطے راولپنڈی ، پشاور ، کراچی اور کوئٹہ کی طلباء قیادت کے ساتھ قائم ہوچکے تھے جوشروع میں توآگے آگے تھے مگر پھر کمزور پڑتے چلے جارہے تھے۔ وہ نظریاتی طور پر اتنے مضبوط اورسیاسی طور پراتنے سنجیدہ نہ تھے۔ مگر کراچی اور پشاور کے طلباء متحرك اور منظم تھے اور ان کو سیاسی حمایت بھی حاصل تھی۔ جب کہ مشرقی پاکستان کے طلباء کی قیادت ایک اور مختلف انداز میں تھی۔ ان کا قومی اور سیاسی انداز دلوں کو چھو لینے والا تھا جس نے حقیقت میں ہمیں بہت متاثر کیا۔ ہم ان کے لیے ہمدردی اور یک جہتی کے جذبات سے سرشار تھے۔ جب بھی' جہاں بھی مشرقی پاکستان میں پولیس طلباء کو گرفتارکرتی یا ہلاك یا زخمی کرتی تو ہم ان کے ساتھ یک جہتی کے لیے جلوس نکالتے اور بھرپور انداز میں ان کی حمایت کا اعلان کرتے۔ مغربی پاکستان میں بھٹو ایک قومی ہیرو کے طور پر ابھر رہا تھا اور وہ تحریک کا قائد بن چکا تھا۔ اس کا اسلامی سوشلزم کا نعرہ خاص طور پر نوجوانوں میں بہت مقبول ہوچکا تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے انہیں اسلام اور سوشلزم کے مابین انتخاب کرنے کی تکلیف سے بچنے کا ایک آسان راستہ میسر آگیا تھا۔ بھٹو کا عوامی طرز ایک طرف انقلابی جوش و جذبے اور دوسری طرف مقامی بہادری کامرکب تھا اور عوام اس سے محبت کرتے تھے۔ اس

نے حکمرانوں کا مذاق اڑایا ،ان کی نقالی کی،ان کی توہین کی،ان کو برا بھلا کہاجس پر عوام اس کے گرویدہ ہوتے چلے گئے۔ بھٹو کے لاہور کے دورے نے تحریک کو بڑی تقویت دی۔ ابھی تک ا س تحریک پر طلباء حاوی تھے مگر اب پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے طلباء اس میں اہم اور مرکزی کردار ادا کررہے تھے۔ مشہور کالجوں کے طالب علم رہنما جلسوں سے تقریریں کرنے ، بیانات جاری کرنے، پریس کانفرنسیں کرنے اور انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کرنے میں پیش پیش رہے۔ لیکن جب تحریک گلیوں میں پھیلی ، پولیس مقابلے شروع ہوئے، سادہ کپڑوں والی پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہوا، بڑی دکانوں کے شیشے ٹوٹنے شروع ہوگئے تو پیپلز پارٹی کے جوانوں نے پولیس کو شکست سے دوچار کیا۔ پولیس کے جبرو استبداد کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور آنسو گیس کی شیلنگ کا سامنا کرنا ہمارے لیے حیران کن عمل تھا۔ یہ چند دنوں کی ہی بات تھی کہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے طلباء ونگ بھی ایک ایسی تحریک میں آ شامل ہوئے جسے وہ بورژوا قرار دیتے چلے آرہے تھے۔ اب تحریک میں پیپلز پارٹی کے جھنڈوں اور سیاسی بینروں کے ساتھ ساتھ دوسری جماعتوں کے بینر بھی نظر آنے شروع ہوگئے جن میں آمریت کے خاتمے اور طلباء مطالبات کا ذکر تھا۔ وہ باقاعدہ طالب علم رہنما جنھوں نے اس تحریک کا آغاز کیا ان کو یہ احساس ہونا شروع ہوگیا کہ نوجوان سیاسی کارکنوں نے ”ان کی تحریک کو ہائی جیک کرلیا ہے“ اور اسے ایک پارٹی کا سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے۔ شروع شروع میں طلباء مظاہرے اور پارٹی مظاہرے الگ الگ اور اپنے کردار میں بالکل مختلف ہوتے تھے۔ لیکن جلد ہی یہ فاصلے یا تو ختم یا غیر متعلقہ ہونے شروع ہوگئے۔ ان کو اکائی میں جوڑنے والا عنصر پولیس کا بلا امتیازاور بے رحم جبر و تشدد اور اندھا دھند گرفتاریاں تھا۔

میں انٹر کالجیٹ باڈی کا منتخب جنرل سیکرٹری تھا جو شہر کے کالجوں کی طلباء کی منتخب شدہ باڈیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس حوالے سے یہ باڈی لاہور کے طلباء کی مستند جمہوری آوازبن کر سامنے آئی۔ اس باڈی نے طلباء اور دیگر سیاسی مطالبات کے تحت طلباء کو جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ کچھ دنوں تک اس باڈی نے اپنا آزاد تشخص برقرار رکھا۔ مگر تحریک تیزی سے پھیلتی چلی جارہی تھی۔ سماج کے بہت سے حصے اس میں شریک ہوتے چلے جارہے تھے۔ کئی اور سیاسی پارٹیاں اس میں ملوث ہورہی تھیں۔ ان میں نیپ (بھاشانی) ، نیپ (ولی خان) سوشلسٹ پارٹی، مزدور کسان پارٹی اور عوامی لیگ شامل تھے۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن اور نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن جوش و جذبے کے ساتھ سرگرم ہوچکی تھیں۔ ٹریڈ یو نین اور مزدوروں کی دوسری تنظیمیں بھی تحریک کا حصہ بن چکی تھیں۔ اس لیے اب یہ غیر حقیقی یا احمقانہ بات لگتی تھی کہ اس تحریک کو ”صرف طلباء تحریک“ ہی قرار دیا جاتا۔

پولیس ہر وقت میری تلاش میں تھی اور میں انہیں دھوکہ دیتے پھر رہا تھا۔ میں اچانک ایک بڑے مظاہرے میں نظر آتا اور تقریر کرتا، اور پھر ایک گروپ میری حفاظت کرتا، پھر بعد میں لاہور کی گلیوں میں غائب ہوجاتا۔ یہ ایک کھیل تھا مگر گرفتاری اور اس کے بعد ہونے والے نتائج و عواقب کا خوف بھی میرے ساتھ چمٹا رہتا۔ مگر یہ خوف مجھے روک نہیں سکا۔ تحریک کا جوش و جذبہ اور مجھ سے وابستہ دوسروں کی توقعات اور سب سے بڑھ کر ایک آمر کو چیلنج کرنے کی خوشی کسی طور پر چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ مگر بالآخر فروری 1969ء میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں میں بظاہر محفوظ تھا۔ میرے گھر پر کمانڈوز سٹائل میں رات کو چھاپہ مارا گیا۔ وہ میرے کمرے میں کھڑکیوں اور پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ انہوں نے میرے کمرے کو اتھل پتھل کرڈالا۔ میرے باپ کو حراست میں لے لیا گیا۔ اسی دوران میرے ایک ہمسائے کا بچہ جب یہ دیکھنے آیا کہ یہاں کیا ہورہا تو اسے بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ میرے والد کو پولیس سٹیشن میں لے گئے ہیں تو میرے پاس اورکوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں۔ مجھے ایک بدنام زمانہ ڈی۔ ایس۔ پی اصغر خان (ہلاکو خان) کی خدمت میں سول لائنز پولیس سٹیشن میں پیش کیا گیا۔ اس نے مجھے ایک سٹول پربیٹھنے کو کہا اور ٹیبل لیمپ کا رخ میرے چہرے کی طرف کردیا۔ اس نے اپنی چھڑی گھماتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر چیخ کر بولا تمہارے ساتھی کون کون ہیں؟ مجھے اس کے سوال پر تعجب ہوااور اسکی کرختگی اور مصنوعی پن سے دھمکانے کے انداز پر مجھے ہنسی آئی اور میں‌نے سوچا کہ اس نے بہت سی ڈرائونی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن ہلاکو مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا' تنگ آکر اس نے مارٹوف کاک ٹیل بم والا فارمولا استعمال کیا جو جرمنی اور فرانس میں انقلابی طلباء کے مابین بہت مقبول ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا' یہ کتاب تمہاری ہے؟۔ اسی سٹائل میں وہ ڈرامائی انداز میں مجھ پر چیختا چلاتا رہا اور مجھ سے یہ اعتراف کرانے میں

ناکام رہا کہ میں ایک ٹراٹسکائٹ انقلابی تھا جو بم نصب کرنے کی منصوبہ بندی کررہا تھا اور جس کے پاس کامریڈوں کا اپنا ایک خفیہ نیٹ ورک تھا۔ بالآخر اس نے مجھے حوالات میں بھیج دیا۔ میں نے دو راتیں وہاں گزاریں۔ یہ مکمل طور پر خالی جگہ تھی۔ نہ کوئی بستر، نہ کوئی کمبل جسے میں فروری کی ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں اپنے کام لاتا۔ یہاں تک کہ کھڑکیاں اور دروازے بھی لوہے کی سلاخوں پر مشتمل تھے۔ وہاں کاغذ کا ایک ٹکڑا تک بھی موجود نہ تھا۔ ماسوائے ردی کے ایک پرانے اخبار کے ٹکڑے کے۔ میں نے رات کا زیادہ تر حصہ اٹیچ ٹوائلٹ میں گزارا جو بدترین بدبو کے باوجود بڑی حد تک گرم تھا۔ یہ قید میرے لیے ہلادینے والی تھی مگر میں ایک اور پل عبور کرچکا تھا۔ میں اپنے

ایک اور خوف پر قابو پاچکا تھا۔ ہمیں ہائی کورٹ کے حکم پر کچھ دنوں بعد ضمانت پر رہا کردیا گیا مگر میں اندر سے تبدیل ہوچکا تھا۔ پیپلز پارٹی کے سرگرم جیالے عام طور پر طلباء رہنمائوں کو نرم مزاج سمجھتے تھے جو پولیس کے تشدد اورگرفتاریوں یا پھر پولیس اور دکانوں پر پتھرائو سے گریز کرتے تھے۔ لیکن اب وہ مجھے قبول کرنے پر تیار ہوگئے، میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے اس وقت ان کے ساتھ شریک ہوگیاجب انہوں نے پنجاب سیکرٹریٹ پر دھاوا بولا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا لکھا مقرر اب ایک شعلہ جوالہ بن کر سامنے آچکا تھا۔ میرے اندر آنے والی یہ تبدیلی صرف ظاہری اور نعروں کی حد تک نہ تھی بلکہ یہ ایک حقیقی بامعنی اور ایک نظریاتی تبدیلی تھی۔ دنیا کو دیکھنے اورپرکھنے کے لیے اپنے سیاسی عقائدکے اعتبارسے میں ایک کمیونسٹ بن چکا تھا۔ میں نے مزدوروں کی طاقت اور عوام کی قوت کا بے پناہ مظاہرہ دیکھ لیا تھا۔ فروری کے آخر تک کارخانے میں کام کرنے والے مزدور شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے تھے۔ لاہور کی مال روڈ سمیت شہر کے سبھی اہم مقامات ان کے کنٹرول میں آچکے تھے۔ وہ سڑکیں اور چوراہے جہاں کبھی ہم طالب علم حکمرانی کرتے تھے اب ان کے کنٹرول میں آچکے تھے۔ مزدوروں کے پیچھے پیچھے مارچ کے مہینے میں کسان اور کھیت مزدور بھی اس تحریک کا حصہ بن گئے تھے۔ اور یہ صرف لاہور میں نہیں ہورہا تھابلکہ سارے پاکستان میں عوام اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے عوامی مظاہرے ہر طرف ہر جگہ چھوٹے بڑے شہروں میں منعقد ہورہے تھے۔ پولیس کے ساتھ جھڑپیں، روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ ہزاروں افراد گرفتارکرلیے گئے۔ ان میں اپوزیشن کے سیاسی قائدین بھی شامل تھے۔ جنہیں ایوب خان کے نافذ کردہ ایبڈو قوانین کے ذریعے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ایوب خان نے گول میز کانفرنس کے ذریعے اپوزیشن کے ساتھ بات چیت اور مصالحت کی کوشش کی۔ مگر اسے دیر ہوچکی تھی۔ عوامی تحریک کاسیلاب کسی کے روکے نہیں رک رہا تھا۔ مارچ کے آخر میں جنرل ایوب خان نے استعفیٰ دے دیا۔ مگر فوجی ہونے کے ناطے سے اس نے اپنی جگہ جنرل یحییٰ خان کے حوالے کردی تھی۔ میں بھی دوسرے طالب علم لیڈروں کی طرح اس بات کا قائل ہوچکا تھا کہ ایک جنرل کی دوسرے جنرل سے تبدیلی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ہم جرنیلوں کی نہیں نظام کی تبدیلی کے لیے لڑ رہے تھے 'ایک جمہوری منصفانہ اورسوشلسٹ نظام کے لیے ۔ جلد ہی لوگ یحییٰ حکومت کوپہچان گئے اور احتجاج دوبارہ شروع
ہوگیا۔

میں اب ایک بائیں بازو سے وابستہ NSF اور ینگ پیپلز فرنٹ کا ممبر تھا۔ یہ چھوٹا سا بائیں بازو کا گروپ ڈاکٹر عزیز الحق نے تشکیل دیا۔ بھٹو اور بنگالی انقلابی لیڈر بھاشانی یحییٰ حکومت کے خلاف تحریک کی قیادت کررہے تھے۔ جبکہ جماعت اسلامی

جواس وقت کے وزیر اطلاعات جنرل شیر علی کی آشیر باد سے کام کررہی تھی نے یہ فیصلہ کیا کہ کمیونسٹ ان کے سب سے بڑے دشمن اور فوجی حکمران ان کے دوست اوراتحادی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اورنیشنل عوامی پارٹی عوامی تحریک کی قیادت کررہی تھیں جبکہ جماعت اسلامی فوجی حکومت کے ساتھ ان کی و حشیانہ بربریت میں مکمل امداد و معاونت کررہی تھی۔ باالآخر ہم طلباء کا ایک اہم مطالبہ تسلیم کرلیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی یونین بحال کر کے الیکشن کا اعلان کردیا گیا۔ مگر بہت جلد یہ واضح ہوگیا کہ یحییٰ حکومت اسلامی جمعیت طلباء کو پنجاب یونیورسٹی میں مسلط کرنا چاہتی ہے۔ جب ہم نے دھاندلی زدہ ، بدنیتی پر مبنی الیکشن پر احتجاج کرنا چاہا تو ہمیں ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس بار ہمارا مقدمہ ایک فوجی عدالت میں چلا یا گیا۔ ہم نے اس عدالت کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے بہادری سے مقدمہ کا سامنا کیا۔ اس بار میں نے دو مہینے جیل میں گزارے۔ اب ہم باقاعدہ طور پر ایک جمہوری تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے والی مقبول عام انقلابی تحریک کا باقاعدہ حصہ بن گئے تھے۔ جیل میں گزرے ہوئے اس وقت نے مجھے سیاسی کارکنوں' بڑے نامی گرامی مجرموں اور بے یارو مددگار قیدیوں سے میل جول کا موقع فراہم کیا۔ یہ قیدمیرے لیے یونیورسٹی ڈگری کے بعد سیاسی عمل کی تربیت گاہ ثابت ہوئی۔ جیل کے یہ میرے ساتھی بعد میں میرے ڈراموں کا کردار بھی بنے۔ جیلوں کی نگرانی کے انتظام نے مجھے ایک غیر معمولی بصیرت عطا کی۔ جس کے بعد میں اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی نظام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگا۔ جب میں رہا ہوا تو میں نے اپنے آپ سے انقلابی نظریات کے لیے اور زیادہ بڑھ چڑھ کر کام کرنے کا عہد کیا۔ میں رہائی کے فوری بعد مزدوروں اور کسانوں کی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی تاریخ ساز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے پہنچ گیا۔ سرخ پگڑیاں اور ٹوپیا ں پہنے ہوئے مزدوروں ،جوش اور جذبے سے لبریز طالب علموں ، سخت کوش اور جرأت مند ٹریڈ یونینسٹوں اور سوشلسٹ دانشوروں کا یہ ایک ایسا اجتماع تھا جہاں سب کے سب انقلابی تبدیلی کے مقصد سے لبریز تھے۔

اکتوبر 1968ء سے مارچ 1969ء تک ایک تاریخ ساز عرصہ تھا۔ یہ پاکستان کے عوام کی ایک آمر کے خلاف پہلی جدوجہد تھی۔ یہ پہلی تحریک تھی جسے طلباء نے شروع بھی کیا اور رہنمائی بھی کی۔ یہ تحریک اپنی بنیاد میں پاپولر اور بائیں بازو سے وابستہ تھی۔ اس دوران دائیں بازو کی قوتیں چپ سادھے رہیں اور کچھ کرنے کے قابل نہ تھیں۔ اس تحریک نے طالب علموں کی پوری نسل کو انقلابی بنا دیا۔ جنھوں نے بعد میں پاکستان کی مستقبل کی سیاست کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے کئی آج بھی ملکی سیاسی پارٹیوں میں اہم عہدوں پر

ہیں۔ انہی میں سے کئی ایک نے ثقافت ، تعلیم و تدریس اور ادب و فن کے کارہائے

نمایاں سرانجام دیے۔ فنکاروں ، لکھاریوں ، شاعروں ، صحافیوں ، مفکروں ، سیاسی کارکنوں ، ٹریڈ یونینسٹوں ، ہر شکل میں ان کے اندر 1968ء کے انقلاب کی روح موجزن ہے۔ جس انقلاب کا ہم نے خواب دیکھا اور جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی، وہ نہیں آسکا۔عالمی انقلاب کے شکست کھانے میں کئی بڑی وجوہات تھیں۔ مگر 1968ء کے انقلاب نے ہماری زندگیوں کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ میرے لیے تو یہ انقلاب ایک مکمل انقلاب ثابت ہوا۔ میں اور میرے بے شمار ساتھی اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی جگہوں پر ابھی تک انقلاب کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔"

جام ساقی (حیدر آباد)

کامریڈ جام ساقی برصغیر پاک و ہند کے معروف ترین بائیں بازو کے لیڈروں میں سے ایک ہیں۔ نوے کی دہائی کے شروع تک جام ساقی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ہرپاکستانی حکومت خاص طور پر فوجی حکومتوں نے انہیں اپنے جبرو تشدد کا نشانہ بنائے رکھا۔ جنرل ضیاء کے وحشیانہ دور حکومت میں جام ساقی نے آٹھ سال تک قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اب وہ عالمی مارکسی رحجان کے ایک سرگرم ممبر ہیں۔ سندھ کی بائیں بازو کی سیاست میں وہ ایک معتبر نام ہیں۔ سندھ کے ہر گھر میں ان کا احترام کیا جاتا ہے وہ 69-1968ء کی تحریک کے صرف چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ سرگرم کردار بھی رہے ہیں' جس نے ایوب خان کی حکومت کی بنیادوں کو نہیں بلکہ پاکستان کے سرمایہ دارانہ نظام کو ہلا کررکھ دیا تھا۔ جام ساقی ان دنوں ایک سرگرم طالب علم لیڈر تھے۔ تحریک کے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے مصنف کو انہوں نے بتایا:

"4 مارچ 1967ء کو مزدوروں' کسانوں ، طالب علموں اور سماج کے دوسرے کچلے ہوئے طبقات نے سندھ میں ایک تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے مطالبات و مقاصدمیں آمریت کا خاتمہ اور سماج میں سوشلسٹ معاشی اور سماجی تبدیلیاں لانا تھا۔ کامریڈ جام ساقی نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا جب تحریک شروع ہوئی تو میں ایک طالب علم لیڈر تھا۔ ہم مختلف کالجوں اوریونیورسٹیوں کا دورہ کرکے طالب علموں اور نوجوانوں کو تحریک میں شمولیت کے لیے آمادہ کرتے۔ صورتحال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ صرف اخبار میں پریس ریلیز لگنے سے ہی طالب علم اور مزدور ہڑتا ل کردیا کرتے تھے۔ جب تحریک شروع ہوئی تومیں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی صوبہ سندھ کی کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ پارٹی کی مرکزی قیادت نے طلباء مزدور کسان رابطہ کمیٹی قائم کی تھی تاکہ ایک دوسرے کے کام کو جدوجہد کے مرحلہ میں باہم جوڑا اور مربوط کیا جائے

۔ سندھ ہاری کمیٹی جسے حیدر بخش جتوئی نے قائم کیا تھا' ان کی بھرپور حمایت کر رہی تھی۔ بھٹو بھی سیاست میں متحرک تھا۔ لیکن تحریک کے شروع ہونے تک وہ اتنا مقبول نہیں تھا۔ تحریک نے اسے مقبولیت دی کیونکہ وہ سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں عوام کا انقلابی ابھار بھٹو کو متاثر

کرتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ اور دن بدن بائیں بازو کی طرف کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ جام کے الفاظ میں تحریک کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ پولیس اور فوج کو کسی بھی غریب اور مجبور شخص کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی جرأت نہیں تھی جو اس سے پہلے روزمرہ کا معمول ہوتی تھی۔ جام نے بتایا کہ پاکستان ریلوے کے مزدوروں کی ٹریڈ یونین سب سے بڑی اور موثر ترین یونین تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ 1967ء کی ریلوے مزدوروں کی ہڑتال ان بڑے واقعات میں سے ہے جو اسے ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ یہ ایک بہت ہی مشہور ہڑتا ل تھی ، دوسری بڑی موثر ٹریڈ یونین واپڈا کے مزدوروں کی تھی ان دونوں یونینوں نے دیگر چھوٹی یونینوں کے ساتھ مل کر سرمایہ دارانہ نظام اور ریاست کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے جام نے بتایا کہ پاکستان ریلوے کے مزدور جب ہڑتال پر تھے تو انتظامیہ نے ہڑتا ل کو توڑنے کے لیے ٹرینوں کو زبردستی چلانے کی کوشش کی۔ روہڑی ریلوے سٹیشن پر ریلوے کے مزدور ریل کی پٹڑی پر لیٹ گئے اور ریلوے ٹریفک کو بلا ک کردیا ۔ یہ اس تحریک کے جو ش جذبے اورجرأت کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس وقت واپڈا اورریلوے کے مزدوروں کی حمایت کا رخ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی طرف تھا۔ لیکن ان کی ٹریڈ یونین پارٹی ڈسپلن کی پابندنہیں تھی صرف ایک آل پاکستان ٹریڈ یونین آرگنائزیشن کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ 14فروری 1969ء کو پاکستان کی دائیں اور بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں پر مشتمل ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی نے ایک ہڑتال کی کال دی۔کمیونسٹ پارٹی نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ بھی اس ہڑتال میں شریک ہوگی اور اس ہڑتال میں مزدور طبقہ کی شرکت کو یقینی بنائے گی۔ کمیونسٹ پارٹی کے دو لیڈر جن میں سے ایک معروف ٹریڈ یونین لیڈر شمیم واسطی تھے اور دوسرے ڈاکٹر اعزاز نذیر تھے ان کو ایکشن کمیٹی کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے بھیجا گیا۔ اس میٹنگ میں انہوں نے صنعتی مزدوروں کو ہڑتال میں شریک کرنے کی تجویز نہیں رکھی۔ اگر صنعتی مزدور اس ہڑتال میں شریک ہوجاتے تو یہ ایک بہت ہی کامیاب عام ہڑتال ثابت ہوتی جس سے کمیونسٹ پارٹی کو وسیع عوامی حمایت بھی حاصل ہوتی اور وہ عوامی ابھار کے ان لمحات میں ایک بڑی قوت بن کر سامنے آجاتی ۔ اس گفتگو میں جام ساقی نے بتایا کہ اس تحریک کے دوران جب وہ طالب علم لیڈر تھا تو ریاستی ایجنسیوں نے اسے مختلف قسم کی مراعات اور رشوتیں دینے کی پیش کش کی۔ اسے ڈھاکہ یا پشاور یونیورسٹی میں سکالر شپ کی پیش کش کی گئی اس کے انکار پر اسے

ڈپٹی کمشنر کا عہدہ بھی پیش کیا گیا بشرطیکہ وہ صرف سول سروسز کے امتحان میں شامل ہوجائے۔ لیکن اس نے ہر قسم کی رشوت اور بدعنوانی سے صاف انکار کردیا۔

تحریک کے ان دنوں میں رجعتی قوتیں اور مذہبی انتہا پسند شکست خوردگی کے عالم میں تھے اور دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔ عوام کے انقلابی جوش اور جذبے کو دیکھتے ہوئے ملائوں اور ان کی سیاسی پارٹیوں مثلا جماعت اسلامی کو بائیں بازو کا مقابلہ کرنے کی توفیق ہی نہ رہی تھی۔ رجعتی مذہبی پارٹی، جماعت اسلامی نے حیدر آباد میں 1967ء میں ایک مظاہرہ منظم کیا۔ اسے تعلقہ سے لے کر گڑھی کھادا کے علاقے تک مارچ کرنا تھا۔ ہمیں معلوم ہوا

کہ وہ جمال عبدالناصر کی تصاویر جلانا چاہتے ہیں۔ ناصر مصر کا وہ صدر تھا جس نے مذہبی انتہا پسندوں کے مصری انقلابیوں پر کیے جانے والے فاشسٹ حملوں کو سختی سے کچل دیا تھا۔ جام ساقی کے بقول اگرچہ تمام جلوس اس کے پیچھے تھا۔ اوران کی پیروی کررہا تھا لیکن کسی کو جمال کی تصویریں جلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ جبکہ ہم صرف دس ساتھی اس جلوس میں شریک تھے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ جانتے تھے کہ ہماری عوام میں خاصی توقیر ہے۔ او ر اگر انہوں نے ہماری مخالفت کی تو لوگ ان کیخلاف ہماری حمایت کریں گے۔ کامریڈ جام ساقی کا اب کہنا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی قیادت سمیت دیگر بائیں بازو کی پارٹیوں کی 69-1968ء کی تحریک کے دوران سب سے بڑی کمزوری ان کا دو مرحلوں کا نظریاتی موقف تھا' جس کی وجہ سے وہ تحریک کے سوشلسٹ کردار کو سمجھنے میں بری طرح ناکام رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک پر ذوالفقار علی بھٹو کو حاوی ہونے کا موقع مل گیا۔ کمیونسٹ پارٹی اور اس کی قیادت یہ سوچ رہی تھی کہ تحریک صرف ایوب خان حکومت کے خلاف ایک ردعمل کے سوا کچھ نہیں اور اس نظام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا مگر وہ اس تحریک کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق ایک واضح پروگرام دینے میں ناکام رہے۔ یہ تحریک اپنی فطرت میں سوشلسٹ تھی۔ یہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی ایک فاش اور بھیانک غلطی تھی۔ بھٹو اس وقت بہت سے کمیونسٹوں کو پیپلزپارٹی کی طرف جیتنے میں کامیاب رہا جس میں جام ساقی بھی شامل تھا۔ بھٹو نے دو سری بار جام ساقی اور سوبھو گیان چندانی کو الیکشن میں پارٹی کی ٹکٹ آفر کی جو انہوں نے مسترد کردی۔ کامریڈ جام ساقی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کمیونسٹ پارٹی تحریک کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہی۔ اگر وہ نظریہ مسلسل انقلاب کو سمجھ لیتے اور اس تناظر میں انقلابی کیڈر اور نوجوانوں کو تیار کرتے تو کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان تیزی کے ساتھ عوامی حمایت بھی حاصل کرلیتی اور انقلاب کو ایک سوشلسٹ فتح سے بھی ہمکنار

کرلیتی۔ سٹالنسٹ فلسفے کی بدولت وہ پاکستان کی تاریخ کے اس اہم اور فیصلہ کن موڑ پر فاش غلطی کر گئے۔

خاور نعیم ہاشمی(لاہور)

خاور نعیم ہاشمی پاکستان کی اردو صحافت کا ایک معتبر نام اور لاہور میں جیو ٹیلی ویژن کا بیورو چیف ہے اس نے ضیاء آمریت کے خلاف جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ 13 مئی 1978ء کو فوجی جنتا کی طرف سے اسے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں مکمل برہنہ کرکے سر عام کوڑے مارے گئے تھے ۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ آزادی اظہار کا علم بردار تھا۔ 1968ء میں وہ این ڈی اسلامیہ ہائی سکول اچھرہ موڑ میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا' جہاں سے وہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں داخل ہوا۔ تحریک کے دوران سول لائنز کالج سے تقریبا بیس اساتذہ اور پچاس طلباء ایوب آمریت کے خلاف جدوجہد کرنے اور سوشلسٹ ہونے کے الزام میں نکال دیئے

گئے۔ ان میں مشہور استاد ایرک سپرین ، پروفیسر منظور حسین اور امین مغل بھی شامل تھے۔ بعد میں ان اساتذہ نے لارنس روڈ پر شاہ حسین کالج قائم کرلیا جو بہت جلد سیاسی اور نظریاتی بحث مباحثوں اور احتجاجی سیاست کا مرکز بن گیا۔ 69-1968ء کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے خاور نعیم ہاشمی نے بتایا کہ ان دنوں کالج اور سکول کے طلباء انتہائی جوش، جذبے اور ولولے سے لبریز تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی رکنیت کے فارم چار آنے میں دستیاب تھے۔ خاور کے بقول اگرچہ میں بالغ نہیں تھا کہ اپنا ووٹ کاسٹ کرسکوں مگر میں نے پیپلز پارٹی کی ممبر شپ حاصل کر لی تھی۔ میں بڑے ذوق و شوق اور جوش و جذبے کے ساتھ اپنے سکول کے ساتھیوں کے ہمراہ ہڑتال اور مظاہروں میں شریک ہوتا تھا۔ خاور کے والد نعیم ہاشمی 50ء سے 70ء کی دہائی تک کے ایک معروف ترقی پسند اداکار تھے۔ جنھوں نے اپنا اداکاری کا کیرئیر تقسیم سے پہلے کلکتہ سے شروع کیا تھا جب کہ بعد میں وہ لاہور میں منتقل ہوگئے تھے۔

ایک فلمی نقاد اور مورخ کے طور پر خاور نے ثقافتی ماحول میں انقلابی تحریک کے ابھار سے پیدا ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ شاید فلم' ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے فنکار، پینٹرز، رقاص اور موسیقار یہ سب لوگ اس وقت کی انقلابی تحریک سے شدید متاثر ہورہے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے فلم اور فنون کے مختلف شعبوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں اور کاوشوں کے ساتھ کیا۔ 1968ء میں سو سے زیادہ فلمیں ریلیز ہوئیں' جس میں‌سے 64اردو فلمیں تھیں جو پاکستانی فلم کی تاریخ میں ایک سال میں بننے والی ریکارڈ تعداد ہے۔ نامور مصنف ریاض شاہد کی فلم "زرقا" 1969ء میں‌ریلیز ہوئی جو

پاکستان کی سب سے پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم قرار پائی' جس کی کراچی میں مسلسل 101 ہفتے نمائش ہوئی۔ اپنی مقبولیت میں فلمی مورخوں کے نزدیک یہ اب بھی ریکارڈ ہولڈرفلم ہے۔ یہ فلم فلسطین کی تحریک مزاحمت کے موضوع پر بنائی گئی۔ یہ فلسطین کے ان لوگوں کے بارے میں تھی جو اسرائیلی قبضے اور تسلط کے خلاف جدوجہد کررہے تھے۔ اس فلم کے گیت مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب نے تحریر کیے تھے۔ جس کا ایک مشہور گانا ”رقص زنجیرپہن کر بھی کیا جاتا ہے...“ عظیم گلوکار مہدی حسن نے گایا۔ جس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ علاقائی فلمیں بھی بڑی تعداد میں بن رہی تھیں جن میں پشتو، بنگالی اور سندھی فلمیں شامل تھیں۔ لاہور کی فلمی صنعت میں مشرقی پاکستان کے فنکاروں کا راج تھا اور وہ پورے ملک میں انتہائی مقبول تھے۔نہ صرف فلموں بلکہ ادب کی دوسری صفوں میں بھی اس عوامی انقلابی تحریک نے انتہائی گہرے نقوش مرتب کیے۔ مشہور مصور صادقین نے اپنی زندگی کی بہترین پینٹنگز انہی دنوں میں بنائیں۔ یہ عظیم الشان پینٹنگز 1967ء میں منگلاڈیم کی دیواروں اور 1968ء میں پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کی چھت پر بنائی گئیں۔ صادقین نے چالیس کی دہائی میں ہی پروگریسو ، رائیٹرز اینڈ آرٹسٹ موومنٹ میں شمولیت کرلی تھی۔ بشیر مرزا نے بھی سماج کے اندر سے پھوٹنے والی اس انقلابی تحریک

سے متاثر ہوکر اپنے قلم سے شاہکار تخلیق کیے۔ 1965ء کی جنگ پر مبنی تصاویر کی سیریز میں انہوں نے جنگ کی تباہی اور بربادیوں کو انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ انہیں اپنے فن میں کمال اور یکتائی حاصل تھی' جسے عوام میں بے پناہ مقبولیت اور شہرت میسر آئی۔ ان کا ایک اور بڑا شاہکار، پورٹ فولیو آف پاکستان 1967ء میں سامنے آیا۔ پاکستان کے مختلف صوبوں سے عام لوگوں کے پورٹریٹ جو قلم اور سیاہی سے بنائے گئے تھے بہت مقبول ہوئے۔ پاکستان کی تاریخ کا سب سے مقبول مصور شاکر علی بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے کام نے اس وقت لاہور کے باقی فنکاروں پر اثرات مرتب کیے۔

خاور نعیم ہاشمی کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں پاکستانی فلموں کی ہیروئن بھی مارلن منرو اور مدھو بالا کی طرح حسین اور جوان ہوا کرتی تھیں۔ مسرت نذیر' صبیحہ خانم' نیلو اور نیر سلطانہ لوگوں کے دلوں میں رہا کرتی تھیں۔ فلم بینوں کے عشق بھی بدلتے تھے حسن اور اس قدر فراوانی میں تھا کہ ایک چہرے پر مرکوز رہنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

کنیز فاطمہ (کراچی)

مصنف کے ساتھ اپنے انٹرویو میں کراچی میں بات کرتے ہوئے کنیز فاطمہ نے اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی:

"میرا تعلق ٹریڈ یونینسٹوں اور کمیونسٹوں کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ میرا والد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ایک سرگرم رکن تھا' جسے انڈین نیشنل کانگریس میں کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میرے والد نے ریاست کے خلاف سرگرمیوں کے الزام میں چودہ سال قید کی سزا کاٹی تھی۔ میرا بڑا بھائی بھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ اپنے اس سیاسی پس منظر کی وجہ سے میں نیشنل عوامی پارٹی میں اوائل عمر میں ہی شامل ہوگئی تھی۔ میری پہلی سیاسی سرگرمی کراچی میں 1963ء کی مزدوروں میں تحریک میں شمولیت تھی۔ سکیورٹی پرنٹنگ پریس کراچی میں یہ ہڑتال کئی دنوں تک جاری رہی۔ اپنے مفاد پرستانہ کردار کی وجہ سے پرانی قیادت مزدوروں پر عیاں ہوچکی تھی اور وہ اپنی ساکھ کھو چکے تھے اور ایک نئی قیادت پیدا ہوچکی تھی۔ میں مزدوروں کے اہل خانہ کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لئے وہاں گئی جو پچھلے تین مہینوں سے ہڑتال کیے ہوئے تھے۔ میں نے اس علاقے کی سبھی عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کیا اور ان سب کو ریگل چوک پر لے آئی اور جھولی فنڈ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ مزدوروں کی بیویوں اور بہنوں کی گودوں میں ان کے چیختے اور چلاتے ہوئے ننھے بچے تھے ۔ اس عمل کے ذریعے ہم نے صرف بہت سا فنڈ اکٹھا کیا بلکہ مزدوروں کے علاقے سے بے شمار ہمدردیاں بھی جیتیں۔ تیسرے دن جب ہم فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے گئے تو مزدوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے تھے۔ مولانا بھاشانی نے اپنے کراچی دورے کے دوران ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے اپنی پارٹی کے ٹریڈ یونین بیورو میں کام کرنے کا کہا' جس کے بعد میں

رشید ٹیکسٹائل ملز اور دوسرے کارخانوں میں گئی اور وہاں گیٹ میٹنگز شروع کردیں۔ اس کے ساتھ میں لیبر کالونیوں میں جانے لگی اور سٹڈی سرکل کرنے شروع کردیے۔ایوب آمریت کے دوران مجھے کئی بار گرفتار اور شہر بدر کیا گیا جبکہ مزدوروں کے حق میں آواز بلند کرنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کی پاداش میں صنعت کاروں نے کئی بار میری جان لینے کی کوشش کی۔

1966ء میں ہم نے مختلف صنعتوں میں کام کرنے والی مزدور عورتوں کی ایک بہت بڑی ریلی نکالی اس وقت مکمل اختیارات کے حامل کراچی کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ ڈی سی نے مجھ سے کہا کہ اس کے پاس مکمل اختیار ات ہیں اور وہ

مجھے تباہ و برباد کرسکتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر پیپر ویٹ اٹھاکر مارا اور اسے کہا کہ طاقت تمہارے پاس نہیں میرے پاس ہے۔ اگلے دن مجھے شہر سے نکال کر ٹھٹھہ روانہ کردیا گیا۔ وہاں بھی میں نے مزدوروں کو منظم کرنا شروع کردیا۔ میری سب سے بڑی قوت کراچی شپ یارڈ کے مزدوروں کی یونین تھی جو ایک پرجوش کردار کی حامل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے کراچی میونسپل کارپوریشن کے میونسپل ملازمین کو بھی منظم کیا۔ میں مشرقی پاکستان بھی گئی جہاں میں نے سبھی بائیں بازو کی پارٹیوں کی نمائندہ سنتوش کانفرنس میں شرکت کی تاکہ مزدور تحریک کی نئی حکمت عملی مرتب کی جاسکے۔ حکومتی اہلکاروں نے مجھے ڈھاکہ ائیرپورٹ سے باہر آنے کی اجازت نہ دی۔ مگر میرے استقبال کے لیے آنے والے لوگوں نے ائیر پورٹ کے دروازے توڑ کر مجھے اپنے ساتھ لیا اور کانفرنس تک لے گئے۔اس وقت یہ نعرہ لگا'' دروازے بھان دو' کنیز فاطمہ کو آن دو''۔

میں 67ء میں کراچی واپس آئی اور مزدور سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ 69ء میں یحییٰ حکومت نے ایک بار پھر مجھے کراچی سے شہر بدرکردیا۔ مجھے میری غیر موجودگی میں شپ یارڈ یونین کا صدر منتخب کیا گیا اور جب میں واپس آئی تو کراچی شپ یارڈ پر ساڑھے سات ہزار مزدوروں نے میرا استقبال کیا۔

کنیز فاطمہ کا مزدور تحریک میں موثرکردار تھا ۔ بلاشبہ وہ مزدوروں کی ایک معروف رہنما تھی اور ایوب حکومت کے خلاف مزاحمت میں اس کا بھرپور کردار تھا۔ لیکن نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کی مائوا سٹ زوال پذیر ی کی وجہ سے وہ مرکزی کردار ادا نہ کرسکی۔ وہ اپنی پارٹی کی مرکزی نائب صدر تھی اور ان کا ایوب خاں کی حکومت کے خلاف رویہ ہمدردانہ تھا۔ کیونکہ ایوب کے چینی سٹالنسٹ قیادت کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ مصنف سے اپنے انٹرویو کے دوران کنیز فاطمہ نے کہا کہ میں نے بھاشانی پر زور دیا کہ وہ چین جائے اور ایوب اور چینی حکومت کے درمیان معاہدہ ختم کرائے۔ جس پر پہلے تو مولانا راضی نہ ہوا۔ وہ کراچی میں تھا اور سخت بیمار تھا اور میں اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ چین جانے کے لیے اصرارکررہی تھی۔ بالاخر وہ راضی ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے اسلام آباد فون کیا اور مولانا کی چین جانے کی خوش خبری سنائی۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ (4)

مائوزے تنگ کے ساتھ اپنی ملاقات کے بعد مولانا بھاشانی ایوب کے خلاف موثر احتجاج نہیں کرسکا اور

مایوس ہو کر واپس اپنی کشتی میں سوارہوگیا' جس کے بعد وہ کبھی باہر نہ نکل سکا۔ جس کے نتیجہ میں بورژوا قوم پرست مجیب الرحمن اور اس کی پارٹی عوامی لیگ نے مشرقی بنگال میں تحریک پر کنٹرول حاصل کرلیا۔

پی۔آئی۔اے سے تعلق رکھنے والے معروف ٹریڈ یونین لیڈر جی۔ایم انجم نے مصنف

کو بتایا کہ سبھی یونینیں ایوب کے خلاف ہڑتال کرنے کے لیے تیار تھیں سوائے ان یونینوں کے جن کی قیادت مائواسٹ پارٹیاں کررہی تھیں۔ جس کی ایک مثال پی۔آئی۔اے کی طفیل عباس کی یونین ہے۔

فاطمہ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والی کسان کانفرنس کے حوالے سے بھی بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ کہ میں مولانا بھاشانی اور مرزا ابراہیم کے ساتھ ایک اونٹ گاڑی پر سوار ہو کر ٹوبہ ٹیک سنگھ جارہی تھی کہ راستے میں نوجوان لڑکوں کا ایک گروپ پیپلزپارٹی کے جھنڈے اٹھائے بھٹو بھاشانی بھائی بھائی کے نعرے لگاتا ہوا ملا' جس پر مولانا بھاشانی سخت غصے میں آگئے اور ان لڑکوں سے پیپلز پارٹی کے جھنڈے چھین کر پھینک دیے اور کہا کہ بھاشانی کبھی بھی ایک جاگیردار اورزمیندار کا بھائی نہیں بن سکتا۔ میں مزدور اور کسانوں کا بھائی بنوں گا۔(5) اس واقعہ سے مہم جوئی اور موقع پرستی کے درمیان تال میل صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ 70ء کے الیکشن میں کنیز فاطمہ نے نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا اور وہ تیسرے نمبر پر آئی۔ کراچی کے اس حلقے سے جماعت اسلامی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔ الیکشن ہارنے کے بعد بھاشانی نے مجھ سے پوچھا کیا کراچی میں گوریلا جنگ کرنا ممکن ہے ؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں۔۔یہاں تو نہیں۔ ہاں البتہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں میں ممکن ہے ... بھاشانی نے مجھے جواب دیا کہ اس کا مطلب ہے کہ یہاں انقلاب ممکن نہیں۔"(6)

الیاس خان (ملتان)

ملتان سے تعلق رکھنے والے انقلابی مارکسسٹ الیاس خان ان انقلابی دنوں میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ملتان بھی اس انقلاب کے دوران مظاہروں ، احتجاجوں اور جدوجہد کا مرکز تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تاریخی کانفرنس میں ملتان اور گردو نواح کے سینکڑوں کسانوں نے تاج لنگاہ، رب نواز چاون ، نور محمد چوہان ، پرویز آفتاب، ملک الطاف علی کھوکھراور محمو د نوازبابر کی قیادت میں شرکت کی تھی۔ ملتان میں مزدوروں نے کئی فیکٹریوں پر قبضے کرلیے تھے جن میں اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز، اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز شامل تھی۔ ان میں خان محمد نثار، عزیز نیازی ، پرویز آفتاب اور دیگر شامل تھے۔

شیخ رشید اپنی کتاب "جہد مسلسل " میں لکھتا ہے کہ ا س نے پنجاب کے مزدوروں اور کسانوں کی ایک میٹنگ بلائی اوراس میں صوبے بھر کی تمام فیکٹریوں اور جاگیروں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت بھٹو ڈھاکہ میں تھا مگر جب واپس آیا تو شیخ

رشید کے ساتھ اس فیصلے پر بہت ناراض ہوا اور قبضہ کرنے کے فیصلے کو مسترد کردیا۔ فیصل آباد میں مختار رانا اور اس کی بہن کی قیادت میں فیکٹریوں پر مزدوروں نے قبضے کیے تھے۔ ہالہ' سندھ کے شہر میں بھٹو نے پارٹی کی کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں آئندہ الیکشن میں حصہ لینے پر بحث ہوئی۔ بائیں بازو کے کچھ لیڈر انقلاب کرنے کا مطالبہ کررہے تھے اور ان کے مطابق پارٹی کو انتخاب کی بجائے انقلاب کی طرف قدم بڑھانا چاہیے تھا۔ انہوں نے برچھی یا پرچی کا نعرہ بلند کیا۔ مگر دائیں بازو کے لیڈروں کے تسلط کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ انقلاب نہیں بلکہ انتخاب کی جانب پیش قدمی کی جائے۔ پیپلز پارٹی کے کچھ بائیں بازو کے لیڈر بھٹو کی شخصیت سے انتہائی متاثر تھے انکی اس کمزوری کی وجہ سے اس بھیانک پالیسی پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا گیا۔

کرامت علی (کراچی)

کرامت علی ایک معروف سرگرم ٹریڈ یونینسٹ اور پاک بھارت عوام دوستی برائے امن کے علمبرداروں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ 69-68ء کی تحریک کا ایک اہم کردار بھی ہے۔ وہ پاکستان میں اس وقت کے چند ایک ٹراٹسکائیٹوں میں سے ایک تھا۔ مصنف کے ساتھ اپنے انٹرویو میں اس نے ان پرجوش دنوں کے حالات کے بارے میں بتایا:

"ایوب آمریت کے دس سالہ دور کے خلاف جنم لینے والی 69-1968ء کی انقلابی تحریک پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی عوامی تحریک تھی۔ یہ اس لحاظ سے منفرد تھی کہ اس کی ابتدا طالب علموں نے کی تھی اور بعد میں تقریبا چھ ماہ تک مزدوروں کی غیر معمولی شراکت کی حامل رہی۔ تحریک کا سماجی اور سیاسی مزاج مزدور طبقے کی امنگوں اور خواہشات کا شروع سے ہی واضح طور پر اظہار کررہا تھا کہ وہ کیا چاہ رہے تھے ؟ اس کے مطالبات اور نعرے کسی شک و شبہ کے بغیر مزدوروں ، کسانوں اور نچلے درمیانے طبقے کی اس ضرورت کی عکاسی کرتے تھے کہ وہ ایک باعزت زندگی' سماجی انصاف' برابری اور سب کے لیے آزادی کے طلب گار تھے اور اکثر و بیشتر ان مطالبات کا براہ راست اظہار وہ ملک میں سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ تحریک نے اپنا آغاز اکتوبر 68ء کے پہلے ہفتے میں کیا۔ جب نیشنل سٹوڈنٹ فیڈریشن (NSF) میں کراچی میں ہفتہ مطالبات منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ان دنوں NSF طلباء کی انتہائی موثر انقلابی تنظیم تھی۔ اس کے باوجود یہ دو دھڑوں معراج گروپ اور کاظمی گروپ میں تقسیم تھی۔ بنیادی طور پر یہ تقسیم چین اورروس کے باہمی تنازعے کی عکاسی کرتی تھی جس نے پوری دنیا میں کمیونسٹ تحریک میں پھوٹ ڈال دی تھی۔ تاشقند معاہدے کے فوری

بعد ہی پس منظر میں رہنے والی یہ پھوٹ کھل کر سامنے آگئی۔ یہ معاہدہ پاکستانی اور بھارتی حکمرانوں کے مابین ستمبر 65ء کی جنگ کے بعد تشکیل پایا تھا۔ اس معاہدہ کی دلالی روسی قیادت نے کی تھی۔ اس لیے پیکنگ کے حمایت یافتہ مائواسٹوں نے اس معاہدے کی مخالفت کرنا اپنانصب العین قرار دے دیا۔ معراج گروپ ، پیکنگ نواز اور کاظمی گروپ ماسکو نواز تھا۔اس دوران

صدر ایوب کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے تاشقند معاہدہ کی مخالفت کردی۔ لہذا اسے کابینہ سے نکال دیا گیا۔ جس پربھٹو نے اس معاہدے اور ایوب حکومت کے خلاف عوام میں جانے کا فیصلہ کیا اور اپنی نئی سیاسی پارٹی ”پاکستا ن پیپلز پارٹی “قائم کرلی جسکی معاونت انقلابی طلباء رہنمائوں مثلا معراج محمد خان اور ٹریڈیونینسٹوں سمیت کچھ بائیں بازو کے دانشوروں نے کی۔ بھٹو نے معاشی اصلاحات کا ایک انقلابی پروگرام تشکیل دیا اور اسے سوشلسٹ رنگ روپ دینے کے ساتھ ساتھ بھارت دشمن جذبات ابھارتے ہوئے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد خاص طورپر پیکنگ نواز طلباء اور مزدور رہنمائوں اور کارکنوں کواپنی طرف کھینچ لیا۔ تمام تر تقسیم اور اختلاف کے باوجود بایاں بازو پاکستان کی طلباء اور مزدور تنظیموں پر حاوی رہا۔ ایوب حکومت کے دس سالہ جشن ترقی کے مقابلے اور جواب میں NSF نے ہفتہ مطالبات منانے کا اعلان کیا۔ NSF معراج گروپ جو اب رشید گروپ کہلاتا ہے کے ایک ممبر کے طور پر میں جناح کالج ناظم آباد کراچی میں ایک طالب علم تھا۔ اس سال NSF کالج میں طلباء یونین کا الیکشن جیت چکی تھی۔NSF کے کچھ بہترین قائدین کا تعلق ہمارے کالج سے تھا۔ ان میں طلباء یونین کاصدر ضیاء اللہ، ممتاز میکھڑی ، جو اس وقت کا عظیم احتجاج کرنے والالیڈر تھا اور بصیر نوید شامل ہیں۔

ہفتہ مطالبات کے پہلے دن ہمیں‌پتہ چلا کہ ہمارے کالج کے بالقابل واقع بورڈ آف سیکنڈری انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے ہال میں ایوب خان کو اس کی تعلیم کے شعبہ میں خدمات پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔ کالج کے طلباء اس سیمینار میں چلے گئے اوروہاں جاکر نعرے بازی شروع کردی۔ اس کے بعد برنس روڈ پر جلوس نکالا گیا جہاں کئی کالجوں کی عمارتیں واقع ہیں، وہاں سے بڑی تعداد میں طالب علم ہمارے ساتھ شامل ہوگئے۔ اور اس طرح یہ جلوس ڈی۔ جے۔ کالج تک پہنچا جہاں ہزاروں طلباء اس میں شریک ہوئے۔ ہمارے لیے بھی اتنی بڑی تعداد حیران کن تھی۔ اس جلوس نے آنے والے دنوں کے امکانات کو بھی مزید واضح اور وسیع کردیا تھا۔ اگلے چھ دن تک شہر کے ہر کونے میں واقع سکولوں اور کالجوں سے طلباء جوق درجوق جلوس نکالنے لگے۔ جس سے شہر کے سبھی کالج اور سکول بند ہوتے چلے گئے۔ یہ ہفتہ مطالبات صرف کراچی شہر تک محدود نہیں رہااور صرف کراچی کو ہی اس نے متاثر نہیں کیا

بلکہ اس کی تاثیراور وسعت پورے مغربی پاکستان میں محسوس کی گئی۔ہفتہ مطالبات کے بعد پاکستان بھر میں طالب علموں اور مزدوروں کے درمیان ایک براہ راست تعلق اور رشتہ قائم ہوگیا جس نے پاکستان بھر میں ایوب آمریت کے خلاف ملک گیر تحریک کی بنیاد رکھ دی' جس کے نتیجے میں ایوب کو جانا پڑا اور اس کی جگہ 25 مارچ 1969ء کو جنرل یحییٰ خان کی شکل میں ایک نیا مارشل لاء مسلط کردیا گیا۔

اتنی بڑی تحریک اچانک واقع نہیں ہوئی تھی۔ یہ کراچی شہر میں خاص طور پر اور باقی ملک میں طالب علموں اور مزدوروں کے مستقل اور مسلسل احتجاج کے ایک لمبے عمل کا ہی لازمی اظہار تھا۔ ان واقعات میں ایک اہم عنصر ہندوستان میں جبل پور میں ہونے والے مسلم کش فسادات پر پاکستانی طلباء کی طرف سے کیا جانے والا احتجاج تھا۔

اسی مہم میں تین سالہ ڈگری کی تجویز کے خلاف احتجاج پر بارہ معروف طالب علم رہنمائوں کو کراچی سے نکال دیا گیا اور یہ سلسلہ ہر شہر میں ہوتا چلا گیا اورانہیں نکالا جاتا رہا یہاں تک کہ وہ طالب علم ملتان پہنچے 'جہاں ایمرسن کالج کے طلباء ان کے حق میں احتجاج پر نکل آئے۔ مرحوم علی مختار رضوی کی اس موقع پر کی جانے والی تقریر نے سبھی طلباء کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جس پر سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ وہ غیر معینہ مدت تک ہڑتال کریں گے۔اس دبائو کے نتیجے میں ملتان کی انتظامیہ کراچی کے ان طلباء قائدین کو ان کی خواہش اور مرضی کے مطابق ملتان میں قیام کرنے کی اجازت دینے پر تیار ہوگئی۔ میں اس وقت کالج میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا جب مجھے اس طلباء تحریک کا پتہ چلا تو میں نے 1963ء میں کراچی آنے والے پر طلبہ قیادت سے رابطے قائم کیے اور میں نے 1964ء میں NSF میں شمولیت اختیار کرلی۔ اسی طرح کی سرکش بغاوتیں انہی سالوں میں مزدوروں کی طرف سے بھی کی گئیں جس کے نتیجے میں ریاست کی پروردہ اینٹی کمیونسٹ ٹریڈ یونین کنفیڈریشن زوال پذیر ہوگئی۔ جس کے بعد مختلف آزاد یونینیں تشکیل پاتی گئیں' جن میں بڑی تعداد میں ترقی پسند مزدور لیڈروں نے فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے ساتھ بھی گہرے روابط قائم کرلیے۔ 1962ء میں مزدوروں کو متحرک کرنے کی یہ انفرادی کوششیں مارچ 1963ء میں ٹیکسٹائل مزدوروں کی بڑی جدوجہد کی شکل میں سامنے آگئیں۔ اس کے بعد 1967ء کی ریلوے مزدوروں کی ہڑتال 69-1968ء کے انقلاب کے لیے جذبہ محرکہ ثابت ہوئی۔ ان واقعات میں مزدوروں نے بڑے پیمانے کی ٹیکسٹائل ملوں اور دوسری فیکٹریوں پر قبضہ کرکے مالکان اور ریاست کو اپنے جائز مطالبات تسلیم کرانے پر مجبور کردیا تھا۔

1954ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگنے کے بعد کمیونسٹ گروپوں کو زیر زمین یا پھر قومی دھارے کی سیاسی پارٹی میں شامل ہوکر کام کرنا پڑ گیا۔ ان گروپوں پر روا

رکھے جانے والے بد ترین ریاستی جبر نے اس عمل کو اور بھی تیز کردیا۔ تاہم یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ اس کیفیت میں بھی وہ مزدوروں اور طلباء کی تحریک کو متحرک اور منظم کرتے رہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو تقسیم کرکے تحریکوں پر منفی اثرات مرتب کیے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری تحریکوں کو علمی قیادت مہیا کرنے میں ان کی نا اہلی تھی۔ ماسکو نواز اورپیکنگ نواز لیفٹ کے دونوں دھڑے اندھا دھند اور غلامانہ طور پر روس اور چین کی افسر شاہی کی نظریاتی اور سٹریٹجک ہدایات کی تقلید کررہے تھے۔ درحقیقت ان کے تناظر ان دونوں باہم برسر پیکار ”سوشلسٹ“ ریاستوں کی خارجہ پالیسیوں کے آئینہ دار تھے۔ بجائے اس کے یہ کہ سماج اور ریاست کے باشعور تجزیہ پر مبنی ہوتے ہر شعبے میں ہر سطح پر ان کے ایک دوسرے کے ساتھ رویے ، معاندانہ اور فرقہ پرستانہ تھے۔ بحث ، گفتگو اور تبادلہ خیال کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ دونوں پارٹیوں کے مابین ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرف مائواسٹ سرخ کتاب کو اپنے سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ تو دوسری طرف ترمیم پسند، کمیونسٹ پارٹی آف سوویت

یونین کے پبلشنگ ہائوس سے چھپنے والی ہر کتاب کو مقدس کتاب کی طرح اپنی بغل میں لیے پھرتے تھے۔ دونوں دھڑے اپنے کارکنوں اور کیڈروں کو دوسرے دھڑے کی کتاب کو ہاتھ لگانے سے بھی منع کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے پاکستانی حکومت اور ریاست کے ساتھ تعلقات کا دارومدار بھی ان کے ماسکو یا پیکنگ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر مبنی ہوتا تھا۔ 60ء کی دہائی کے آخر میں ایوب حکومت کے سر سے اس کے مغربی سرپرستوں نے اپنا دست شفقت اٹھا لیا تھا خاص طور پر امریکہ نے ۔ جس پرایوب چین کی طرف زیادہ اور کسی حد تک روس کی طرف راغب ہونا شروع ہوگیا۔ پاکستان کے بائیں بازو کی قیادت ایوب کی اس کیفیت کو سامراج دشمنی سمجھتے ہوئے اس کی طرف مائل ہونے لگی اور اس کی مخالفت سے گریز کرنے لگی۔ حالانکہ ایوب حکومت سرمایہ دارانہ استحصالی اور عوام دشمن کردار کی حامل حکومت تھی۔ چنانچہ 1968ء میں طلبا اور اس کے بعد مزدوروں کی تحریک بائیں بازو قیادت کی پرواہ کیے بغیر شروع ہوئی۔ اس کے باوجود کہ انہی کے کیڈر اس تحریک کی قیادت کررہے تھے۔ مثال کے طور پر NSF نے اپنا ہفتہ مطالبات اپنے سابق صدر معراج محمد خان کے کہنے پر شروع کیا تھا جو اس وقت پیپلز پارٹی میں شامل تھا جسے اس احتجاج کی ضرورت تھی۔ جبکہ NSF کی مرکزی قیادت مائواسٹ تھی ،طفیل عباس اور اس کے دیگر ساتھی اس طلباء تحریک اوراس کی کامیابی کے بارے میں مشکوک تھے۔ دوسری طرف مائوسٹوں نے تاشقند معاہدے کے خلاف بھٹو کی مخالفت کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی طرف جھکانا شروع کردیا۔ کیونکہ تاشقند معاہدہ روس کی وجہ سے ممکن ہواتھا۔ اس کے مد مقابل ماسکو نواز گروپوں

میں ایوب حکومت کے حق میں تاشقند معاہدے کے حوالے سے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب 1968ء کی تحریک شروع ہوئی تو دونوں طرف کی قیادتیں حیران رہ گئیں۔ ماسکو نواز کے دھڑے کے ایک اہم لیڈر انیس ہاشمی نے مجھے اپنے گھر بلایا اور کہا کہ ” ہم طالب علم ایوب حکومت کی مخالفت کرکے بے وقوفی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ اور سوشلسٹ کیمپ کے ساتھ ایوب کی قربت سے پریشان ہو کر امریکی سی۔آئی ۔اے ایوب خان کو اقتدار سے الگ کرنے پر تل گئی ہے“۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ ”عوام آخر کیوں ایوب حکومت کے خلاف بھڑکے ہوئے ہیں“۔ تو اس نے مجھے جواب دیا کہ” سامراج کی مخالفت ہر چیز سے مقدم ہونی چاہیے“۔ بائیں بازو کی قیادت واضح طور پر عوام کی نبض شناسی میں مکمل طورپر ناکام ہوچکی تھی اور وہ ان کی سچی امنگوں کو سمجھنے سے قاصر رہی جس کی بنیاد پر وہ تاریخ کے اس عظیم انقلاب کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے لاکھوں محروم انسانوں کی زندگیاں بدلنے کا یہ موقع گنوا بیٹھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاکر مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے پائوں جمانے کا موقع مل گیا۔ اس نے نہ صرف عوام کی وسیع حمایت حاصل کی بلکہ اپنی تنظیمی بنیادیں بھی مستحکم کرلیں۔ اس کا فائدہ اس نے انتہائی موثر اور مرتکز انداز میں 1970ء کے الیکشن میں اپنی پارٹی کی بہترین کارکردگی کے ذریعے حاصل ہونے والی کامیابی کی شکل میں حاصل کیا۔ دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے اس تحریک کی ابتداء کی تھی ،ہر سطح پر بدترین ناکامی سے دو چار ہوئے۔

جب جنرل یحییٰ خان نے 25مارچ 1969ء کو ایک اور مارشل لا مسلط کیا تو کسی طرف سے کوئی احتجاج سامنے نہیں آیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ تحریک کا مقصد صرف ایوب خان سے نجات حاصل کرنا تھا۔ مارچ 1969ء کے بعد کے عرصے میںNSF کو بڑھوتری دینے کی کوشش کی گئی۔ صرف کراچی میں کچھ دنوں کے اندر دس ہزار سے زائدممبر بنائے گئے۔ تاہم پارٹی قیادت نے پارٹی قیادت کے انتخاب کے لیے خفیہ بیلٹ سے ووٹنگ کرانے سے انکار کردیا۔ اور اصرار کیا کہ پارٹی کو ہر حالت میں اپنی قیادت کو منتخب کرنے کی بجائے نامزد کرنا چاہیے۔ خواہ وہ طلباء ہوں یا مزدور ۔ جب دسمبر 1970ء میں عام الیکشن کا شیڈول جاری کیا گیا تو پیکنگ نواز گروپ ایک بے ہودہ نعرے ” پرچی نہیں برچھی“ لگاتے ہوئے سامنے آیا اور ان الیکشن کے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کردیا۔ یہاں تک کہ معراج محمد خان نے بھی الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ اس قسم کے نظریاتی دیوالیہ پن کا یہ نتیجہ نکلا کہ تقریباً پچاس سوشلسٹ اور مزدور قائدین پارلیمنٹ میں پہنچنے سے روک دیئے گئے۔ بات کو سمیٹا جائے تو تمام بائیں بازو کی قیادت کی ان ناکامیوں اور غلطیوں کے باجود، جن سے بچا جاسکتا تھا،یہ تحریک ہزاروں اور لاکھوں طالب علموں اور مزدوروں کے لیے نجات حاصل کرنے کی کوشش کا ایک عظیم

تجربہ ثابت ہوئی۔ صرف ان کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر اس عام انسان کے لیے جس نے اس تحریک میں حصہ لیا یا اس کو قریب سے بھی دیکھا“۔

1968-69ء کا انقلاب نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر کے لیے ایک مینارہ نور‘ایک مشعل راہ تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ جنوبی ایشیاء کے کسی ایک ملک میں تقسیم کے بعد عوام اتنی بڑی انقلابی شدت کے ساتھ باہر آئے ہوں۔ یہ پاکستان میں کئی مہینوں تک دوہرے اقتدار کی ایک کلاسیکل صورت حال تھی۔ طاقت ریاست اور حکمران طبقات کے ہاتھوں سے پھسل کر گلیوں ، فیکٹریوں ، قصبوں، دیہاتوں میں عوام کے ہاتھ میں پوری شدت اور توانائی کے ساتھ منتقل ہوچکی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انقلاب ایک سوشلسٹ فتح سے ہمکنار نہیں ہوسکا اور ایک ظالمانہ استحصالی نظام کا خاتمہ نہیں کرسکا البتہ اس نے عوام اور سماج کی نفسیات کو بدل کر رکھ دیا۔ سرمایہ دارانہ حکمرانی کے سبھی طریقے‘ اس کی اخلاقیات‘ اس کے دھوکے‘ اس کے فریب‘ اس کے دانشور ‘اس کے وظیفہ خوار ملاں، اس کا تنخواہ دار میڈیا، اور سبھی ڈھانچے عوام کی بغاوت نے اکھاڑ کر پھینک دئیے تھے۔ تاریخ کے صفحات میں جب بھی کبھی بڑے اور عظیم واقعات کا ذکر ہوگا تو پاکستان کے محروم عوام کا یہ انقلاب ایک درخشاں باب کی حیثیت میں شامل ہوگا۔ پاکستان کی آنے والی نسل کے لیے اس نے ایک مثال قائم کردی کہ اس کے بڑوں نے مروجہ ظالمانہ نظام کو چیلنج کرنے کی جرأت کردکھائی تھی۔ اور اس انقلاب کے ذریعے انہوں نے ریاست اور حکمران طبقات کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا تھا۔ یہ اسی ملک ، اسی دھرتی پر ہواتھا اور یہ ایک بار پھردہرایا جائے گا مگر ایک بلند معیار پر دہرایا جائے گا اور یہ پہلے کی طرح نہ تو نامکمل رہے گا نہ ہی ادھورا۔

نوٹس

1. کارل مارکس، لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومئیر، پیکنگ1978ء ، صفحہ 9-10
2. ایوب خان، ایوب خان کی ڈائری1966-72ء ،ہفتہ2دسمبر1967ء ، (آکسفورڈ)، صفحہ181
3. مصنف سے انٹرویو، جون 2008ء
4. مصنف سے انٹرویو، جولائی 2008ء
5. ایضاً
6. ایضاً

جنگ،جبراوراصلاح پسندی
ایک زائل ہوئے انقلاب کے اسباق

”سرمایہ دارانہ نظام میں محض اصلاحات اب کوئی قابل عمل حل نہیں۔ 1969ء کے عوامی ابھار نے سرمایہ دارانہ ڈھانچے کومسترد کر دیا تھا۔ ایک ایسا اصلاح شدہ نظام جس کی خواہش عوام اورسیاستدانوں کی طرف سے کی جاری ہے،جس میں سبھی مزدوروں کو ایک مناسب بنیادی اجرت دی جائے، منافعوں میں مزدوروں کی شراکت ہو،سرمایہ داروں کی سماجی ذمہ داری ہو،وغیرہ وغیرہ۔یہ سب سویڈن یا پھر یوگوسلاویہ میں تو ہوسکتاہے مگر پاکستان جیسے ملک میں یہ عمل ارتقائی مراحل کے ذریعے ممکن نہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق(98-1934ء)(1)

25مارچ1969ءکو پاکستان کی تاریخ کے سب سے مضبوط حکمران ایوب خان کو اقتدار چھوڑنے پر مجبورہوجاناپڑا۔اپنی آخری تقریر میں اس نے کہا”یہ آخری بار ہے کہ میں صدرپاکستان کی حیثیت سے آپ لوگوں سے خطاب کررہاہوں۔۔۔مملکت کے سبھی انتظامی ادارے مفلوج کر کے رکھ دیے گئے ہیں۔جا بجاعوام اپنی مرضی سے گھیراؤکررہے ہیں،اور زورزبردستی سے اپنے مطالبات منوا رہے ہیں۔ مملکت کی خدمت سرانجام دینے پرمامور لوگ ان عوام کے خلاف کچھ کرنے سے ڈر گئے ہیں۔۔۔میری خواہش ہے کہ سیاسی اقتدار کی منتقلی آئینی تقاضوں کے مطابق بطور احسن سرانجام پائے۔جس قسم کے حالات ملک میں پیداہو چکے ہیں ان میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانا ممکن نہیں۔کچھ ارکان تو ڈر کے مارے اجلاس میں شرکت کیلئے آنے سے ہی انکاری ہیں۔۔۔مجھے دکھ سے یہ کہنا پڑرہا ہے کہ صورتحال اب حکومت کے کنٹرول سے بے قابوہو چکی ہے۔حکومت کے سبھی ادارے انتشار‘ خلفشار اور خوفزدگی کی زد میں آچکے ہیں۔اور ملک کے سبھی مسئلے اب سڑکوں پر‘گلیوں‘ محلوں میں حل ہونا شروع ہو چکے ہیں“۔(2)

یحییٰ خان کی حکومت

ایوب کی آخری تقریر اس بے پناہ دباؤ کی واضح عکاسی کرتی ہے جو نیچے سے انقلاب نے ریاست اور حکمران اشرافیہ پر ڈالنا شروع کردیاتھا۔امریکی سامراج،فوج کے اعلیٰ افسران اور حکمران طبقات کی طرف سے ایو ب خان کو اقتدار سے الگ ہوجانے کی ہدایت دینے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی رخصتی کو انقلابی جوش و جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے کام لاناچاہ رہے تھے جوسارے سماج میں پھیل چکاتھا۔اگرچہ حزب مخالف کے بورژوا سیاستدان صرف ایوب خان کی ذات سے نفرت کوہی تحریک کا محورقراردینے کا واویلاکرنے میں مصروف تھے مگراس کی رخصتی بھی مزدوروں‘کسانوں اور نوجوانوں کی اس انقلابی تحریک کا جوش و جذبہ ماندنہیں کر سکی۔تقریباًسبھی پارٹیوں کی قیادت اس صورتحال میں بھاگم بھاگ جنرل یحییٰ کی سربراہی میں قائم ہونے والی نئی فوجی حکومت کے پاس پہنچ گئی تاکہ اس کے ساتھ مذاکرات کرکے مصالحت کا کوئی راستہ نکالاجاسکے۔ان مذاکرات میں جو موضوعات زیربحث لائے جا رہے تھے ان میں پارلیمانی جمہوریت،آئین،مغربی پاکستان میں وفاقی یونٹوں کی تشکیل،قومیتوں کو برابری کے حقوق اور اسی نوعیت کے قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے اورمطالبات شامل تھے۔مگر سڑکوں پر نکلے ہوئے عوام نہ تو رعایتوں سے نہ ہی اصلاحات سے مطمئن ہونے والے تھے وہ تو اپنی فتح کے احساس سے سرشارتھے اور اسے مکمل کرنا اوردیکھنا چاہتے تھے۔وہ اپنی جنگ حتمی فیصلے تک لڑنے کے لیے تیار تھے۔تحریک کی شدت اور حدت نے

جو اچانک ہی سماج میں سے نکل آئی تھی ،اسلام آباد سے لندن اور واشنگٹن تک اقتدار کے ایوانوں کو لرزا کے رکھ دیاتھا اوروہاں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں۔ حکمران طبقات اور ریاستی اہلکاروں کی حالت ایسے ہوگئی تھی جیسے ان کو کسی جنگ میں شکست فاش ہو گئی ہو۔ خوف کی شدت سے وہ دہل کے رہ گئے تھے۔ان کی بدحواسی دیدنی تھی اور جب ایوب کے جانے کے بعد تحریک میں قدرے وقفہ محسوس کیا گیا توحکمران طبقات اچانک اصلاحات پر اتر آئے۔ان میں سے ایک لیبرپالیسی تھی جو کم از کم کاغذوں کی حد تک پاکستان کی تاریخ کی سب سے مزدور پرور دستاویز قراردی جاسکتی ہے۔شومیء قسمت یہ لیبرپالیسی جنرل یحییٰ کی آمریت کے دوران متعار ف ہوئی۔

جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں،ایوب حکومت کے ”اصلاحات کے دس سالہ دور“کے دوران ہونے والی معیشت کی بلند شرح ترقی سماج کی ترقی اور فلاح وبہبود کے کسی کام نہیں آسکی ،جیسا کہ اس شرح ترقی نے صنعتی انقلابات کے دوران جدید ملکوں میں کر دکھایا تھا جب سرمایہ دارنہ نظام اپنے عروج پر تھا۔تاہم اس کے برعکس اس معاشی ترقی نے عوام اور مزدوروں کا معیار زندگی گرانا شروع کر دیاتھا جن کے لئے کینیشئن طرز کی معاشی ترقی وارتقا عذاب بن چکا تھا۔ 1969ء کا مارشل لاء اس سیاسی اور معاشی بحران کا جواب تھا جس کی جڑیں ان سماجی معاشی مسائل میں گہری پیوست تھیں جنہوں نے خودسرمایہ دارانہ نظام کوہی خطرے میں ڈال دیاتھا۔اس مارشل لاء کی مذمت یا مزاحمت کی توفیق ایک بھی بڑے لیڈر کو نہیں ہو سکی۔بلکہ یوں کہاجائے کہ ان سب نے اسے خوش آمدیدکہا وہ بھی ایک ایسے وقت اور کیفیت میں جب سیاسی صورتحال ان سب کے کنٹرول میں نہیں رہی تھی اور عوام ان کے قابو نہیں آرہے تھے۔تحریک اگرچہ ”بے راہبر“تھی مگر یہی تحریک ہی تھی جو پاکستان کی سیاست کو چلا رہی تھی۔اس بحران زدہ کیفیت کو سمجھتے ہوئے یحییٰ خان نے مصالحانہ نوعیت کے کچھ اعلانات کیے جو ”سماجی برابری“سے متعلق تھے۔لیکن یہ اسی قسم کے خیالات ہی تھے جو اس کے پیشرو اس قسم کے موقع پر کرتے چلے آرہے تھے۔

”جو حالات ان دنوں ہمیں درپیش ہیں،ان میں منصوبہ بند (سوشلسٹ)معاشی ترقی کے سوا ہمارے پاس کوئی متبادل نہیں ۔مگر منصوبہ بند ترقی کوسماجی انصاف کے تقاضوں سے الگ رہ کر ممکن نہیں بنایا جا سکتا۔ سماج کی مختلف پرتوں کے درمیان جو وسیع خلیج موجود ہے اور ان کے مابین جو عدم توازن حائل ہے ،ان کی وجہ سے سماجی بے چینی اور تنازعات میں شدید اضافہ ہوتا چلاجارہاہے ،اس کالازمی طورپر خاتمہ کیاجانا ضروری ہے۔منصوبہ بند معاشی ترقی کا ہدف سارے ملک کے عمومی معیار زندگی میں اضافہ کرنا اور بہتری لاناہے ۔نہ کہ ایک ایسا مراعات یافتہ طبقہ پیداکرنا

جودوسروں کیلئے تباہی اور ذلت کا باعث بن جائے "۔(3)

مارشل لاء کے نفاذنے محنت کشوں کی تحریک کو کمزور کرنے کی بجائے اس کے جو ش و جذبے کو اور زیادہ ولولے سے لبریزکردیا۔اس مارشل لاء کے ایک ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹراور تعلیم،صحت،لیبر اور سوشل ویلفیئرکی وزارتوں پر براجمان وزیرائیرمارشل نورخان نے ان حالات میں اپنے ذمے ایک ہی کام لگالیا کہ وہ تحریک کی قیادت کے ساتھ رابطہ کرے اور اس کا اعتماد جیتنے کی کوشش کرے۔اس کوشش میں نورخان نے کچھ بیانات جاری کیے جن میں محنت کشوں کے سماجی معاشی حالات کی جھلک نظر آتی تھی کہ انہیں علاج تک کی بھی سہولت میسر نہیں تھی۔

کراچی میں ایک سہ فریقی کانفرنس بلائی گئی جس میں مزدور قائدین کو دعوت دی گئی کہ وہ مالکان ، حکومتی نمائندوں اورمشیروں کے ساتھ مل بیٹھ کرایک نئی اور زیادہ حقیقی لیبرپالیسی کے خطوط طے کر سکیں۔"اس بحث نے ایک موقع فراہم کیا جہاں مزدور راہنما طاقت کے ایوانوں میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بات کرکے اپنے دکھ درد سے آگاہ کرسکیں۔اس سے وہ اپنا مدعا' اپناکرب ان کے سامنے ظاہر کر سکے،یہی نہیں بلکہ وہ مالکان اورحکومتی نمائندوں کے ساتھ مل کر اہمیت اوربرابری کے احساس سے بھی روشناس ہوئے"۔(4)

ان میں سے کئی ایک کیلئے یہ ایک نیا تجربہ تھا اور پہلی بار ایسا ہورہاتھا کہ ان کو سنا جارہاتھا ،توجہ دی جارہی تھی،یہ ایوب دورمیں خواب وخیال ہی تھا۔نورخان کی طرف سے ہونے والی سہ فریقی کانفرنس کی یہ کاوش اور اس میں بے شمار مزدور نمائندوں کو بلانے کے عمل نے ٹریڈیونین اورمزدور قائدین کی نفسیات پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب کیے۔ایوب خان کے خلاف تحریک میں سرگرم کئی لوگوں کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ ایوب کی رخصتی سے حالات میں سنجیدہ تبدیلی سامنے آئے گی اور ایک نیا عہد طلوع ہوگا۔جس کے نتیجے میں "غیرسیاسی" مزدور قائدین کو حکومت کی حکمت عملی سے شدید توقعات وابستہ ہو گئیں۔دوسری طرف حکومت کی طرف سے مالکان پر شدید تنقیدکی گئی اوردباؤ ڈالاگیا کہ وہ مزدوروں کی فلاح وبہبودکیلئے کوئی عملی اقدام کریں۔ارسطو نے کہاتھا کہ ایکشن ہی ڈرامے کا بنیادی اصول ہواکرتاہے۔پاکستان میں تاریخ کے سٹیج پر انقلابی ڈرامہ جاری تھا اوراس سے خوفزدہ ریاست اور بورژوازی کے الفاظ ان کی بوکھلاہٹ کو ان کے لفظوں سے عیاں اوربیاں کرتے جارہے تھے۔

"صنعتکاروں کی یہ پہلی نسل ہر حوالے سے اس شراکت کی اہمیت اور قدرو قیمت کا احساس وادراک کرنے سے قاصر تھی جو ایک پرجوش اورتروتازہ پرولتاریہ نے ان کی پیداواراور منافع کیلئے کی تھی۔ انہوں نے ٹریڈیونین کو سازشوں اور بدعنوانیوں کے آلے کے طورپر استعمال کیا ، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کو باہمی لین دین کے ادارے کے طورپر کام

میں لایاجاتا،تنازعات سے بچاجاتا اوراپنی پیداواری صلاحیت کو بھی بڑھایاجاتا“ (5)

”مزدوروں کے ساتھ خوشگوارہم آہنگ تعلقات“کو یقینی بنانے کیلئے حکومت نے ”اجتماعی سوداکاری ایجنٹ “(CBA)کا خیال تجویزکیا۔اس کا مقصد ایک ہی ادارے میں ٹریڈیونینوں کے معاملے میں دشمنی اور اختلاف کے مسئلے کو حل کرنا اورپاکٹ یونینوں کاخاتمہ کرنا قرار دیاگیا ۔الیکشن میں جو بھی یونین سی بی اے کا سٹیٹس حاصل کرے گی اسے حکومت کے لیبرڈیپارٹمنٹ اور اپنے متعلقہ ادارے کی انتظامیہ کا حصہ سمجھا جائے گا ۔یہ سمجھنا انتہائی آسان ہے کہ ایک بار اجتماعی سودا کار ایجنٹ بن جانے والی یونین کی قیادت ہر وہ اقدام کرے گی جس سے وہ ہار جانے والی یونین یا یونینوں کو دبانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے۔جنہیں اجتماعی سوداکاری ایجنٹ بننے کیلئے اگلے الیکشن کے انتظار کی تکلیف سے گزرناپڑے گا۔ایسی ہاری ہوئی یونین ہر حوالے سے کسی بھی بڑی سرگرمی میں حصہ لینے یا کچھ کر دکھانے سے محروم رہے گی۔تاہم یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اس وقت کی مزدورقیادت نے اس قانون کی عملی پیچیدگیوں پر غور نہیں کیا تھا۔

کراچی کی دوسری بڑی آدم جی ٹیکسٹائل ملز میں دو بڑی یونینیں تھیں جو آپس میں مدمقابل ہواکرتی تھیں۔وہاں صنعتی تعلقات کے آرڈیننس کے مطابق الیکشن کرایاگیا جو سندھ لیبر ڈائریکٹوریٹ کی زیرنگرانی ملزکے احاطے میں منعقد ہوا۔پہلے سے سوداکاری ایجنٹ چلی آنے والی یونین اس الیکشن میں جیت کراگلے دو سالوں کیلئے باقاعدہ سی بی اے بن گئی۔مدمقابل یونین نے لیبر ڈیپارٹمنٹ اور مل انتظامیہ پر الزام عائدکیاکہ انہوں نے اپنی مرضی کی یونین کو جتوایاہے۔اس یونین نے جو دلائل دیے ان کے مطابق:۔

1۔ اسے ملز کی حدود میں داخل ہوکر اپنی حمایت کیلئے کمپئین بھی نہیں کرنے دی گئی۔

2 ۔من پسند یونین کو ہر قسم کی مراعات اور سہولتیں فراہم کی گئیں اور مزدوروں کو مفت کھانا دیا گیا۔

3 ۔پولیس نے ان کی یونین کے عہدیداروں کو ملز کے گیٹ پر قائم یونین آفس میں بھی نہیں بیٹھنے دیا۔ہمارے بینرز پھاڑدیے گئے اور ہمارے کارکنوں کی شرٹوں پر لگے سٹکربھی اتارلیے گئے۔

4۔ملز انتظامیہ نے اخبار والوں کو بھی ملز کی حدودمیں داخل نہیں ہونے دیا تاکہ وہ الیکشن کی کوریج کرسکیں۔

چنانچہ حکومت اور انتظامیہ کیلئے یہ قدرے آسان ہوجاتاہے کہ وہ اپنی مرضی کی یونین کو الیکشن میں جتواکر اسے سی بی اے قراردلوا سکیں اور پھر اس کی اس کامیابی

کو جتنے لمبے عرصے تک چاہیں قائم ودائم بھی رکھ سکیں۔یوں غیرقانونی ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کو کنٹرول کرنے کا حکومتی ہدف جو کسی بھی حکومت کا سب سے اہم اصول ہواکرتاہے اس طریقے سے حاصل کرلیاگیا۔قانونی سمجھا جانے والا ہڑتال یا تالہ بندی کا طریق کار پیچیدہ اور طویل بنادیاگیا اور اس میں حکومت کو مختلف مرحلوں پرممکنہ مذاکرات کے مواقع فراہم کیے گئے۔اگر کسی حیلے بہانے سے ایک قانونی ہڑتال یا تالہ بندی کی کوئی شکل بن بھی جائے تو حکومت نے اسے قابو میں کرنے کیلئے ایک شق اس آرڈیننس میں شامل کی ہے جس کی رو سے اگر یہ عمل لوگوں کیلئے مسائل پیداکررہاہے یا قومی مفاد کے خلاف کوئی تعصب پیداکرنے کا باعث ہے تو حکومت اسے کسی بھی طریقے سے روك دے گی۔"اگر کوئی ہڑتال یا تالہ بندی وفاقی حکومت ،نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمیشنز ،صوبائی حکومت یا پھر کسی لیبر کورٹ یا ٹریبونل کے احکامات کے باوجود بھی جاری رہتی ہے تو یہ غیرقانونی قراردے دی جائے گی"۔(6)

ظفر شہید یحییٰ حکومت کی اس اصلاح پسندانہ سازش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتاہے"نورخان کے تعاون سے جاری کی جانے والی اس لیبر پالیسی نے کچھ جراتمندانہ اور آزاد خیال حصوں کے اہم لوگوں کو گمراہ کر دیا اور وہ یقین کر بیٹھے کہ لیبر قوانین کی تاریخ میں یہ سب سے ترقی پسند انہ پالیسی ہے جو آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی گئی۔یہ ایک ایسی سوچی سمجھی چال تھی جس کا بظاہر مقصدتو مزدورں کے مفادات کا تحفظ تھا مگر اپنے عملی اثرات میں یہ ان کے مفادات کی قاتل تھی،دوئم اس نے مزدورتحریک کے اندر ان موقع پرست اور مفادپرستوں کو تقویت بخشی جنھوں نے عام مزدوروں میں موجود جوش وجذبے کو مضمحل کر دیا"۔(7)

"محنت کش جس تحریک میں برسرپیکار تھے، اسے کسی قسم کے قوانین اور قواعد وضوابط کے ذریعے کنٹرول نہیں کیا جاسکتاتھا۔اس عرصے میں صنعت کی صورتحال یہ تھی کہ آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن (اپٹما)کے صدر نے حکومت کو شکایت کی کہ ٹیکسٹائل صنعت 1969ء کے آغازسے ہی مزدوروں کے گھیراؤ کی زدمیں ہے اور محصور ہے"۔(8)

درحقیقت یحییٰ حکومت کے آغاز سے ہی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی اور اس میں اضافہ کرتے ہوئے اس کا اطلاق صنعتی سرگرمیوں پر بھی کردیاگیاتھا۔" 1969ء میں مارشل لاء کے نفاذکے خلاف وسیع پیمانے پرکراچی میں فسادات پھوٹ پڑے، 45000مزدوروں کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا تھا"(9) "ملٹری کورٹ نے مزدور راہنمائوں اور مزدوروں سمیت طالبعلموں اورسیاسی کارکنوں کو جیل بھجوا دیا۔ حکومت کی جاری کردہ لیبرپالیسی کے محض کم مدتی مقاصد تھے،ان کا اصولی مقصد کام کو روکے جانے کو کم سے کم اورشہروں کی فضااورماحول کوپر سکون رکھناتھا"۔معاملات کی

اس نوعیت سے پتہ چلتاہے کہ بنیادی طورپرحکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ یحییٰ حکومت نہ تو معاشی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی اہل تھی نہ ہی آرزومند۔ اس کمزور حکومت کے لیے خوشگواراور قابل قبول صنعتی تعلقات کا فروغ ایک لازمی بنیادی تقاضاتھا یہی اس کی لیبرپالیسی کا مطمع نظربھی تھا۔ بہرصورت حکومت پہلے ہی الیکشن کمپین کی وجہ سے خاصے دبائو میں تھی جوجنوری سے دسمبر **1970**ء تک چلتی رہی اورپھر ایک سیاسی بحران جو بھارت کے ساتھ جنگ اور پھر مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کی صورت میں ظاہرہوا۔

پاکستان پیپلز پارٹی اورجماعت اسلامی

25مارچ **1969**ء کے مارشل لاء نے پاکستان کو **1968/69**ء کے انقلابی زلزلے کے جھٹکوں سے محض ایک سرسری سا وقفہ فراہم کیا۔ایسے کئی شواہد اور اشارے موجود ہیں جن سے پتہ چلتاہے کہ نومبر کی تحریک میں اپنی طاقت اور اعتماد گنوا چکنے کے بعد بڑے صنعتی اور کاروباری اداروں کی طرف سے مذہبی انتہا پسندی کی نشوونما اور فروغ کا رستہ سوچااوراختیار کیاگیا تاکہ الیکشن کی تیاری کی جاسکے اور عوام کے انقلابی تصورات کو بھی گمراہ کردیاجائے۔بڑے شہروں میں جماعت اسلامی نے جسے سعودی عرب اور مقامی صنعتی مالکان کے ذرائع کی طرف سے بھاری سرمایہ فراہم کیاجارہاتھا، اس نے انقلابی تحریک کی شکست کے بعد پیداہونے والی رد انقلابی رجعتیت کی سپہ سالاری سنبھال لی۔"اگست **1969**ء کی ابتدا میں‌ہی پیپلزپارٹی اورجماعت اسلامی کے مابین چھوٹے شہروں میں جھگڑے شروع ہوگئے جبکہ ستمبر میں کراچی' لاہور اور لائل پور(فیصل آباد) میں پارٹی اورجماعت کے درمیان جھڑپیں اورجھگڑے شدت اختیارکر گئے"۔ **(10)**

جماعت اسلامی نے پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔اس قسم کی باتوں‌نے پاکستان میں ان دنوں امریکی سفیر جوزف فارلینڈکو خاصامتوجہ کیا۔یہی جوزف فارلینڈ انڈونیشیا میں امریکہ کا سفیر رہ چکاتھا جب سہارتوکی طرف سے سوئیکارنوحکومت کا تختہ الٹ دیا گیاتھا اور جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈونیشیا کو خونریز قتل عام کی بھینٹ چڑھایاگیاتھا۔ستمبر **1965**ء میں سوئیکارنو کے خلاف ایک بغاوت منظم کی گئی تھی جوکہ سامراج کی مخالفت میں بیان پر بیان دیے جارہاتھا۔سی آئی اے (**CIA**) نے سراکت الاسلام سمیت کئی دیگر اسلامی بنیادپرست تنظیموں کی (جن میں سے کچھ پاکستان میں سرگرم جماعت اسلامی کی شریک کار تھیں)بھرپور معاونت سے انڈونیشیا کی فوج کو استعمال کرتے ہوئے ایک قتل عام کو منظم کیا جس

میں کمیونسٹوں کو ان کے اہل خانہ سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔محتاط اندازوں کے مطابق امریکی احکام اور امداد سے ہونے والے اس قتل عام کے اس خونی ردانقلاب کے دوران15لاکھ کمیونسٹوں کو ذبح کردیا گیا۔”فارلینڈ،پاکستان میں،امریکہ مخالف منافرت کی علامت بن کر رہ گیااور بائیں بازو نے تو اسے آڑے ہاتھوں لیاہواتھا“۔(11) فارلینڈ ملک میں جہاں بھی جاتاوہاں اسے عوامی مظاہروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ،ایساہی ایک واقعہ 5 مارچ 1970ء کوہوا”نشتر میڈیکل کالج ملتان میں امریکی سفیرفارلینڈکوطا لبعلموں نے گھیرلیااور فلسطین زندہ باد،ویت نام زندہ باد ،چین زندہ باداور امریکی سامراج مردہ بادکے نعرے لگاتے رہے“۔(12)

”لاہور شہر کی دیواروں پر ”انجمن سرفروشان اسلام “کی جانب سے پوسٹرزآویزاں کر دیے گئے جن میں سبھی شاعروں ‘ادیبوں اور دیگر دانشوروں کو دھمکی دی گئی کہ وہ ہوش کے ناخن لیں ورنہ ان کے قلم توڑ دیے جائیں گے اور ان کی زبانوں کو کھینچ لیاجائے گا اوران کے سروں کو کچل کر رکھ دیاجائے گا۔پیپلزپارٹی اور نیپ(NAP) بھاشانی گروپ نے بھی جماعت کی پالتو ایک تنظیم کی نشاندہی کی جو گلیوں محلوں میں حملے کرتے تھے ،اور دعویٰ کیا کہ جماعت اسلامی اپنے ’آقائوں (امریکی سامراج، جاگیرداروں اور اجارہ دار سرمایہ داروں)کے مفادات‘کے تحفظ کیلئے نازی دہشت گردی جیسے طریق کار اپنا رہی ہے“۔(13)

جماعت اسلامی کی پی پی پی مخالف مہم اس وقت شدید ہو گئی جب بھٹوپر صادق آباد ضلع رحیم یارخان میں مشتعل ملائوں اور نوجوانوں نے پتھروں اوراینٹوں سے حملہ کردیا۔اس کے بعد سے پارٹی کے قائدین نے خودحفاظتی اقدامات کا فیصلہ کرلیا۔اس سلسلے میں پیپلز گارڈ تشکیل دے دی گئی جس کاانچارج میجر جنرل ریٹائرڈ اکبرخان کوبنایاگیا۔(14)

مئی 1969ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے ترقی پسند اساتذہ کے نکال دیے جانے پر بائیں اور دائیں بازو کی سیاست کی بحث ایک بارپھر زورپکڑ گئی۔یہ وہ کالج تھا جسے انجمن حمایت اسلام کے تحت چلایا جارہاتھا۔اس انجمن کو آج کل کچھ قدامت پسندتاجروں کے حلقے مل کر چلارہے ہیں۔

جنوری 1970ء کے شروع میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کارپوریشن PIACمیں جماعت اسلامی کی نئی قائم شدہ ایمپلائزیونین کو دھاندلی سے جتوادیاگیا اورائیرویز ایمپلائز یونین کو ہروادیاگیا جس کی قیادت طفیل عباس کر رہاتھا جو نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن(NSF) کے قائد معراج محمد خان کا قریبی ساتھی تھا۔پی آئی اے (PIA)میں جماعت کی یہ کامیابی ایک انتہائی قابل ذکرموڑتھا اور جماعت اسلامی کی طرف سے مزدورتحریک کے اندرگھسنے کے منصوبے کی طرف اہم پیش رفت تھی جس کے تحت

انتہائی منظم اور مالیاتی طورپر مستحکم یونینیں تشکیل دی گئیں۔

پیپلز پارٹی کو مزدورتحریک کے اند رزیادہ بہتر اور موثر مداخلت کا موقع ملا کیونکہ ا س نے روایتی بنی بنائی یونینوں کو کم ہی توجہ دی اور نئے صنعتی مراکز،قدیم صنعتوں اور ان جگہوں کو اپنی توجہ کا مرکزبنایا جو ابھی یونین سازی سے محروم تھے۔

نومبر1968ء کی تحریک نے صنعتی مزدوروں کو سیاسی طورپر انتہائی باشعور اور متحرك کر دیاتھا۔ان کے جوش وجذبے کا اظہار ایوب حکومت کے آخری دنوں میں کارخانوں پر ان کے قبضوں کے سلسلے سے ہوتاہے۔یحییٰ مارشل لاء کے بعد بھی ان اداروں کے اندر فضا انتہائی کشیدہ رہی کیونکہ تحریک کے بعد کے معاشی بحران اور گرفتاریوں نے انتظامیہ کو موقع فراہم کردیا کہ وہ سبھی سرگرم مزدوروں کو ملازمت سے باہر نکال دے۔ لاہور کوٹ لکھپت کے مضافات میں واقع ایک بڑے کارخانے پیکیجز لمیٹڈ میں بھی ایسا ہی ہواجس میں2500مزدورکام کرتے تھے۔

یکم نومبر 1969ء کوہونے والی ہڑتال میں کئی اہم معاملات کو ایشوبنایاگیاتھا ان میں نظر بندیاں، یونین آفس ہولڈروں کو نشانہ بنایاجانا،عارضی لیبر کا زیادہ عرصے تک استعمال،ورك چارج سسٹم اور کم سے کم اجرتوں کے سکیل پر عملدرآمد کا نہ کیا جانا شامل تھا۔ 4نومبر کو ہڑتال پر غنڈوں نے حملہ کردیا جبکہ 7نومبر کونئے انڈسٹریل ریلیشنز آرڈیننس کا اجراکردیاگیا۔اس میں جہاں مزدوروں کو ہڑتال کا حق دیاگیا وہیں مالکان کو بھی قانونی طورپر اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی فیکٹری کی تالہ بندی کر سکتے ہیں۔

پیکیجز فیکٹری کی ہڑتال نے تو جیسے کوٹ لکھپت کی بڑی فیکٹریوں میں بھی ہڑتالوں کی وبا پھیلا دی۔اور تین ہفتوں کے اس ہڑتالی عمل نے راوی کنارے سے ادھر شاہدرہ میں بیکوفیکٹری کو بھی زد میں لے لیا،وہاں سے یہ کالاشاہ کاکومیں نئے کیمیکل کمپلیکس ،اورپھر یہ لہر لائل پوراور ملتان کے صنعتی علاقوں تک پہنچ گئی۔اوریہاں تک ہی نہیں یہ کراچی میں لانڈھی' کورنگی اور سائیٹ کے بڑے صنعتی مراکز تک پہنچ گئی۔ہڑتال کی اس انتہائی بڑی لہر نے صرف صنعتی مزدوروں کو ہی نہیں بلکہ چھوٹے سرکاری ملازمین کو بھی متاثرکیا۔بعدمیں تو یہ اتنی پھیل گئی کہ اس کی رپورٹ مرتب کرنا بھی محال ہوگیا۔اس دوران میں ایک قابل ذکر واقعہ ملٹری اکاونٹس آفس میں ہونے والی کام چھوڑ ہڑتال تھی۔نومبر دسمبر1969ء کی اس ہڑتال کا ایک اہم اور دلچسپ پہلو صنعتی مزدوروں کے ساتھ قرب وجوار کے دیہاتیوں کاباہمی تعامل اور تعاون تھا۔کالا شاہ کاکو،کوٹ لکھپت اور لاہور شیخوپورہ کے درمیان واقع دائود ہرکولیس فرٹیلائزرز فیکٹری جیسے علاقے اپنی نوع کے اعتبار سے دیہی مزاج کے حامل تھے۔جو اپنے صنعتی روزگار کو اپنی دیہی اور زرعی شناخت کا ایک اضافی ذریعہ معاش سمجھتے تھے۔کئی دیہی مزدور

اس امید میں کام کررہے تھے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ اپنے لیے زمین کا کوئی ٹکڑا خرید نے کے قابل ہو جائیں گے۔جبکہ کئی اپنی دیہی زندگی سے اکتائے ہوئے تھے اور یہ سوچ کر مزدور بن گئے تھے کہ اب یہی کام کرناہے اوراپنے اجدادکے گائوں لوٹ کر نہیں جانا۔

لاہور اوراس کے مضافات میں ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کے دوران کی وہ کیفیت انتہائی جاندار اور بے مثال تھی جب نور خان انتظامیہ نے کریک ڈائون کاحتمی فیصلہ کیاتو لاہور' شیخوپورہ اور گوجرانوالہ کے دیہاتوں سے ہزاروں کی تعداد میں دیہاتی اپنے ہڑتالی صنعتی مزدوربھائیوں کے ساتھ آشامل ہوئے اور ان کے شانہ بشانہ پولیس کے خلاف لڑے۔

اس قسم کے ماحول میں یہ ناگزیرہوگیاتھا کہ ہڑتال کی صورتحال انتہائی سیاسی رنگ اختیار کر جائے۔ جماعت اسلامی نے کھل کر صنعتکاروں کی حمایت کا اعلان کیا اس نے اپنی ایک اشاعت میں ہڑتال کو بائیں بازو کی ایک سازش قراردیا جس کا مقصد الیکشن کے انعقادکو روکناتھا۔

17نومبر1969ء کو مغربی پاکستان کے امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمدنے ایک بیان جاری کیا۔" ایک اجنبی زندگی کی بات کرنے والوں کے ہتھیار اتنے تیز ہوئے ہیں کہ انہوں نے سادہ دل مزدوروں میں بھوک کا احساس اتنا شدید کردیاہے کہ اگر سبھی کارخانے ان مزدوروں کے حوالے کربھی دیے جائیں تو بھی ان حالات میں نہ توان کی بھوک ختم ہوگی اور نہ ہی ان کی تسلی وتشفی ہوگی"۔

بھٹونے پیکیجز فیکٹری کے مزدورں کے ہڑتالی کیمپ کا دورہ کیااور وہاں ایک پرجوش تقریر کی جس میں اس نے نئے صنعتی تعلقات کے آرڈیننس میں تالہ بندی کے قانون کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔(15)

پاکستان پیپلز پارٹی کا جریدہ "نصرت" ہڑتال کی تحریک کے دوران اردو میں مزدوروں کا سب سے موثر نمائندہ بن کر سامنے آیا۔ جبکہ پارٹی کے کئی انقلابی کیڈروں نے ہڑتالوں کو منظم کرنے میں بھی اہم کردار اداکیا۔اس کے باوجود کہ پارٹی ہڑتال کو جوش جذبے کے ساتھ حمایت فراہم کررہی تھی،پارٹی کی مرکزی قیادت اور پنجاب کی قیادت کے مابین اس بات پر اختلافات اور فاصلے موجود تھے کہ طلبہ اور مزدوروں کی اس تحریک کا کس حد تک اور کتنا ساتھ دیاجائے۔ پارٹی کی پنجاب باڈی اس دوران اپنا طلباء' مزدور اور کلچرل ونگ تشکیل دے چکی تھی ۔پنجاب کی پارٹی کا موقف تھا کہ ان متوازی ونگز کی تشکیل سے سماج کی ان پرتوں کے اندر پارٹی کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوں گی۔

"بائیں بازو کے سوشلسٹوں کا کہناتھا کہ ماضی کی مزدور تحریک کی کمزوری کی وجہ سیاسی عمل میں شریک ہونے سے ہمارا انکار کرناتھا"۔(16)انہوں نے ایک ٹریڈیونین

فیڈریشن تشکیل دینے کا فیصلہ کیا جس کا پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد ہوگا اور جو باہم مل کر معاشی اور سیاسی سرگرمیاں کریں گی۔بعد میں انہوں نے متحدہ مزدورمجلس عمل کومنظم و متحرک کرنا شروع کر دیا اور پیپلز پارٹی کے ساتھ تال میل اور تعلق ختم کردیا۔تاہم پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت ہر طریقے سے طلبہ اور مزدوروں کی وسیع پرتوں کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی اور سبھی بائیں بازو کے انقلابی گروپوں کے ساتھ زیادہ قربت اختیار کر کے اپنے اس تعلق کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔فیکٹریوں پرمزدوروں کے قبضے کے معاملے میں ،جیسا کہ الله وسایاٹیکسٹائل ملز ملتان کے معاملے میں ہواجہاں پیپلزپارٹی کے انقلابی لیڈروں محمود بابر اوراشفاق خان اورملتان مزدور مجلس عمل کی قیادت میں قبضہ ہواتھا،پیپلزپارٹی کے چیئرمین نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے "بائیں بازو کی مہم جوئی" قرار دیا۔ **25**نومبر**1971**ء کو ملتان بار ایسوسی ایشن کے ہنگامہ خیز اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہاکہ پیپلزپارٹی کسی طور بھی سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے پرتشدد راستے اختیارکرنے کی اجازت نہیں دے گی اوریہ پر امن اورآئینی طور طریقوں پر یقین رکھتی ہے۔

شہروں کے اندرجہاں پیپلزپارٹی کی تنظیمیں بہت مضبوط تھیں،الیکشن کے بعد ہونے والے قیمتوں میں اچانک اور تیز اضافے کے ساتھ بڑی اور درمیانی صنعتوں میں مزدوروں کی برطرفیوں نے تنائو اور تنازعات کی فضا پیدا کر دی۔ **1970**ء کے الیکشن میں کامیابی کی خوشی سے سرشار پیپلزپارٹی کے بائیں بازو اورپارٹی کی مزدورکمیٹیوں نے فوری طورپر ملک میں پارٹی اقتدارکو"کسان مزدور راج"میں ڈھالنے کا مطالبہ کردیا۔سبھی بڑے صنعتی شہروں میں فیکٹریوں پر قبضے ،ہڑتالوں،گھیرائوکے واقعات میں اضافہ ہوتاچلاگیالیکن لائل پور میں کچھ زیادہ سنجیدہ اورتلخ واقعات رونماہوئے،جہاں **25**مارچ**1971**ء کو مختاررانا،جو ایم این اے بھی تھا اور فیصل آبادمیں پارٹی کا سربراہ بھی تھا،کی گرفتاری کے بعد پارٹی کارکنوں کی قیادت میں عوام سڑکوں پر نکل آئے اورانہوں نے ایک عام ہڑتال کے ذریعے شہر کا محاصرہ کرلیا۔پیپلز گارڈ نے مورچہ بندہوکر پولیس کا مقابلہ کیا۔اس دوران جھنگ بازارپولیس سٹیشن تباہ کردیاگیا۔"رات گئے شہرمیں کرفیونافذکردیاگیا اور نظم و نسق کی بحالی کیلئے فوج کو طلب کرلیاگیا"۔**(17)**

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ پنجاب میں سے کوئی ایک بھی ٹریڈیونین لیڈر قومی یا صوبائی اسمبلی میں نہیں پہنچ سکا۔ضیاالدین بٹ سمیت پارٹی ٹکٹ مانگنے والوں کو پارٹی کی مرکزی پارلیمانی ریویوبورڈکی جانب سے انکار کر دیاگیاتھا۔چنانچہ الیکشن سے پہلے ہی مرکزی قیادت نے یہ طے کرلیاتھا کہ اسمبلی کے اندر پیپلزپارٹی کو ملے جلے رحجانات کی ہی نمائندگی دی جائے گی۔پیپلز پارٹی کا بایاں بازو صنعتی اداروں کے اندر

زیادہ وسیع اور گہرا اثرورسوخ قائم کرچکاتھا۔ وہاں مہنگائی میں اضافے ، مزدوروں کی برطرفیوں اور یونین والوں کے ساتھ کیے جانے والے برتائو نے مزدوروں اور انتظامیہ کے مابین تنائو کے بحران کوبلندیوں پر پہنچا دیا۔ پیپلز پارٹی کاایم این اے مختاررانا جو ایک انقلابی سماجی رہنما،کسان مزدور راج کا علمبردار تھا' کے گرد پیپلزپارٹی کی حمایتی یونینوں نے لائل پور' سرگودھا اورملتان میں صنعتی اداروں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔ مختاررانا کا دعویٰ تھا کہ اسے بھٹو کی ہدایت تھی کہ جن اداروں میں مزدوروں کے ساتھ زیادتی ہورہی تھی ان پر قبضہ کر لیاجائے۔اس کو شیخ رشید(''بابائے سوشلزم'') اورپنجاب پیپلز پارٹی تنظیم کی بھرپور تائید و حمایت حاصل تھی۔لائل پور میں25مارچ کو ہونے والے فسادات کے ضمن میں یہ ہدایات نہ صرف صنعتکاروں سے متعلق تھیں بلکہ یونینوں کی انتظامیہ کے بارے میں بھی تھیں۔ا س سارے عرصے کے دوران پیپلزپارٹی کی حمایتی یونینوں کے کئی گروپ سامنے آچکے تھے جو پرانی اور کم سیاسی یونینوں کی جگہ لیتے جارہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ان کا پیپلزپارٹی میں چوردروازوں سے داخل ہونے والے دائیں بازو اور بالادست طبقے کے خلاف غم و غصہ بھی بڑھتا چلا جارہاتھا۔پیپلز پارٹی کی حمایت یافتہ یونینوں کی طاقت کا واضح ثبوت سبھی سکہ بندیونینوں کی طرف سے ان کی اندھادھند اور اندھی مخالفت اور سرمایہ دار طبقے کے ان پرہونے والے حملوں سے لگایاجاسکتاہے ۔ مغربی پاکستان فیڈریشن آف ٹریڈیونین WPFTU نے 70ء کے الیکشن میں جمعیت علمائے اسلام کی حمایت کی تھی مگر وقت نے دکھایا کہ خود اس کے اپنے ''حلقہ انتخاب''نے گرمجوشی کے ساتھ بھاری تعدادمیں پیپلز پارٹی کوووٹ ڈالے۔ 26/27 دسمبر1970ء کو لاہور میں ہونے والی آل پاکستان لیبرکانفرنس میں روایتی سکہ بند یونینوں کی گھبراہٹ اور تذبذب واضح ہو کر سامنے آگیا جب وہ کوئی متوازن فیصلہ کرنے میں ناکام رہے۔یہ صرف بشیر بختیار (WPFTUاورپاکستان لیبرپارٹی کا صدر)ہی تھاجس نے پیپلز پارٹی کے حق میں تقریریں کرنی شروع کر دی تھیں۔

آخرکار جب مزدوروں کی تحریک زوروں پر تھی، 22مارچ 1971ء کوپاکستان لیبرپارٹی کو تحلیل کرکے اسے پیپلزپارٹی میں ضم کر دیاگیا۔اس قدم کو بڑی حد تک ایک حفاظتی اقدام قرار دیاگیا مگراس حوالے سے یہ شکوک وشبہات بھی بیان کیے گئے کہ ایسا لیبرپارٹی کی قیادت کی خواہش پر کیاگیا جو چاہتی تھی کہ صنعتی محنت کشوں میں پیپلزپارٹی کے بائیں بازو کے تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے اثرورسوخ کو روکاجائے۔

جنگ

مزدوروں کی طرف سے فیکٹریوں پر قبضے،زمینوں پر کسانوں کے

محاصرے،خواتین کے شعورمیں ہونے والی بڑھوتری اور طالبعلموں اور نوجوانوں کی جرات و بہادری نے مشرقی و مغربی دونوں پاکستانوں میں انقلابی صورتحال پیداکی ہوئی تھی۔انقلاب میں تاخیر نے مشرقی بنگال میں تحریک کو قوم پرستانہ رحجانات کی طرف دھکیل دیا ۔جنگی جنونیت اور وحشت کو پاگل پن کی حدتک ہوا دی جانے لگی جو ایک انتہائی سفاك اورہولناك خانہ جنگی اورپھر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں سامنے آئی ۔پاکستانی فوج کو بنگالی عوام کے ہاتھوں بدترین ہزیمت کا سامناکرناپڑا۔خانہ جنگی کے دوران ہزاروں افرادپاکستانی فوج کے ہاتھوں ماردیے گئے جبکہ ان گنت خواتین کے ساتھ زنا بالجبر بھی کیاگیا۔

پاکستانی فوج کی طرف سے کیے جانے والے بنگالیوں کے اس بے رحمانہ اوربہیمانہ قتل عام کو اسلامی بنیادپرستوں کی طرف سے ملنے والی مدد نے اور بھی وحشی بنادیا۔پاکستانی فوج کی معاون طاقت کے طورپر سرگرم ان مذہبی جنونی تنظیموں میں سے دو کا تعلق اسلامی بنیادپرست پارٹی جماعت اسلامی کے ساتھ تھاجن کے نام "الشمس "اور" البدر"تھے۔(18) جنونیوں کے یہ لشکر بدقماش عناصرسے ترتیب دیے گئے تھے جن کو ریاست پاکستان کی طرف سے بھاری تعدادمیں اسلحہ اور سرمایہ فراہم کیاگیا،حقیقتاًیہ سب سی آئی اے(CIA) کی معاونت اور مدد سے کیاجارہاتھا۔ ان جنونیوں کی زیادتیاں اور بدمعاشیا ں پاکستان کی فوج سے کہیں زیادہ تھیں۔یہ سب کچھ کافی حد تک ایک فوجی نظم وضبط کی ماتحتی میں ہو رہا تھا مگر بنگالیوں کا قتل عام کرتے ہوئے کسی کم سے کم معیارکوبھی ملحوظ خاطر نہیں رکھاگیا۔اسی معرکہ آرائی کے دوران ہی البدر اور الشمس نے پاکستانی فوج کی عسکری اور مادی امداد کے ذریعے کمیونسٹ اور سوشلسٹ طالبعلموں،ٹریڈیونینسٹوں اور سیاسی کارکنوں کو اپنے ہدف پہ رکھتے ہوئے ان کو چن چن کر قتل کیا۔اس خانہ جنگی کو آڑ بناتے ہوئے مشرقی بنگال میں جاری انقلابی تحریک کو ایک بدترین ردانقلاب کے ذریعے کچل کے رکھ دیاگیا۔یہی وہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ جس کے باعث قوم پرستوں کو عوام اور تحریک پر قابوپانے کا باآسانی رستہ مل گیاجبکہ اس انقلاب کے بانی سوشلسٹ بائیں بازو کے قائدین کوتاریخ کے کسی کونے میں بٹھادیا گیا۔

جماعت اسلامی کی مشرقی بنگال کے "آپریشن بلٹز"(Operation Blitz) میں گہری مداخلت کو جنرل ریٹائرڈقریشی نے اپنی کتاب میں بے نقاب کیا ہے جو دیناج پور/سیدپور(مشرقی بنگال کے اضلاع) کابٹالین کمانڈر رہاتھا۔اس نے صاف لکھا ہے کہ کیسے امیر جماعت اسلامی کو وہاں کے ضلعی کمبیٹ ٹروپس فارمیشن سنٹرز (Combat Troops Formations)تک باآسانی رسائی حاصل ہوتی تھی جہاں وہ اسلامی جنونی جانبازوں کی حوصلہ افزائی اور پیش قدمی کیلئے وقتاًفوقتاًجاتاتھا،ان جہادی گروپوں کے

ڈھانچے اور کاروائیوں کے طریق کارنازی جرمنی کے "شاک ٹروپرز "اور زارروس کے "بلیک ہنڈرڈز"سے مماثلت رکھتے تھے۔جنرل قریشی لکھتاہے"ملٹری ایکشن کے بعد مولانا طفیل نے ہمارے کیمپ کا دورہ کیا۔وہ مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کے دوردرازعلاقوں کا دورہ کرنے والا واحد پاکستانی لیڈرتھاجو وہاں درپیش حالات کاذاتی طورپر جائزہ لینے آیاتھا۔ہمیں یہ جان کر اچھالگا کہ ہم وردی والوں کے علاوہ بھی کوئی اور ہے جو اس نظریاتی اورجغرافیائی حوالے سے اس منفرد ملک کے مستقبل کے بارے میں اتنا ہی پریشان ہے جتنا ہم۔ مولانا کو ان رضاکاروں کے بارے میں بہت تشویش تھی جو مقامی طورپر ان کی جماعت میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔اسے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہے کہ وہ ایک شاندارکردار اداکررہے ہیں۔مولانا نے ہنستے ہوئے مذاق کے انداز میں ہمیں کہاکہ ہمارے جانبازوں نے ہمیشہ کڑے وقت میں پاکستانی فوج کا دلجمعی سے ساتھ نبھایاہے۔اس وقت میری جو ذہنی حالت تھی تب میں نے سوچا کہ یہ تصور ہی محدود نوعیت کا ہے کہ فوج اور جماعت اسلامی ایک دوسرے کی حمایت کر رہے ہیں دراصل نہ تو فوج اپنے تحفظ کی لڑائی لڑ رہی تھی اور نہ ہی مجاہدین فوج کے کردار کوبڑھاوادے رہے تھے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بجائے درحقیقت ملکی مفادمیں باہمی تعاون کر رہے تھے۔مجھے یہ کہنے دیجئے کہ یہ جماعت اسلامی اور اس کے تیارکردہ بنگالی مسلمانوں کو ہی اعزاز جاتاہے کہ انہوں نے اس وقت تک ہمارا بھرپورساتھ دیا جب تک ہم وہاں موجود رہے ۔یہ سب تو پاکستان اوراسلام کے نام پر مرمٹنے کیلئے تیار تھے مگر بدقسمتی سے ہمیں سفید جھنڈے بلند کرنے پڑگئے "۔(19)

یہی جنرل قریشی آگے وضاحت کرتے ہوئے بتاتاہے کہ فوج نے اپنے فوجی آپریشنز میں ان متعصب بنیادپرستوں کو کس آخری حدتک استعمال کیا۔"جنرل آفیسرکمانڈنگ GOCنے نوتشکیل کردہ "ایسٹ پاکستان سول آرمڈفورسز"اور "مجاہد"یونٹس کے بارے میں بحث کی۔ہم نے ان دونوں کے حوالے سے گفتگو کی کہ کس طرح ان مددگار مجاہدوں کو نچلی سطح تک باقاعدہ فوج کے ساتھ ملاناہے اور ان کی کمان فوج کے پاس ہی رکھنی ہے۔یہ محسوس کیاگیا کہ ان رضاکاروں کی آمد سے افرادی قوت میں اضافہ ہوگا اور ہم مزید مستحکم ہوں گے اور ہمارے دائرہ کار کے سارے علاقے میں راشن،اسلحہ بارود اوردیگر انتظامی کمک کی بروقت فراہمی بھی بہتر ہوگی "۔(20)

دسمبر 1971ء میں پاکستان آرمی کی پسپائی کے بعد مشرقی پاکستان میں ایک نیا تنازعہ شروع ہوگیا۔قومی آزادی کی جنگ کے دوران پاک فوج سے چھڑائے گئے علاقوں کے اندر رسوویتیں قائم ہونی شروع ہو گئیں۔بھارت کی جارح فوج نے مشرقی بنگال کی رجعتی بورژواقوم پرست قوتوں کی مدد سے ان سوویتوں کو کچلنے کی کوشش کی۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دوران امریکی بحریہ کا ساتواں بیڑہ خلیج بنگال میں اپنے لائو لشکر

سمیت موجودتھا۔امریکی سامراجی خوفزدہ تھے کہ شاید بھارتی فوج ان سوویتوں کو کچلنے میں ناکام رہے جوسماج میں ایک نئے نظام کے طورپر جنم لے رہی تھیں۔یہ سوویتیں مکتی باہنی اور نیشنل لبریشن موومنٹ کے بائیں بازو جاتیو سماج تانترک دل JSDکی زیرنگرانی سرگرم ہورہی تھیں۔دونوں دشمن ممالک کے سینئر فوجی افسران کی بھائی چارے اور دوستی کی فضا جو تقسیم سے پہلے ایک ساتھ مشترکہ تعلیم یا ملازمت کے دوران بنی تھی وہ پچیس سال بعد بھی اور تین جنگیں لڑے جانے کے باوجود بھی قائم ودائم تھی۔بنگلہ دیش جنگ کے ختم ہونے کے ایک دن بعد پاکستان کی مسلح افواج کی ایک کور کے افسروں کے ایک گروپ نے اس بھارتی فوجی گروپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا جس کے سامنے انہوں نے ہتھیار ڈالے تھے ۔انہیں ایک کلب کے شراب خانے میں بھارتی کیولری کا ایک افسر مل گیا جس نے ان کی شکست قبول کرنے سے پہلے انہیں اپنے ساتھ پینے کی پیشکش کر دی۔”بھارتی فوج کی پیش قدمی کرنے والی گارڈ جوسب سے پہلے شہر میں داخل ہوئی تھی، کی سربراہی کرنے والے میجر جنرل گندھارو ناگرا نے کہا کہ بہت جانی نقصان ہو چکا ہے ،ہر طرف تباہی ہی تباہی کا سماں ہے۔میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی ہمارے جنرل نیازی سے ملاقات ہوئی ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہاں میں اسے ملا ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ہم کالج سے ہی ایک دوسرے کے شناسا ہیں“۔(21)

جب پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنے کیلئے اس کے یونٹ میں لایاگیاتومیدان جنگ سے فارغ ہوکر تازہ دم بھارتی اور پاکستانی فوجیوں نے دھان کے خالی میدانوں میں ہاکی اور فٹبال کے میچوں کا ایک رائونڈ کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔کھیلوں کے اس خیرسگالی مرحلے کے دوران ہی بھارتی کمانڈر کو وزیراعظم اندراگاندھی کے دفتر سے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا۔اس فوری پیغام میں اسے یاددہانی کرائی گئی تھی کہ ”تمہیں جنگ کیلئے بھیجا گیا تھا کرکٹ کھیلنے نہیں“۔ اگر مشرقی بنگال میں انقلاب پھیل جاتا تو اسے کوئی بھی مغربی بنگال کے ساتھ وابستہ اور منسلک ہونے سے نہیں روک سکتاتھا جہاں کمیونسٹ پہلے ہی مضبوط اور سماج انقلابی ہوچکاتھا۔بعد ازجنگ کے بحران زدہ برصغیر میں ایک سرخ بنگال جوکہ اپنی سرکشیوں اور بغاوتوں کی درخشندہ روایات کا حامل ہے۔ ایک سرخ بنگال سارے خطے کو انقلاب کی طرف کھینچ کر لے جاسکتاتھا۔اس سے نہ صرف برصغیر میں سرمائے کی حکمرانی کا خاتمہ ہوجاتابلکہ اس کے امریکی و مغربی سامراج کیلئے بھی دور رس تباہ کن اثرات مرتب ہوتے۔ خلیج بنگال پر ساتویں امریکی بیڑے کی موجودگی کسی طور بھی اتفاقیہ یا حادثاتی نہیں تھی۔

مغربی پاکستان میں شکستہ اور شکست خوردہ فوج کسی طور بھی کسی نئی عوامی سرکشی کا مقابلہ کرنے سے مکمل طورپر قاصرتھی۔مسلح افواج اپنی ساکھ اور

سماجی بنیادوں سے محروم ہوچکی تھی۔جبکہ یہ اندر سے بھی تھک ہار چکی تھی۔جنرل گل حسن نے اپنی خودنوشت یادداشتوں میں تفصیل کے ساتھ مشرقی بنگال میں عوام کی بغاوت کا احوال بیان کیا ہے۔جہاں تحریک نے فوج کو شکست سے دوچار کردیاتھا اور جہاں کمزوروں اور محکوموں نے نظام کو اکھاڑ کر پھینک دیاتھا۔ جنرل گل نے اس صورتحال پر روشنی ڈالی ہے جب ابھی بھارتی فوج بھی وہاں نہیں آئی تھی۔

”جنرل ٹکا خان کے ہتھیارڈالنے سے بھی پہلے ،بے عزتی اور گالیوں سے بچنے کیلئے ہمارے فوجی چھائونیوں تک ہی محدودہوکے رہ گئے تھے۔ اس وقت عوامی لیگ کے کارکن فوجیوں پر حملہ کردیاکرتے تھے۔معاملات اس وقت اوربھی بدترین ہوجاتے تھے جب بنگالی ٹھیکیدار ہمارے لیے خوراک کی سپلائی کو بند کردیتے تھے اور جب ان کی بجلی اور پانی کی فراہمی کاٹ دی جاتی تھی۔یہ ایک انتہائی بدترین کیفیت تھی۔یہ سب فطری تھاکہ جب آرمی ایکشن بندکردیاگیاتھا تو فوج کسی طور بھی عوامی لیگ کے غنڈوں کی طرف سے ہونے والی توہین کو فراموش نہ کرتی“۔

”چین سے اپنے دورے کی واپسی پر میں دودنوں کیلئے مشرقی پاکستان رکا،یہ دو دن میں سفر پر رہا اور مختلف کمانڈروں کے ساتھ حال احوال کرتارہاجوکہ باغیوں کے ساتھ لڑائی میں شریک تھے۔وہ پراعتمادتوتھے لیکن مغربی پاکستان کے ان بے شمارافسروں کے قتل سے پریشان بھی تھے جو سول آرمڈفورسز اور ایسٹ بنگال رجمنٹس کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہے تھے اور جو اپنے ہی جوانوں کی طرف سے قتل کیے جارہے تھے۔میری ان کے ساتھ جو بات چیت ہوئی اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذکیا اور جس کی بعد میں جنرل ٹکاخان نے بھی تصدیق کی جب میں نے اسے اپنی واپسی سے قبل ڈنر پر دعوت دی، کہ وہاں کوئی شے بھی حرکت میں نہیں تھی ،نہ ریلیں ‘نہ بسیں‘ نہ سٹیمر،کیونکہ یہ یاتو سرحدسے باہر جا چکے تھے یاپھر چھپادیئے گئے تھے۔یہ فوج سے ڈرگئے تھے یا پھر باغیوں سے سہم گئے تھے جو ان کے حکومت کے ساتھ تعاون کے سخت مخالف تھے ،اس حکومت کے جس کی اتھارٹی جنرل ٹکا خان تعمیر کرنے کی کوشش کررہاتھا۔یہ قطعی کوئی حوصلہ افزا صورتحال نہ تھی جو میں اپنے ساتھ واپس لایا“۔

”کھلنا ہیڈکوارٹرز پرمیں نے دیکھا کہ ہماری وائرلیس سروس میں بھی باغیوں کی جانب سے مداخلت کی جارہی تھی۔میں نے سپیکر پر میجر جلیل کی آواز سنی جوایک بہت اچھا افسر اور ساتھی تھا اور جومیرے ساتھ1آرمرڈڈویژن میں کام کرچکاتھا لیکن جو اب فوج سے بھاگ کر باغیوں کی قیادت کر رہاتھا۔مجھے انتہائی شدید جھٹکا لگا کہ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس جیسا افسر بھی ایسا کرے گا۔مشرقی پاکستان ڈوب چکاتھا ور ہم جس قسم کی کوششیں کر رہے تھے ان کا وقت کب کا ختم ہوچکاتھا،ہم وہاں صرف وقت ضائع کر رہے تھے“۔(22)

انقلابی ابھار کو روکنے میں ناکامی پر برصغیر کے حکمرانوں نے انتہائی اقدام اٹھانے کا فیصلہ کرلیا کہ ایک بڑی جنگ شروع کر دی جائے اور انقلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔جنگ میں شکست نے فوج کو مکمل طورپر نڈھال اور شکست وریخت سے دوچار کردیاتھا۔کئی چھائونیوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ ایسی رپورٹیں آرہی تھیں جن کے مطابق سپاہیوں نے اپنے افسروں کی مارپیٹ کرنا ،انہیں قید کرنا یہاں تک کہ قتل کرناشروع کردیاتھا۔ریاست کا یہ ناقابل شکست ستون اپنی بنیادوں تک لرز چکاتھا اور لڑکھڑارہاتھا۔ملکی اور عالمی میڈیا انتہائی سخت سنسر شپ اورپابندیوں کے باعث ان واقعات کو چھپارہاتھا۔خاص طورپر یہ سختی ان واقعات کے سلسلے میں اور بھی زیادہ تھی جن میں شکست خوردہ فوجی اپنے افسروں ،اپنے حکمرانوں اور خود نظام کے خلاف بغاوت پر اترآئے تھے۔تاہم جو بھی ہو ہم یہاں ایک بارپھر اس موضوع سے متعلق سب سے معتبر حوالے جنرل گل حسن کی بات کو سامنے لاتے ہیں جو بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان کاپہلا اور آخری کمانڈر انچیف تھا ۔اسے ہٹانے کے بعد بھٹونے پاکستان آرمڈ فورسز کی ’’چین آف کمانڈ‘‘کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔اگرچہ یہ سب علامتی تھا اور یہ تبدیلی دکھاوے کیلئے ہی کی گئی تھی۔کمانڈر انچیفC-in-Cکے عہدے کوچیف آف آرمی سٹاف COAS میں بدل دیا گیا۔ آرمی کمانڈر کی جگہ ایک جوائنٹ چیف آف آرمی سٹاف کمیٹی JCSC قائم کر دی گئی۔جنرل گل حسن اپنی یادداشت میں ’’Tremors in the Army‘‘کے عنوان سے باب میں لکھتاہے:

’’جب تک بھی میرے قویٰ قائم رہیں گے،19دسمبر کا دن کبھی بھی میری یادداشت سے محو نہیں ہو سکے گا‘یہ راولپنڈی کا ایک خوشگواردن تھا لیکن جو موسم ہمارے اندرتھا اس سے یہ کسی طور بھی مطابقت نہیں رکھتاتھا۔اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمارے اندر کیاکیا طوفان بپھرے ہوئے تھے۔دل ہی نہیں چاہ رہاتھا کہ آج جی ایچ کیو(G.H.Q) جاکر کام کیاجائے جیسا کہ اچھے دنوں میں میری عادت ہواکرتی تھی۔میں انتہائی مایوس اور دل برداشتہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ یہ کیا کربیٹھے ہیں؟میں سوچ رہاتھا کہ دفتر میں کتنے ایسے معاملات کی فائلیں پڑی ہیں جو سیزفائر کے حکم کی خلاف ورزی کیے جانے سے متعلق تھیں ،جنہیں میں نے دیکھنا تھا اور ان کے متعلق فیصلہ کرناتھا‘‘۔

’’محاذ جنگ سے لڑائی کے بارے میں غلط رپورٹیں آئی ہوئی ہوں گی کہ اپنے پچھلے غلط دعووں کو سچ ثابت کرنے کیلئے بھارتی فوج اپنے ہاتھ سے نکل جانے والے علاقوں کی بازیابی کیلئے بے دریغ لڑرہی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہمارے افسران بھی اپنے اپنے محاذوں پرقابض ہیں۔ ہمارے افسران کی طرف سے بھی مطالبات کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے۔اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے لمحوں میں مجھے اپنے ان فوجیوں کی حالت کا رہ

رہ کر خیال آرہاتھا جو جنگی قیدی بن چکے تھے۔میرا سر بوجھل ہو چکا تھا۔ اس دوران میں نے سڑک پر نگاہ دوڑائی تو میں نے دیکھا کہ راہ چلتے لوگ جی ایچ کیو (G.H.Q) کی جانب جاتی ہوئی ہماری گاڑیوں کو نفرت اور حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔مجھے اپنے اوپر بہت ملامت ہوئی"۔

"میں جب اپنے دفتر پہنچاتو میرے سٹاف افسر نے مجھے اطلاع دی کہ آج چیف آف سٹاف راولپنڈی گیریژن کے افسروں سے خطاب کرے گا۔مجھے علم نہیں تھا کہ آج کا موضوع کیاہوگا مگر مجھے اتنا ضرور احسا س تھا کہ آج جنر ل حامد کو اپنی زندگی کے سب سے مشکل ہدف کو سرانجام دیناتھا۔میں نے اس کا استقبال کیا،اسے ہال کے اندر تک لے گیا اور خود جاکر پہلی قطار میں بیٹھ گیا۔مجھے قطعی یادنہیں کہ اس نے کیا کہا۔میں جذباتی سطح پر اتنا بددل ہوچکاتھا کہ میری توجہ ہی کہیں مرکوز نہیں ہوپارہی تھی ۔میں اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا۔ اورپھروہ بھی کب مسلسل بول سکاتھا ۔نیچے سے اسے نیم باغی اوربرہم اجتماع باربار ٹوک رہاتھا۔ چیف کواپنے آپ کو سنبھالنے کیلئے ایک دوبار ڈائس سے بھی ہٹنا پڑگیااورپھر اپنی بات شروع کرنی پڑی۔میں نے منظم افراد کے اس طرح کے کسی اجتماع میں ایسی کارکردگی پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔لیکن میں‌نے اس ضمن میں انہیں غلط بھی نہیں سمجھا۔ مجھے یہ بھی کچھ کچھ یاد پڑ رہا ہے کہ ہال میں بیٹھے سبھی لوگ یہ مطالبہ باربار دہرارہے تھے کہ سبھی افسروں کے میس بندکر دیئے جائیں"۔

"اپنی اس زبوں حال کیفیت میں‌مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہاتھا کہ اس صورتحال کا کیسے مقابلہ کیا جائے، کس طرح اس سے نکلا جائے۔ہمارا مستقبل کیاہوگا، کچھ سمجھ نہیں آرہاتھا۔سہ پہر کو مجھے بتایا گیا کہ کرنل عالم آفریدی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں‌اور جلدہی اس کا مجھے فون بھی آگیا ۔اس نے بتایا کہ گوجرانوالہ میں فوجی سپاہی مشرقی پاکستان کے سقوط پر انتہائی مشتعل ہیں اور احتجاج کر رہے ہیں۔ان کا مطالبہ ہے کہ میں وہاں آئوں‌اور ان کو مطمئن کروں۔میں نے اسے جواب دیا کہ میں جی ایچ کیو نہیں چھوڑ سکتا،البتہ وہ مجھ سے ملنے آجائے۔اگرچہ مجھے بھی پتہ نہیں تھا کہ اس کو ملنے سے کیا حاصل ہوگا؟ آفریدی کافی دیر مجھ سے بات کرتا رہا اورمجھے یہ انداز ہ ہوگیا کہ گوجرانوالہ میں فوجی سپاہی بغاوت پر اتر آئے تھے۔ آفریدی کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس کے فوجی مطالبہ کر رہے ہیں کہ جنرل ٹکا خان کو فوراًہٹایاجائے"۔

یحییٰ کی رخصتی !بھٹو کی آمد!

"میجر جنرل ایم آئی کریم، جو 6آرمرڈڈویژن کا کمانڈراورایک مشرقی پاکستانی

افسرتھا، نے بھی تصدیق کی کہ فوج مشرقی پاکستان کے چھن جانے سے دہل چکی تھی اور ہر طرف فوجیوں میں اضطراب و اشتعال بڑھتا چلا جارہاتھا۔میں نے یہ ساری باتیں صدر مملکت کے گوش گزار کیں۔اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ جلد سے جلد اقتدار سے الگ ہورہاہے اور اسے ایک عوام کے منتخب نمائندے کے سپرد کردے گا۔ 19دسمبر کا یہ دن واقعی مجھے کبھی بھی نہیں بھولے گا۔اپنی ساری طویل ملازمت کے دوران کوئی او ر دن مجھ پر اتنا بھاری نہیں گزرا۔آرمی کا ڈسپلن تنکوں کی طرح بکھرتا جارہاتھا اور ہر طرف انتشار ہی انتشار تھا۔صورتحال اس حوالے سے اور بھی بدتر ہوتی چلی جارہی تھی کہ کوئی بھی ایسی اتھارٹی موجود نہیں تھی جو اس کو سمیٹتی یا سنبھالتی۔یہ بھیانک پرخطر واقعات کا سلسلہ تھا جس نے فوج کے وجود کو ہی سوالیہ نشان بنا کے رکھ دیا تھا، پاکستان کا اب رہ بھی کیاگیاتھا!کون تھا جو اس صورتحال میں فوج کو بچاتا اور اسے بحال کرتا؟‘‘۔(23)

یہ ایسی صورتحال تھی جب 7نومبر1968ء کے بعد ایک بارپھر سوشلسٹ انقلاب برپا کیاجاسکتا تھا اور استحصالی سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی لوٹ مارکو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اکھاڑکے پھینکا جا سکتا تھا۔ ٹراٹسکی نے چوتھی انٹرنیشنل کی بنیادی دستاویزات کے عبوری پروگرام میں لکھا ہے ’’نسل انسانی کا تاریخی بحران آج سمٹ کر انقلابی قیادت کے بحران میں ڈھل چکاہے‘‘۔(24)

پاکستان پیپلز پارٹی نہ تو کوئی بالشویک پارٹی تھی اور نہ ہی بھٹو کوئی لینن تھا۔انقلابی پارٹی کی غیر موجودگی نے اس انقلابی موقع کو پاکستانی پرولتاریہ اور محروم و مقہور عوام کے ہاتھوں سے گنوا دیا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ اور مشرقی پاکستان کی تحریک اور بنگلہ دیش کے وجود میں آنے پر بہت سی کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں مگر بہت کم کتابیں یا موادایسا ہے جو 1971ء کے مشرقی پاکستان کے سانحے پر طبقاتی نقطہء نظر سے لکھا گیاہے۔بدقسمتی سے اس موضوع کا درست احاطہ کرنے کیلئے ایک الگ مکمل کتاب درکارہے۔چونکہ اس وقت ہمارا موضوع یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے لہٰذا ہم اپنے تجزیے کو انہی اہم اور قابل ذکر واقعات کی نشاندہی تک ہی محدود رکھ رہے ہیں جو ان ہلادینے والے دنوں میں ہوئے اور جن کے اثرات ابھی تک پاکستان میں موجود ہیں۔فوجی آپریشن اور پھر اس کے نتیجے میں منہ پر لگنے والے شکست کے زوردار طمانچے کے دوران یحییٰ آمریت نے اپنے سائے تلے ایک مصنوعی عبوری حکومت تشکیل دی۔ مشرقی بنگال سے نورالامین کو وزیراعظم جبکہ ذولفقار علی بھٹو کو اس حکومتی سیٹ اپ کا مجوزہ ڈپٹی وزیراعظم اور وزیرخارجہ بنایاگیا۔

بھٹو8دسمبر 1971ء کو نیویارک پہنچا جہاں اس نے سفارتی محاذ پر بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان کے کھوئے ہوئے اعتماد کی بحالی کی کوشش کی۔اپنی روانگی کے

وقت اس نے کراچی ایئر پورٹ پر الوداع کہنے کیلئے آئے ہوئے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے،خواہ ہمیں ہزار سال کیوں نہ لگ جائیں مگر ہم پاکستان کی مقدس سرزمین کو بھارت کی جارحیت سے پاک کر کے رہیں گے"۔بھٹو نے 11دسمبر کو پیئر میں کچھ دیر قیام کے بعد والڈ روف ٹاورز میں اقوام متحدہ میں امریکی سفیر جارج بش کے دفتر میں ہنری کسنجر کے ساتھ ناشتہ کیا اوراس سے ملاقات کی۔کسنجر اس ملاقات کا احوال لکھتاہے "پروقار،گفتگو میں تاثیر،ذہین بھٹوبالآخر ایک ایسا نمائندہ سامنے آگیاتھا جو عوامی معاملات میں بھارتی قیادت سے مقابلہ کر سکتاتھا۔عدم اعتماد کی فضا میں اس کی دلکش طرز گفتگو اور برمحل وبرموقع برتائو نے ہماری حکومت کو مشکل میں ڈال دیا"۔(25)

کسنجر نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ "محض جذباتی گفتگو کرنے سے پاکستان کو نہیں بچایا جاسکے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہم تمہاری مدد نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم تمہیں بچاناچاہتے ہیں۔اصولوں کی فکر کرنا اور ان پر بات کرنا اچھی بات ہوتی ہے لیکن ہمیں ہر حال میں تمہاری بقا کو یقینی بناناہے۔اگلے اڑتالیس گھنٹے انتہائی اہم اور فیصلہ کن ہیں۔ہمیں ان کوتاریخ میں نام زندہ رکھنے کیلئے ضائع نہیں کرنا۔ بھٹوبہت سلجھا ہوا ،بہت معاملہ فہم انسان تھا۔اسے حقائق سے درست آگاہی بھی تھی۔وہ ایک ایسا آدمی تھا جو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا اور جو موقع اور حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتاتھا۔مگر جو کچھ اس کے ملک میں اب بچاتھا اسے بچانا انتہائی درد ناک مرحلہ تھا"۔(26)

"ٹائیگر نیازی"نے 16دسمبر کو ہتھیار ڈالے اور اگلے دن ڈھاکہ کے ریس کورس گرائونڈ میں دوپہر کو ساری فوج سرنگوں ہو گئی۔پاکستان کے 93000افسر اور فوجی قیدکرلیے گئے۔یہ قومی تاریخ کی سب سے بدترین ذلت آمیز شکست تھی۔ایک ایسی شکست جسے بھٹو جیسے لیڈر کی شعلہ بیانی بھی مغربی پاکستان کے کروڑوں لوگوں کے سامنے عریاں ہونے سے نہیں بچاسکی تھی۔جس نے ہر ممکن امید دلانے ،دعاکرنے اور تھک ہار کے ہرممکن جھوٹ بول کر اپنے عوام کودلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔نیویارک سے بھٹو17دسمبر کو، صدر نکسن اور ہنری کسنجر کے ساتھ مذاکرات کیلئے فلوریڈا میں کی بسکین پر پہنچا۔ یہ ملاقات بیب ریبوزو کی کشتی پر ہوئی تھی جہاں اسے ہرطرح کی عسکری و مالی امداد کی یقین دہانی کرائی گئی۔ 18دسمبر کی شام کو وہ پان امریکہ کی فلائیٹ سے واپسی کے طویل سفر کیلئے روانہ ہوا۔ایک ایسی قوم کی طرف جو شکست سے نڈھال و بے حال ہو چکی تھی اور جس کی اسے آگے چل کر قیادت کرنی تھی۔وہ روم(اٹلی)پہنچا جہاں سے اسے ایئر مارشل رحیم خان کے حکم پر پی آئی اے کا ایک خصوصی جہاز کراچی لانے کیلئے بھیجا گیا تھا۔واپسی کے اس اداس مگر فاتح سفرمیں

بھٹو کو تہران اترنے اور شاہ ایران کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

"یحییٰ کو پھانسی دو" کا نعرہ اب "سداجیوے بھٹو" میں بدل چکا تھا۔یحییٰ کو پھانسی دینے کا مطالبہ زوروں پر تھا،جب اس کے چیف آف سٹاف نے 20دسمبر کو نیشنل ڈیفنس کالج پنڈی میں جونیئر افسروں کے گروپ سے خطاب کرتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بریفنگ دینے کی کوشش کی تو اسے انتہائی سخت سوالات اور سخت جملوں کا سامنا کرنا پڑگیا۔"نوجوان افسران چلا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے "باسٹرڈ""شرابی""ذلیل""بے شرم"۔۔۔جنرل حامد خان چپ ہو کر سنتا رہا جبکہ اگلی صفوں میں بیٹھے جرنیلوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔یحییٰ خان کے سارے حربے ناکام ہو چکے تھے ۔ کھیل ختم ہو گیا تھا"۔(27)

جب نیشنل ڈیفنس کالج میں ہونے والا یہ شاندار سٹیج ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا اور یحییٰ کو یہ بتا دیا گیا کہ وہ صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت کچھ ہار چکا ہے، بھٹو راولپنڈی پہنچا جہاں اس کا با اعتماد ساتھی مصطفیٰ کھر ایئر پورٹ کے دروازے کے ساتھ ایک نیلی مرسیڈیز کے اندر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔یہاں سے وہ دونوں ایوان صدر کیلئے روانہ ہوئے۔خاردار تاروں اور فولادی دروازوں کی حامل یہ عمارت بہت جلد بھٹو کی رہائش گاہ بننے والی تھی۔یحییٰ انتہائی بیتابی کے ساتھ اپنے ہارے ہوئے دو جرنیلوں حامد اور پیرزادہ کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔تینوں سوڈے کے بغیر وسکی سے شغل فرما رہے تھے۔

20دسمبر1971ء کو یحییٰ خان کو ہٹا کر بھٹو کو پاکستان کا نیا صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا حلف لینے کے بعد پنجاب ہاؤس پنڈی لے جایا گیا۔یحییٰ کو جلد سے جلد ایوان صدر خالی کرنے کا کہا گیا۔ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان کو پنجاب ہاؤس بلایا گیا، صدارتی عمل کی سیڑھیاں چڑھتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ وہ یحییٰ سے ملنے جا رہا ہے۔بھٹو نے اسے کہا کہ وہ یحییٰ کی جگہ آرمی کمانڈر انچیف کا منصب سنبھال لے کیونکہ وہ اس پوزیشن کو سنبھالنے کا اہل نہیں تھا۔موجودہ چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر جنرل گل حسن سبھی جرنیلوں سے ذاتی طور پر بخوبی واقف تھا بلکہ ان میں سے کئی ایک کی تو وہ تربیت بھی کر چکا تھا۔انہی شاگردوں میں سے ایک چرب زبان "ڈارک ہارس" کے طور پر مشہور میجر جنرل ضیاء الحق (1924/88ء)بھی تھا۔ایک نئے صدر کے سامنے حیران جنرل گل نے سوچنے کیلئے وقت مانگا ۔ پاکستانی فوج کی تازہ شکست کے بعد اس کے سربراہ کا عہدہ قبول کرنا کانٹوں کا ایک تاج تو ہو سکتا تھا مگر عزت کا باعث نہیں۔

ایک بار پھر ہم اپنے سابق کنوارے کمانڈر ان چیف C-in-C سے سنتے ہیں کہ اس صورتحال کو وہ خود اپنے الفاظ میں کیسے بیان کرتا ہے ۔اپنی یادداشتوں میں جنرل گل

حسن لکھتاہے۔

”12.00بجے مجھے میرے سٹاف افسر نے اطلاع دی کہ صدر پاکستان مجھ سے فوری ملنا چاہتے ہیں۔یہ سنتے ہی میرا خیال کل کی صورتحال کی طرف چلا گیا کہ میں کیسے یہ سب صدر کے گوش گزار کرسکوں گا۔یہی سوچتے سوچتے میں اپنی کار میں بیٹھ گیا۔اسی وقت جاویدناصر آیااور اس نے میرے ڈرائیور سے کہا کہ صاحب کو پنجاب ہاؤس لے جاؤ۔ میں نے جاوید سے پوچھا کہ صدر کو پنجاب ہاؤس میں کیا کام پڑگیا کہ وہ وہاں چلے گئے ہیں؟اس نے جواب دیا کہ مجھے صدر کے ملٹری سیکرٹری کا یہی پیغام ملا ہے بس۔یہ ایک نیا معمہ تھا کیونکہ صدر یا تو ایوان صدر یا پھراپنے سیکرٹریٹ میں ہوتاتھا۔پنجاب ہاؤس تو بس گورنر ٹھہرا کرتاتھا جب وہ پنڈی آتا۔

میں جب پنجاب ہاؤس پہنچا تو دونوں گیٹ بندتھے،گارڈ نے مجھے دیکھ کر گیٹ کھولا مگر میں نے دیکھا کہ وہاں بے شمار لوگ موجودتھے اور ڈرائیور کوگاڑی بڑھانے میں دقت ہورہی تھی۔تاہم جیسے کیسے میں سیڑھیوں تک پہنچا توملٹری سیکرٹری نے مجھے ایک کمرے میں جانے کو کہا ،میں وہا ں بھٹو کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

بھٹو اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھا اور مجھے گلے لگا تے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔جو مجھے اس وقت سچے لگے۔اگرچہ مجھے بعد میں پتہ چلا وہ مگرمچھ والے آنسو بہانے میں بھی ماہرتھا۔بھٹو نے فوری طورپر اپنا مدعا بیان کیا کہ وہ مجھے ملٹری چیف دیکھنا چاہتاتھا۔اس نے مجھے بتایا کہ یحییٰ خان اور حامد کو ہٹادیاگیا ہے۔میں اس صورتحال پر ششدر رہ گیا اور پوچھا کہ وہ کیسے اور کیونکر اس فیصلے پر پہنچا ہے!اس نے کہا کہ میں یحییٰ کی جگہ پاکستان کا صدر اور چیف مارشل لاایڈمنسٹریٹر بن چکاہوں۔میں نے بھٹو کوکہا کہ میں اس عہدے کا کسی طور طلبگار نہیں ہوں۔جب فوج کی سرحد سے واپسی مکمل ہو جائے گی تو میں چاہوں گا کہ ریٹائر ہوجاؤں۔میں نے جتنا کرنا تھا کرچکا۔ بھٹونے کہا کہ وہ میرے خیال اور ارادے سے متفق نہیں ۔تم میرے اچھے دوست ہو اور تم فوج کو اس کے پاؤں پر کھڑاکرنے کیلئے میری مدد کرو۔میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا فیصلہ کرچکا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ مجھ سے بہتر اور سینئر کئی اور ہیں جو آپ کی معاونت کیلئے تیار بھی ہوں گے۔

یہ بحث مباحثہ کافی دیر تک یونہی چلتا رہا جس پر میں نے کہا کہ مجھے سوچنے کے لیے کچھ دن چاہییں۔بھٹو نے انکار کرتے ہوئے کہا نہیں میرے پاس وقت نہیں ہے ،مجھے آج ہی قوم سے خطاب کرناہے۔جس کیلئے تمہاری تقرری ہی میری تقریر کا مرکزی نقطہ ہوگا۔میں نے کہا کہ مجھے اس بات سے غرض نہیں کہ تقریر کے مرکزی نکات کیاہوں گے،میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ قوم کو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم باتوں کی ضرورت ہے جنہیں سننے کیلئے وہ بے چین ہے۔بھٹو نے کہا کہ اسے میری ”نہ “نہیں چاہیے ۔ جس پر

میں نے دوچاردن کا وقت مانگا کہ مجھے سوچنے دیاجائے تاکہ میں اپنا ذہن تیار کر سکوں کہ کرنا ہے یا نہیں ۔ اس پر بھٹونے پھر سے مجھے ایک لمبا لیکچر دیا اور حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی ضرروت پر زور دیتے ہوئے مجھ پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔مجھے دوستی بھائی چارے سمیت کئی واسطے دیے۔میں مشکل کیفیت میں پھنس چکاتھا اور مجھے پتہ چل گیاتھا کہ میرا نکلنا اتنا آسان نہیں ۔میں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ مجھے سوچنے دو ،آدھے گھنٹے میں تمہارا منصوبہ کہیں نہیں چلا جائے گا۔بھٹو وہاں سے مجھے ساتھ ملحقہ ایک کمرے میں لے گیا۔میں وہاں جاکر بیٹھ گیا وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے چائے کا ایک کپ مل سکتاہے تو اس نے کہا ابھی لو۔

قریب چالیس منٹ کے بعد میں بھٹوکے کمرے میں گیا اور میں نے اسے بتایا کہ میں کچھ شرائط کے ساتھ اس عہدے پر کام کرنا قبول کر سکتاہوں۔پہلی یہ کہ میں اسی رینک پر کام کروں گا جو میرے پاس ہے یعنی لیفٹیننٹ جنرل،اس حقیقت کے باوجود کہ کمانڈر ان چیفC-in-Cبھی ایک فور سٹار جنرل ہی ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ اسے سرحدوں پر سے فوج کو واپس بلانا ہوگا۔یہ ہمارے قید ہوجانے والے فوجیوں کیلئے اچھا قدم ہوگا اور ان کی جس قدر جلد رہائی ہو سکے گی بہتر اور سود مندرہے گا ۔بھٹو نے کہا کہ وہ بھی انہی خطوط پر سوچ رہاتھا اور ان پر کام بھی کررہاتھا ۔آخری بات جو میں نے کہی وہ یہ تھی کہ اگر مجھے فوج کا انچارج بنایا جاتا ہے تو کوئی بھی میرے معاملات اور معمولات میں مداخلت نہیں کرے گا۔نہ خودبھٹواور نہ ہی اس کی کابینہ کا کوئی وزیر۔اس پر بھٹو مسکرایا اور کہا کہ یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر اس نے میرا انتخاب کیاہے۔بھٹو کی طرف سے میرے کمانڈر ان چیف C-in-C بننے کیلئے بتائی گئی پوزیشن پر اتفاق کے بعد میرے لئے اور کوئی رستہ نہیں بچا تھا کہ میں اقرار نہ کروں۔ میں وہاں سے واپس جی ایچ کیو(G.H.Q) چلا آیا۔میں اپنی تقرری پر خوش نہیں تھا مجھے کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ میں خود کو ٹوٹا پھوٹا محسوس کر رہاتھا ۔میں جو لے کر لوٹا تھا وہ میرا مطمع نظر تھا ہی نہیں۔مجھے اچھی طرح پتہ تھا کہ میں گلابوں کی سیج پر نہیں جارہاتھا کیونکہ فوج کو مشرقی پاکستان میں شکست ہو چکی تھی اور اس سے بھی بڑھ کر 19دسمبر کا واقعہ۔میں خود کو نیم مردہ‘ نیم شکستہ محسوس کر رہاتھا ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ہی اس عہدے کوسب سے زیادہ ناپسند کرنے والا شخص تھا“۔(28)

یہ انتہائی غیرمعمولی تاریخی لمحات تھے جو صاف اور سیدھے انداز میں کسی شک وشبہ کے بغیر یہ ثابت کرتے ہیں کہ مقبول قیادتوں کی سبھی قسمیں خواہ وہ اصلاح پسندہوں یامرکزیت پسند یاپھرانقلابی سوشلسٹ نعرے لگانے والے ،یہ ہر انقلابی موقع پر بورژوا ریاست اور نظام کے ساتھ مصالحت کر لیا کرتے ہیں۔

بھٹوکی واپسی سے پہلے ہی واشنگٹن ،نیویارک،کی بسکائن اور فلوریڈامیں یہ

منصوبہ تیار کرلیاگیاتھا۔ فوج کو اس کی مقبولیت سمیت بحال کیاجانا،سماج میں اس کی ساکھ کو دوبارہ معتبربنانا،یہ سب طے ہوچکاتھا اس کے باوجود کہ یہ اس قسم کے بدترین حالات میں پاکستانی حکمران طبقات کیلئے انتہائی مشکل ہدف تھا۔اس کیلئے ہرکولیس جیسی طاقت والا کوئی لیڈر ہی ہمت کر سکتاتھا اور یہ فریضہ بھٹو جیسا عوام کاہردلعزیز لیڈر ہی انجام دے سکتاتھا۔مقبولیت پسندی کی اس دواکو استحصال زدہ عوام کی بہتری کے پرجوش ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ملا کر،قوم پرستانہ پاکستانی تعصب کوبروئے کارلاکراور"انقلابی" اصلاحات کے ذریعے اس معجزے کو رونماہونے کے قابل بنادیاگیا۔پاکستان پیپلزپارٹی اور اس کی قیادت سے اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ایک بالشویک پارٹی کی تخلیق جو سماج کو انقلابی تبدیلی سے ہمکنار کرتی وہ بھی ایک طویل صبرآزما جدوجہد کے ذریعے،مارکسی کیڈروں کی تعلیم وتربیت کرکے،جہدمسلسل اور واقعات کی دہکتی ہوئی آگ میں فولاد کوکوئی شکل دے کر،یہ سب پاکستان میں موجود ہی نہیں تھا۔صرف یہ نہیں تھا کہ بھٹو نے فوج کو دوبارہ پائوں پر کھڑاہونے کے قابل بنایابلکہ اسے پاکستانی سماج کی تہوں میں پنپتے انقلابی جوش و جذبے کے ساتھ بھی نمٹنا تھا۔عوام اس کے باوجود بھی ایک تبدیلی کیلئے تڑپ رہے تھے۔ریاست کے اندرونی مسائل سے نبردآزماہونے کے بعد بھٹونے عوام الناس کی طرف توجہ دی۔

20دسمبر کی سرد رات کو اس نے قوم سے خطاب کیا"میرے عزیز ہم وطنو!میرے پیارے دوستو! میرے پیارے طالب علمو!مزدوروااور کسانو!وہ جو پاکستان کیلئے لڑے ۔۔میں بہت دیر سے اس مقام تک پہنچاہوں ،یہ پاکستان کی تاریخ کے فیصلہ کن لمحات ہیں۔۔۔ہم اپنے ملک کی زندگی کے بدترین بحران سے گزررہے ہیں،ہمیں اپنے ٹکڑوں کو چننا ہے،یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں ۔۔مگر ہمیں ایک نیا پاکستان بنانا ہے' ایک ترقی پسند خوشحال پاکستان ،استحصال سے پاک پاکستان،وہ پاکستان جس کا خواب قائد اعظم نے دیکھا تھا۔۔آپ کا تعاون مجھے ملا تو میں خود کو ہمالہ سے بھی بلند سمجھوں گا۔"(29)

"قائد عوام "کی سب پہلی تقریر میں سے ،جب وہ عنان اقتدارسنبھال چکاتھا ،"سوشلسٹ انقلاب" کا ذکر تک موجود نہیں تھا۔البتہ اس نے فوج کے مقام ومرتبے کی بحالی کا تذکرہ ضروری سمجھا۔"میں اپنے بہادر فوجیوں کو جو مشرقی پاکستان میں جنگ لڑے ہیں یہ بتاناچاہتاہوں کہ ہمارے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ہم آپ کی عزت نفس کی بحالی تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔اور یہ محض لفاظی نہیں۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔آپ کاگرنا ہمارا گرنا ہوگا۔میری اس بات کو یاد رکھیں کہ ہم سے جو کچھ بن پڑا ہم کر کے رہیں گے "۔(30)

اگرچہ بھٹونے محنت کشوں ، جدید پرولتاریہ میں‌خصوصاکراچی میں بہت سی

توقعات پیدا کر دی تھیں مگر ان کو اصلاحات سے مطمئن نہیں کیا جاسکا۔اس نے "انقلابی" اصلاحات کی بھرمار کردی تاکہ سماج میں کوئی تحریک نہ ابھر سکے لیکن وہ ایک بحران سے بھرپور نظام کے ہاتھوں ناکام ہونے سے نہیں بچ سکا۔ بائیں بازو کے انقلابیوں کا ایک حصہ جو مزدور تحریک میں متحرک تھا ،ابتدا سے ہی پیپلز پارٹی کے ساتھ جڑ گیاتھا اور اس کی بدولت پیپلز پارٹی کو **1970**ء کے الیکشن میں محنت کش طبقے کی طرف سے بھاری ووٹ پڑا۔مزدوروں کو توقع تھی کہ الیکشن کے دوران کیے گئے وعدے پورے کیے جائیں گے اور جب نئی حکومت قائم ہوئی تو ان کی طرف سے اصرار سامنے آنا شروع ہوگیا کہ وعدے پورے کیے جائیں۔پارٹی کے اقتدار کے وقت صنعت کی صورتحال کیاتھی،اس کا اندازہ خود حکومت کی اپنی شائع کردہ دستاویز سے لگایا جاسکتا ہے جو اس نے عوامی تشہیر کیلئے چھاپی تھی۔"ہڑتالیں ،دھرنے ،تالہ بندیاں عروج پرتھیں جن کی وجہ سے ساری صنعت متاثر ہورہی تھی اور پیداوار تقریباًرک گئی تھی۔پھر جب بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی' جس نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ دیا تھا یعنی انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ اورمزدوروں' کسانوں کی بہتری کا 'اقتدار میں آئی تو برسوں سے رکے عوام کے جذبات پھٹ پڑے"۔(**31**)

حکومت نے سبھی مالکان کو ہدایات جاری کیں جن میں ان سے کہاگیاتھا کہ وہ تحریک کے دوران ملازمتوں اورکام سے نکال دیے جانے والے محنت کشوں کو بحال کریں۔اس کے ساتھ ہی حکومت کی طرف سے محنت کشوں کیلئے مراعات کی حامل ایک نئی "جامع لیبرپالیسی"کے اجرا کی بھی نویدسنائی گئی۔ جب وفاقی وزیر محنت نے اس کااعلان کیا توپارٹی نے اس بات کو نظرانداز نہیں کیاتھاکہ یہ محنت کش ہی تھے جنہوں نے پارٹی کی کامیابی کیلئے بے شمار قربانیاں دی تھیں۔مگر دوسری طرف حکومت نے محنت کش طبقے میں پھیلے اضطراب سے ابھرتے تحریک کو بھانپتے ہوئے "لاء اینڈ آرڈ"کو تشویشناک قراردیا اور کہا کہ "دشمن کے ایجنٹ" مزدوروں کی صفوں میں گھس کر امن و امان کے مسائل پیدا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ مالکان کی تنظیمیں دھمکیاں دے رہی تھیں کہ اگر صنعتوں میں جاری انتشار کو بند نہیں کرایاگیا تو وہ کاروبار بند کر دیں گے۔ حکومت کاارادہ اور نئی لیبر پالیسی اس بیان سے ہی واضح ہوجاتی ہے جو نئی لیبرپالیسی کو جاری کرتے وقت جاری کیاگیا۔حکومت نے اس بیان میں اس امیدکا اظہارکیاکہ اب مزدور "گھیرائو" جیسی ناقابل برداشت کاروائیوں سے گریزکریں گے اور اب وہ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ آئندہ امن خراب کرنے کی ہر کوشش کے ساتھ ریاستی طاقت سے نمٹاجائے گا۔

فروری**1972**ء کو اعلان کی جانے والی لیبرپالیسی مزدورں کے عروج کو پہنچے ہوئے ولولے کا براہ راست جواب تھی ،اس کے ساتھ ہی یہ اس بات کی بھی عکاسی کرتی تھی کہ

حکومت مزدوروں کی طرف سے انتخابی مہم کے دوران کیے گئے تعاون کا بھی مداواکرناچاہتی تھی ۔یہ بدقسمتی ہے کہ اس لیبر پالیسی کے اثرات بجائے اس کے کہ محنت کشوں کو سہولت فراہم کرتے ،ان کی وجہ سے صنعتی تعلقات پر حکومتی پابندیوں کو اور بھی سخت کردیا گیا۔اس حقیقت کا ظہور اس وقت ہوا جب اس کے عملی نتائج سامنے آنے شروع ہوگئے۔**1972**ء کی لیبر پالیسی مزدوروں کی تسلی وتشفی کرانے کا اپنا مجوزہ ہدف پورا نہیں کر سکی یوں محنت کشوں کودوسرے رستے اور طریقے اختیار کرنے پر مجبور کردیا گیا۔

تصادم

مزدوروں کی سرگرم قیادت کا زیادہ ترحصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو **1968/69**ء کی انقلابی یلغارسے ابھرکر سامنے آئے تھے اور جنہیں بعد میں مالکان نے مارشل لاء کے جبر کی چھتری تلے ملازمتوں سے برطرف کردیاتھا۔صنعتی کاروائی شروع کردی گئی، نئی حکومت کے ابتدائی چھ ماہ اس صورتحال سے نمٹنے میں لگ گئے۔اس صنعتی کاروائی کا بنیادی مقصداپنے برطرف شدہ ساتھیوں کی بحالی اور ان تالہ بندیوں کا خاتمہ کرانا تھا جو حکومت کی ہدایات کے باوجود ابھی تک کی جارہی تھیں۔ ”مزدوروں کی طرف سے شروع ہونے والے اس ابھار کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ حکومت کو اپنے پہلے چالیس دنوں کے اندر ہی مزدوروں کی بڑی تعداد کو گرفتار کرناپڑگیا“۔(**32**) ”حکومت کی طرف سے لیبرپالیسی کے اعلان کے وقت حکومت کی سخت گیری میں صنعتکا روں کی طرف سے ڈالے جانے والے شدید دباؤنے اور بھی اضافہ کر دیاجب انہوں نے دھمکی دے دی کہ اگر لاقانونیت کو لگام نہ ڈالی گئی تو وہ سب کچھ بند کر دیں گے“۔(**33**)”مالکان کے مشترکہ موقف کا جواب دینے کیلئے چھ بڑی ٹریڈیونینوں نے مل کر سندھ ورکرز کنونشن منعقد کرانے کا اعلان کردیا۔ سندھ کی **75%**منظم ورك فورس کے نمائندے اور کراچی کے مزدوروں کی اکثریت کے منتخب نمائندے اس کنونشن میں شریک ہوئے“۔(**34**)اس کنونشن کا مقصدہڑتالوں پر پابندی جیسے ”مزدور دشمن اقدامات“کا مقابلہ کرنا تھا ۔بڑی لیبر فیڈریشنوں کایہ اکٹھ ،کراچی کے صنعتی علاقوں کے مزدوروں کے ساتھ اتحاد کی کوششوں کا ہی ایک حصہ تھا۔اس صنعتی علاقے کے کارخانوں کی یونینیں پہلے ہی کراچی مزدورایکشن کمیٹی کے تحت نچلی سطح تک منظم ہو چکی تھیں،سائیٹ کی ہریونین کے دو نمائندے اس کا حصہ تھے۔کراچی کے دیگر بڑے صنعتی علاقوں میں”لانڈھی کورنگی لیبر آرگنائزنگ کمیٹی“(**LKLOC**)پہلے ہی **1970**ء سے تشکیل پا چکی تھیں۔بڑی حد تک یہی مزدوروں کی حقیقی نمائندہ تنظیمیں ہی مزدوروں کے

مطالبات اور مفادات کیلئے جدوجہد کرتی چلی آ رہی تھیں۔لیبر فیڈریشنیں اور وائٹ کالر "آئوٹ سائیڈر"مزدور قیادت جو مزدور تحریک میں اپنی حیثیت کو برقرار یا مستحکم کرنا چاہ رہے تھے،انہیں ان سرگرم کارکنوں کے ساتھ شریک ہوناپڑگیا جو مزدورتحریک میں تیزی سے اہمیت حاصل کررہے تھے۔ اس سندھ ورکرز کنونشن میں غیر حاضر رہنے والی ایک بڑی لیبر فیڈریشن اپنے کارکنوں کی حمایت سے ہی محروم ہو گئی بعد ازاں وہ اپنے اس غلط فیصلے پر اڑ گئی اور مزدورتحریک کے جوش و جذبے کا ساتھ نہ دینے کی پالیسی پر ہی گامزن رہی۔

محنت کشوں اور انتظامیہ کے مابین ایک بڑا تصادم کراچی کے دوبڑے صنعتی علاقوں میں سے ایک سائیٹ میں پیش آیا ۔ 7جون1972ء کو پیش آنے والے اس تصادم میں تین مزدور ہلاک ہوئے ،پولیس نے ان پر گولی چلا دی تھی۔ تنخواہ والے دن تنخواہ نہ ملنے پرفیروز سلطان ٹیکسٹائل ملز کے ان مزدوروں نے فیکٹری کا گھیرائو کرلیاتھا۔"اگلے دن جب ہلاک ہونے والے ایک مزدور کے جنازے کا جلوس بنارس چوک پہنچا تو پولیس اورپیرا ملٹری فورسز نے اس پر گولی چلادی۔پولیس ذرائع کے مطابق اس کے نتیجے میں دس ہلاکتیں ہوئیں جن میں ایک خاتون اور ایک بچہ بھی شامل تھا"۔(35) اس ہولناک واقعے کے خلاف سائیٹ اور لانڈھی کے کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی جو 12دن جاری رہی۔فائرنگ کے اس واقعے کے بعد سرگرم دکانوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے رہنمائوں نے سائیٹ میں موجود مزدور کالونیوں میں ڈیرے ڈال دیے ۔ان کے ساتھ کچھ وائٹ کالر آئوٹ سائیڈر مزدور رہنمااور کچھ دوسرے انقلابی لوگ بھی، جو ایک مخصوص لیبر فیڈریشن کے نمائندے تھے، شریک ہو گئے ۔"حکومت نے اعلان کیا کہ وہ اسی مخصوص فیڈریشن کے نمائندوں کے ساتھ ہی مذاکرات کرے گی کیونکہ یہی صنعتی علاقوں کی صورتحال کو کنٹرول کیے ہوئے ہیں"(36) ریجنل کمیٹیاں قائم کی گئیں جن کواپنے اپنے علاقوں میں میٹنگیں کرنی تھیں جبکہ دو عام میٹنگیں روزانہ کرنے کا فیصلہ کیاگیا تاکہ تازہ ترین صورتحال سے آگاہی حاصل کی جا سکے۔"لانڈھی میں شروع ہونے والاتصادم ایک حکومتی مشین ٹول فیکٹری میں اجرتوں کے معاملے پر شروع ہوا۔یہ ہڑتال قریب کی سبھی ٹیکسٹائل ملوں میں پھیل گئی۔پیراملٹری فورسز نے ایک مل کی جانب بڑھتے ہوئے مزدورں پر بدترین تشدد شروع کر دیا ۔فائرنگ کے نتیجے میں چار مزدور ہلاک ہو گئے "۔(37) جب لانڈھی میں مزدور ہڑتا ل پر تھے ،پولیس نے" شرارتی اور فسادی لیڈروں "کی گرفتاری کیلئے صنعتی علاقے کے پیچھے واقع پہاڑیوں میں تلاش شروع کر دی جہاں لیبر کالونیاں واقع تھیں ۔ایک اور تصادم میں دواور مزدور اس وقت ہلاک جبکہ پچاس سے زائد زخمی کر دیئے گئے جب مزدور اپنی میٹنگ کررہے تھے۔اگرچہ حکومت نے لانڈھی اورسائیٹ میں ہلاک ہونے والے مزدوروں کے خاندانوں کوامدادی رقم فراہم کردی

تھی مگر مزدوروں کے مطالبات کا کوئی حل تو کیا ذکر تک کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا گیا ۔وزیر اعلیٰ سندھ نے فیکٹری مالکان کو اجازت دے دی کہ وہ ہر اس مزدور یاملازم کو برخاست کرسکتے ہیں جو اڑتالیس گھنٹوں کے اندر کام پر واپس نہیں آجاتا۔

”لانڈھی میں فوج طلب کر لی گئی اور اس واقعے میں ایک مزدور ہلاک ہوگیا ۔جبکہ دوسری طرف پولیس نے مزدوروں کو زبردستی ہانک کر فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور کردیا “ ۔(38) اکتوبر کے دوران سائیٹ کے سبھی مزدور لیڈروں کو گرفتار کرلیاگیا تھا تاکہ وہ صنعتی علاقوں میں کسی قسم کی ہڑتال یا سرگرمی نہ کرپائیں۔اکتوبر1974ء میں ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے حکومت نے اپنی پوزیشن کو اور بھی مضبوط کر لیا ۔اس آرڈیننس میں لیبر قوانین میں ترمیم کردی گئی تھی اور اسے صنعتکاروں کی طرف سے یہ کہہ کر خوش آئند قرار دیاگیا کہ” اسے بہت پہلے آجاناچاہئے تھا اور یہ کہ اس آرڈیننس کے ذریعے ملک میں صنعتی امن و امان کوفروغ ملے گا“ ۔(39) ”فروری1975ء میں وزیرمحنت نے وضاحت کرتے ہوئے کہاکہ اس آرڈیننس کا مقصد ٹریڈیونینوں پر نظر رکھنا تھا جو ٹریڈیونین سرگرمیوں کو حد سے زیادہ فروغ دینے میں ملوث ہو رہی تھیں۔آرڈیننس میں ان بدعنوان مزدورلیڈروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا عندیہ دیاگیاتھا جو اپنے مقاصد کیلئے صنعتی علاقوں میں بے چینی کو ہوا دیتے ہیں ۔ایسے مزدور لیڈروں کو نہ تو مزدوروں نہ ہی عوام کا دوست قراردیاگیااس لئے ضروری سمجھاگیاکہ اس قسم کے دشمن عناصر اگرغیر قانونی ہڑتالیں کرنے یا کرانے کی کوشش کریں تو انہیں سخت سزا دی جائے ۔(40)

تجزیہ

کسی بھی پرولتاری انقلاب کو کئی مرحلوں سے گزرناپڑتاہے۔کئی اتار چڑھائو ‘ نشیب وفراز اس کا لازمی خاصا ہواکرتے ہیں۔تاریخ کے مختلف اوقات میں ان انقلابات کے کئی رنگ روپ سامنے آیا کرتے ہیں۔کئی مختلف عناصرو عوامل ان انقلابات کو متاثر کرتے ہیں۔تاریخ ،ثقافت،سماجی و معاشی ترقی کی جہتیں، یہاں تک کہ اس ملک کی آب وہوا جہاں یہ انقلاب رونما ہورہاہوتا ہے ،یہ سب مل کر انقلابی تحریک پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں ۔اور پھر ایک اہم عنصر وقت کا بھی ہوا کرتا ہے جس سے وہ انقلابی ابھار گزر رہاہوتاہے۔کچھ انقلابی تحریکیں معمولی اتارچڑھائوکے ساتھ سالوں تک بھی جاری رہ سکتی ہیں جبکہ کچھ انقلابی ابھار ہفتوں میں ہی اپنی دھماکہ خیزشدت کے ساتھ سامنے آجایاکرتے ہیں۔پاکستان میں 1968/69ء کے انقلاب کی توانائی کا بڑا ذریعہ سیاسی طورپر تازہ دم نوخیز پرولتاریہ کی طاقت تھی جس پر کسی قسم کی اصلاح پسند انہ

ٹریڈیونین یا سیاسی پارٹی کا سایہ تک بھی نہیں پڑا تھا۔لیکن پھر یہی انقلابی ابھار ایک اور اذیت سے بھی گزرا ،ایک خالص مارکسی قیادت اور انقلابی تنظیم کی غیرموجودگی کی اذیت سے۔

انقلاب کی تکمیل کیلئے ایک واضح پروگرام ،تناظر،درست نظریات ،لچکدار حکمت عملی و طریق کار اور سب سے بڑھ کر ایک جراتمند حوصلہ مند قیادت کی حامل پارٹی کی ضرورت ہواکرتی ہے۔ اس کی سب سے درخشندہ اور زندہ مثال لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں تشکیل پانے والی بالشویک پارٹی ہے۔1917ء کے انقلاب کے دوران لکھی جانے والی اپنی شاندار کتاب"ریاست اور انقلاب"میں لینن ایک قبل از انقلاب صورتحال کی نشاندہی واضح الفاظ میں کرتا ہے ۔سب سے پہلی کیفیت یہ کہ حکمران طبقہ تقسیم اورٹوٹ پھوٹ کاشکار ہوتاہے اورماضی کی طرح سے حکمرانی کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ دوسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ درمیانہ طبقہ متذبذب ہوتا ہے اور یہ کبھی حکمران تو کبھی مزدور طبقے کی طرف ڈول رہاہوتا ہے۔تیسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مزدور طبقہ سرگرم اور تبدیلی کیلئے ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار ہوتاہے۔اور آخری مگر سب سے اہم کیفیت ایک انقلابی تنظیم' ایک انقلابی قیادت کا موجودہونا ہے جو خود کو مزدور طبقے اور اس کی تحریک سے وابستہ رکھتے ہوئے لڑائی کو اس کے انجام تک لے جاتی ہے۔

لینن کی یہ شرائط اور کیفیات 1968/69ء کے انقلاب کی صورتحال میں درست ثابت ہوئیں۔معیشت اور سماج کے بحران نے حکمران طبقات میں تضادات ابھار کر ان کو تقسیم کر دیاتھا۔ یہاں تک کہ ناقابل فتح سمجھے جانے والے ایوب خان کے اپنے ہی ساتھی اس کے خلاف ناقابل مصالحت بغاوت پر اتر آئے تھے اور اسے چھوڑگئے تھے۔مغربی پاکستان میں اپنے جبرواستبداد کیلئے بدنام، ایوب کا چہیتا گورنر جو ہر وقت ایوب کا دم بھرتارہتاتھا،چھوڑکر چلاگیا جو ایوب حکومت کیلئے ایک بڑا دھچکا تھا۔یہاں تک کہ ایوب اوربھٹو کے مابین1966ء میں پیداہونے والا تنازعہ بھی حکومت اور حکمران طبقے کی کمزوری اور تصادم کی ہی نشاندہی کرتاتھا۔نیچے سے جنم لینے والی بے چینی ان تضادات کو اور بھی بڑھاوا دے رہی تھی۔امریکیوں سمیت سرمائے کے سبھی حکمت ساز اس صورتحال سے خوفزدہ تھے اور اس سے نمٹنے کیلئے ہاتھ پائوں مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بحران سماج کی ہر سطح پر پھیل چکاتھا اور ہر پرت کو اپنی لپیٹ میں لے رہاتھا۔یہ سب سے پہلے طالب علموں میں سے ظاہرہوا جو کہ خود اپنے اندر درمیانے طبقے کے اضطراب کی انتہاکا ہی عکاس تھا۔ ڈاکٹر'انجینئر اور دوسرے پیشوں سے وابستہ بے روزگار حکومت کے خلاف مزاحمت میں پیش پیش تھے۔ ایوب حکومت میں ہونے والی صنعت کاری اور شرح ترقی میں اضافہ کسی قسم کا روزگار پیدا کرنے سے قاصر تھا۔یہاں

تک کہ یہ ترقی پیشہ ورانہ قابلیت کے حامل درمیانے طبقے کی نچلی پرت کے سفیدپوش محنت کشوں کو بھی کھپانے سے محروم تھی۔مرکزی شہروں اور بڑے قصبوں میں سائنس اور آرٹس کے مختلف مضامین کے ڈگری یافتگان نے چوکوں اور چوراہوں میں اپنی ڈگریاں جلانا شروع کر دی تھیں۔سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف درمیانے طبقے کی طرف سے یہی سب سے بڑااورشدیداحتجاج تھا‘اس طبقے کی بے چینی اپنی انتہائوں کو پہنچ چکی تھی اور کئی شکلوں میں پھٹ کر سامنے آرہی تھی۔اور بالکل یہی ہر انقلاب میں ہواکرتا ہے کہ درمیانہ طبقہ نظام کے خلاف اپنا غم وغصہ اتارنے کیلئے محنت کش طبقے کے ساتھ آملتا ہے کیونکہ انہیں کوئی رستہ نظر نہیں آرہاہوتا۔اس سے تحریک کو مزید قوت اور تیزی میسرآجاتی ہے اور اس کے اعتماداور حوصلے میں اضافہ ہوتاچلاجاتاہے۔

مگر سب سے بڑھ کر سب سے زیادہ قوت اور جرات کا مظاہرہ محنت کش طبقہ خود ہی کیا کرتا ہے۔ انہی کی صلاحیت اور جذبہ ہی تحریک کو انقلاب میں بدلنے کا باعث بنتاہے۔ہم پچھلے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ انقلابی ابھار سارے ملک کو اپنی گرفت میں لے چکاتھا۔یہاں تک کہ پاکستان کے انتہائی دوردراز علاقے بھی انقلاب سے متاثر ہوچکے تھے۔سندھ کے دوردراز علاقوں سے لے کر پختو نخواہ تک کسانوں کی بے شمار اور بے مثال تحریکیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔زرعی اشرافیہ کے پائوں تلے سے ہی نہیں ان کے قبضے سے بھی زمین نکل چکی تھی۔ان کا جبرواستبداد‘ رعب و دبدبہ‘ شان وشوکت سب سرکش کسانوں نے روند ڈالاتھا۔یہی اس عہد کا وہ زندہ اور طاقتور کردار تھا کہ جس نے مزدور قیادت کو ایسی طاقت سے بھر دیا جس کا وہ عام دنوں میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ان میں وہ قوت پیداہوگئی جس نے ناممکن کو ممکن میں بدل دیا۔کارخانوں پر قبضے،پہیہ جام کے ذریعے سارے ملک کی حرکت کو روک دینا یہ سب ایسے واقعات تھے جو شاید کتابوں یاپھرکسی پرانے انقلاب کی کسی داستان کا ہی حصہ ہواکرتے تھے۔

’’کسی بھی ہڑتال کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے محنت کش طبقے کو یہ احساس ہوجائے کہ وہ بھی سماج کی ایک زندہ اور موثرقوت ہے۔ایک عام ہڑتال اس آگہی کا سب سے بڑا اظہارہوتی ہے۔لینن ایک جرمن گیت کا یہ فقرہ اکثر گنگنایاکرتاتھا کہ’’اگرتمہارے آ ہنی ہاتھ رك جائیں تو دنیا کی یہ ساری حرکتیں رك جائیں‘‘۔ایک ہڑتال کی کیفیت میں خاص طورپر جب یہ عوام کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے،مزدور اپنے اندر ایک بے پناہ طاقت محسوس کرتے ہیں۔ہڑتال عوامل کو معتدل کردیا کرتی ہے،یہ جدید محنت کشوں کی جدید ترین پرتوں کو سیاسی طورپردوسری باشعورپرتوں کے ساتھ جوڑ کر انہیں باہم پیوست کردیتی ہے۔جو عمومی حالات کے عین وسط میں سے ابھر کر عمل میں آرہے ہوتے ہیں‘‘۔(41)

ہاں ان دنوں ہلاکتیں بھی ہورہی تھیں ،تشدد بھی ہورہاتھا اور بھی بہت کچھ ہورہاتھا مگر یہ تاریخ کے ہر انقلاب کے ساتھ جڑے واقعات ہواکرتے ہیں۔لیکن پھر اس کی سب سے بڑی وجہ ایک انقلابی پارٹی کا نہ ہوناتھا۔یہ ہوتی تو یہ تحریک کے جوش و جذبے کو منظم بھی کرتی اورمرتب بھی۔انقلاب کسی لگے بندھے ضابطے یا ریت ورواج کے ساتھ نہیں ابھرا کرتے ۔یہ کسی موسیقار کی ترتیب دی ہوئی دھن پر کام کرنے والا آرکسٹرا نہیں ہواکرتا۔یہ طاقتوں کا ایک زندہ کھیل ہوتا ہے،یہ تودو ملکوں کے مابین ہونے والی جنگ سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔ 1968/69ء کا انقلاب اس طاقت اس شعور' اس صلاحیت کی زندہ و تابندہ مثال بن کر سامنے آیا جس کی بدولت محنت کش طبقہ سماج کو بدل کے رکھ دیتاہے۔گلیوں میں ، کارخانوں میں ،کھیتوں کھلیانوں میں انہوں نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ جب یہ دبی ہوئی مخلوق انقلابی جذبے سے لیس اور سرشارہوجاتی ہے تو یہ معجزے دکھانا شروع کر دیتی ہے۔اور یہ اس نے پاکستان جیسی خود ساختہ مذہبی مملکت کے اندر کر کے دکھادیاتھا۔

اپنے عمل میں ایک انقلاب محنت کش طبقے کیلئے ایساسکول ہوتاہے جہاں سے وہ فیصلہ کن اسباق سیکھتاہے۔1968/69ء کے انقلاب کے دوران پسماندہ 'ان پڑھ گنوار یہ سیکھ گئے کہ کیسے منظم ہوا جاتا ہے۔کیسے بحثیں کی جاتی ہیں اور کیسے انقلاب کو جوش جذبے کے ساتھ آگے بڑھایاجاتاہے۔وہ چندگھنٹوں میں محاصرے کرنا ،احتجاج کو منظم کرنا،آگے بڑھ کر لڑنا اور ریاستی حملوں سے خود کو بچانااورپھر ازسرنو منظم ہوکر متحرك ہوناسیکھ گئے۔بڑے بڑے عوامی مظاہروں میں طبقاتی یکجہتی کی ایسی روح پیداہوچکی تھی جس کی نظیر پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے کی طرف بڑھتے لوگ،ایک ہاتھ کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا،کسی مسلمان کا ہاتھ ہے یا عیسائی کا۔ مذہب ،جنس،قوم،نسل ،رنگ،زبان، قبیلہ،یہ سب تعصبات انقلاب کی اس جدوجہد کی دہکتی آگ میں جل کر راکھ ہو چکے تھے۔سرخ بینر،سرخ جھنڈے اور سرخ پگڑیاں ہر طرف سرخ ہی سرخ رنگ دکھائی پڑتا تھا۔ یہ کسی اور ملک کی نہیں بلکہ ایک پسماندہ رجعتی ملک پاکستان کی داستان ہے جہاں کے عام مردوزن" سرخے "ہونے پر فخر کرنے لگ گئے تھے۔سرخوشی اور تفاخر کایہ ایک ایسا جنون بن چکاتھا جس کا ذائقہ پاکستان کے محروم عوام نے ان انقلابی واقعات سے پہلے کبھی نہیں چکھاتھا۔

مگر اس جدوجہد سے درست نتائج اخذکرنے اورانقلاب سے حقیقی اسباق مرتب کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس انقلاب کی نظریاتی اساس کو سمجھا جائے۔ عوام کی نفسیات سے جھلکنے والی اصولی تبدیلی کو پرکھا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ سمجھا جائے کہ وہ کیاتھا جسے وہ پانا اور حاصل کرناچاہ رہے تھے؟اس جستجو اس لگن میں ایک

قطرہ تک بھی یاسیت کا نہیں تھا، مایوسی کاایک اونس بھی ان کے مزاج اور جذبے میں شامل نہیں‌تھا ۔جوں جوں ریاست کا جبر و استبداد بڑھتاگیا، انقلاب کا نالہ اور بھی چڑھتا چلا گیا۔ نظام کے خلاف عوام اوربھی پرجوش ہوتے چلے گئے۔

نوجوانوں،طالب علموں‌نے بسوں اور ٹرینوں کے کرائے دینے سے انکار کر دیاتھااور انتظامیہ کسی طور ان کو کرایہ دینے پر مجبور نہیں کر سکی۔بڑے شہروں میں کرائے کے مکانوں میں رہائش رکھنے والوں نے کرائے دینے سے انکار کردیاتھا۔ مزدوروں نے کارخانوں پر اور کسانوں نے زمینوں پر قبضے کر لیے تھے۔یہ سب کیاتھا !یہ عوام کی طرف سے رائج الوقت پیداواری رشتوں کو تسلیم کرنے سے انکار تھا۔اور یہ طے ہے کہ ایک جمہوری انقلاب میں کبھی بھی ملکیت کے رشتوں کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔صرف ایک سوشلسٹ انقلاب ہی کا یہ اولین فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سرمایہ دارانہ یا جاگیردارانہ نظام میں نجی ملکیت کے مقدس حق کو چیلنج کرتاہے۔مروجہ پیداواری رشتوں کے خلاف بغاوت ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو 1968/69ء کے انقلاب کے سوشلسٹ کردارکو ظاہر کرتاہے۔

جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ لینن کی 1917ء میں بیان کردہ قبل از انقلاب کیفیات یہاں موجود تھیں‌مگر 1968/69ء کے انقلاب کا ایک المیہ یہ تھا کہ موضوعی عنصر موجود نہیں تھا ،وہ عنصر جسے انقلاب کو سوشلسٹ انقلاب میں بدلناتھا۔انقلابات روز روز برپانہیں ہواکرتے ۔معروضی صورتحال کے ساتھ موضوعی عنصر کی موجودگی فیصلہ کن ضرورت ہواکرتی ہے۔معروضی صورتحال مسلسل بدل رہی ہوتی ہے۔مگر جب عوام کا شعور سماج کو بدلنے کی جستجو میں اجتماعی جدوجہدکا رستہ اختیارکرتا ہے تو ایسے میں موضوعی عنصر کی موجودگی ضروری ہوجایاکرتی ہے تاکہ تحریک کو تبدیلی کی طرف گامزن کرنے میں مہمیز دی جاسکے ،تاکہ معروضی صورتحال میں مداخلت کی جا سکے اور اسے اس قابل بنایا جا سکے کہ یہ اپنے انقلابی جذبے سے مروجہ نظام کو اکھاڑ کر پھینک سکے۔معروضی صورتحال اور موضوعی عنصر کو ایک جدلیاتی ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہوئے سوشلسٹ فتح کے حصول کیلئے انقلاب کو طاقت اوررہنمائی فراہم کرناپڑتی ہے۔اس ہم آہنگی اور ساتھ کے بغیر ایک کامیاب انقلاب کا نتیجہ حاصل نہیں کیاجاسکتا۔

ایک انقلابی نتیجے کیلئے درکار معیاری تبدیلی کے حامل اس تاریخی عمل پر ٹراٹسکی نے 1928ء میں لکھا تھا:

”یہ ایک روایتی منشویک حیلہ سازی ہے کہ قیادت کی غلطیوں‌پر پردہ ڈالنے کیلئے ہر الزام عوام کے سر تھوپ دیاجائے یا پھر عمومی طورپر قیادت کے کردار کی اہمیت کو کمتر ثابت کیاجائے ۔یہ محض اپنے احساس گناہ سے بچنے کا ہی ایک وطیرہ ہوتا ہے۔یہ بنیاد ی طور پر اس وقت ہوتاہے جب آپ بالائی ڈھانچے کی جدلیاتی سمجھ بوجھ کی

اہلیت سے محروم ہوتے ہیں یعنی اس طبقے کے بالائی ڈھانچے کی جسے پارٹی کہتے ہیں' اس پارٹی کے بالائی ڈھانچے کی جو مرکزی قیادت کی شکل میں ہوتا ہے۔ایسے عہد بھی ہوتے ہیں جب مارکس اور اینگلز جیسے عظیم انسان بھی تاریخی ترقی کے عمل کو ایک انچ بھی آگے نہیں لے جاسکتے اور ایسے بھی ادوار ہوتے ہیں جب بہت معمولی سطح کے فرد بھی تاریخ کے دھارے کو کئی سالوں تک روکے رکھتے ہیں۔ ایک پرولتاری انقلاب کو کئی مشکلات درپیش ہوا کرتی ہیں،ان میں سے ایک خاص' ٹھوس' مشکل' مخصوص ہوا کرتی ہے۔یہ واقعات کے کسی اہم ترین موڑ پر انقلابی قیادت کے اہداف اور نقطہء نظر میں سے ظاہر ہوتی ہے۔یہاں تک کہ انتہائی انقلابی پارٹیاں نئے درپیش فرائض او ر چیلنجز کو دیکھ کر پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ماضی کے نعروں کو ترجیح دینے پر ہٹ دھرم ہو جایا کرتی ہیں۔(42)

روس کے **1917**ء کے کامیاب انقلاب اور پاکستان کے **1968/69**ء کے ناکام رہ جانے والے انقلاب سے ہم ایک انتہائی قیمتی سبق حاصل کر سکتے ہیں اور وہ سبق ہے معروض اور موضوع کے ملاپ کا فیصلہ کن ہونا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اصلاحات کی ناکامی کے بعد حکمران طبقات کو جنگ کا خونی کھیل کھیلنا پڑگیا اور پھر جیسا کہ کہاجاتاہے کہ انقلابات جنگوں کی کوکھ سے جنم لیاکرتے ہیں ۔تحریک اگرچہ ایوب کی رخصتی کے بعد کسی حد تک تعطل کا شکارہوگئی تھی تاہم جنگ کے بعد پھر جدوجہد نئی شکلوں میں سامنے آگئی ۔جنگ کے بعد جب فوج کے اندر سرکشی اور بغاوتیں ہورہی تھیں،اسی وقت کراچی میں جدید پرولتاریہ اور دیگر صنعتی علاقوں میں نظام کے خلاف جدوجہد پھر عروج کو پہنچ گئی تھی۔**1971**ء کی ابتدا سے انتہاتک پاکستان پے درپے تحریکوں کی زد میں تھا۔مگر اس دوران تحریک محنت کشوں کی باشعور پرتوں سے کٹی ہوئی تھی۔ **25**مارچ**1969**ء کے بعد رونماہونے والے واقعات کو کسی بھی انقلاب کے دوران دیکھا جا سکتا ہے۔پچھلی حکومت کے جانے پرعوام خوشیاں منا تے ہیں،ایک ہمہ گیر خوشی کا احساس جاگزیں ہوجاتاہے،مردوزن نئی حاصل کردہ آزادی کا جشن مناتے ہیں۔یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جسے جمہوریت کی خوش فہمی کہاجاتاہے جب لوگ خوشی میں مست ہوجایا کرتے ہیں اور جھومتے گاتے ہوئے آزادی اور امیدکے ایسے احساس میں کھوجاتے ہیں جس کی کوئی حد 'کوئی سرحد نہیں ہوتی۔لیکن افسوس تہوارکا یہ روح پرور لمحہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔خوش فہمی کا عارضی لمحہ گزرتے ہی مایوسی کا دور جھنجھلاہٹ کی شکل میں حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔او رپھرشیکسپیئر کے میکبتھ کی طرح کف افسوس ملتے ہوئے کہاجاتاہے کہ" ہم نے سانپ کو مارا توتھا مگر اسے ہلاک نہیں کر سکے تھے"۔

بتدریج عوام میں یہ خیال تقویت پانا شروع کردیتاہے کہ سب دکھاوا ہے' سب

تقریریں ہیں' بدلا کچھ بھی نہیں ۔صرف انداز واطواربدلے ہیں باقی سب ویسے کا ویسا' وہی کا وہی ہے۔آقا بھی وہی ہیں اورہمارے مسائل بھی ویسے کے ویسے ہیں۔مایوسی اور جھنجھلاہٹ کی یہ لہر یکدم ہی سارے عناصر کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی ۔یہ سب سے پہلے عوام کی سب سے باشعور پرتوں میں اپنی جگہ بناتی ہے ۔جنہیں یہ احساس کھانا شروع کردیتاہے کہ اتنی قربانیوں اورجدوجہد کے بعد حاصل ہونے والی طاقت ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہے۔سب سے پہلے یہی ہڑاول پرت حوصلہ ہارتی ہے اور کسی بھی انقلاب کیلئے یہ ایک انتہائی خطرناك لمحہ ہوتا ہے۔کیونکہ یہ ہراول پرت ہی ہوتی ہے جو عوام سے زیادہ معاملات اور واقعات کو سمجھنے کی اہل ہوتی ہے۔اس لئے بے صبری کا مظاہر کرتے ہوئے یہ فوراًسے پیشتر کچھ کرنے کو مائل ہوجاتی ہے۔یہ لازمی ہوتا ہے کہ سماج کے باقی حصوں کو جیتا جائے جو پست رو ہوتے ہیں اور اس طرح سے نتائج اخذ نہیں کر رہے ہوتے۔اگرہراول پرت پیچھے ہٹتی اورعوام سے اپنا ناتا توڑدیتی ہے تو یہ تنہا ہو سکتی ہے اور پھر ردانقلاب اسے کاٹ بھی سکتا ہے۔

پیپلز پارٹی کی نئی حکومت اصلاحات کے عمل اور مخصوص نوعیت کے استحصال کے ساتھ کام چلا رہی تھی۔1974ء تک تحریک مکمل طورپر تحلیل ہو چکی تھی۔ہر طرف مایوسی وبابن کر پھیل گئی تھی ۔انفرادیت اور خود غرضی سماج کی نفسیات پر پھر سے حاوی کر دیے گئے تھے۔دہائیوں میں تیار ہونے والا انقلابی موقع ضائع ہو چکاتھا۔عوام کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ آنے والی دہائیوں کی سختیوں اور ذلتوں کا طوق عوام کی گردن میں ڈال دیاگیا۔آخری تجزیے میں ایک انقلابی پارٹی اور ایک واضح مارکسی قیادت کی غیر موجودگی واحد وجہ تھی کہ یہ انقلاب ناکام و نامراد رہااور یہی 1968/69ء کے انقلاب کا سب سے اہم اورسب سے قیمتی سبق ہے۔

پارٹی اور عوامی تحریک کے مابین تعلق کے سوال کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ یہ مارکسزم کے مکمل سائنسی پروگرام اور عوام کی لازمی طور پر نامکمل اور تضادات سے بھرپور تحریک کے درمیان فرق کا تعلق ہے۔ آج کی نسل کو ایک مارکسی انقلابی پارٹی کی تعمیر کی فیصلہ کن اہمیت کے سبق کو نہ صرف سیکھنا بلکہ جذب کرنا ہے۔ایک اور68/69ء اس نسل کا منتظر ہے اور یہ انتظار اتنا طویل بھی نہیں ہے اس بار موضوعی عنصر ہی وہ فیصلہ کن عنصر ہوگا جو انقلاب کو اس کے حقیقی اور منطقی انجام تک لے جاسکے گا اور پھر اس بار جو جدوجہد ہوگی وہ صرف ایک نسل کی نہیں بلکہ وہ تہذیب اور انسانیت کی بقا کی جدوجہد ہوگی۔

نوٹس

1۔ پاکستان کے کلیدی معاشی منصوبہ دان کی حیثیت سے سب سے لمبا وقت گزارا۔ 1957ء میں پلاننگ کمیشن پاکستان سے وابستہ ہوئے۔پاکستان کے قیام کے پہلے پچاس سالوں میں سے چالیس سال تک اکثر حکومتوں میں پلاننگ کمیشن کے چیف، وزیر خزانہ اور اہم معاشی منصوبہ دان رہے۔

یہ اقتباس ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک، (آکسفورڈ)، صفحہ 269سے لیا گیا ہے۔

2۔ ایوب خان، ایوب خان کی ڈائری72-1966ء ، (آکسفورڈ)، صفحہ548-547

3۔ ڈان ، 11اپریل1969ء

4۔ ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک، (آکسفورڈ)، صفحہ65

5۔ صنعتی تعلقات کے آرڈیننس (IRO)1969ء کا تعارف

6۔ صنعتی تعلقات کا آرڈیننس (IRO)1969ء، سیکشن 26تا 32

7۔ ظفر شہید، پاکستان میں مزدور تحریک، (آکسفورڈ)، صفحہ268

8۔ ڈان 12جنوری 1972ء

9۔ ڈان 6جنوری 1972ء

10۔ امروز (لاہور)، 20ستمبر 1969ء؛ پاکستان آبزرور21ستمبر 1969ء

11۔ مساوات 22جولائی 1970ء

12۔ کومبیٹ کراچی، 28مارچ 1970ء

13۔ پاکستان ٹائمز10اکتوبر 1969ء

14۔ جنرل اکبر خان کو1957ء میں بھی راولپنڈی سازش کیس میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے دوسرے راہنماؤں کے ساتھ سزا دی گئی تھی، جن میں بائیں بازو کے مشہور شاعر فیض احمد فض بھی شامل تھے۔ انہیں بعد میں مختلف عرصوں کے دوران قید و بند کی سزائیں دی گئیں

15۔ پاکستان ٹائمز،14نومبر 1969ء

16۔ دہقان لاہور، جلد1 ٗشمارہ 2، 13ستمبر 1971ء

17۔ پاکستان ٹائمز، 26مارچ 1971ء

18۔ وہ میدان جہاں 8ویں صدی عیسویں میں اسلام کے آغاز میں غزوات لڑی گئیں۔

19۔ میجر جنرل(ریٹائرڈ) حکیم ارشد قریشی، پاک ہند جنگ، (آکسفورڈ)، صفحہ 91,92
20۔ ایضاًصفحہ 95
21۔ گیون ینگ، آبزرور، لندن ، 19دسمبر 1971ء
22۔ لیفٹننٹ جنرل (ریٹائرڈ) گل حسن، لیفٹننٹ جنرل گل حسن خان کی یادداشتیں، (آکسفورڈ)، صفحہ 275,313
23۔ ایضاًصفحہ 339-346
24۔ لیون ٹراٹسکی، عبوری پروگرام، صفحہ 17
25۔ ہنری کسنجر، وائٹ ہائوس میں گزرے سال، (انگریزی)، صفحہ 907
26۔ ایضاًصفحہ 907-8
27 ۔ تاثیر، بھٹو، صفحہ 130
28۔ لیفٹننٹ جنرل (ریٹائرڈ) گل حسن، لیفٹننٹ جنرل گل حسن خان کی یادداشتیں، (آکسفورڈ)، صفحہ 347-351
29۔ ذوالفقار علی بھٹو، قوم سے خطاب، 20دسمبر 1971ء، ذوالفقار علی بھٹو کی تقریریں اور بیانات،جلد 1، 20دسمبر 1971 ء تا 31مارچ 1972ء (کراچی: حکومت پاکستان 1972ء) ، صفحہ 1-16، اقتباس صفحہ 1
30۔ ایضاًصفحہ 17
31۔ پاکستان باتصویر75-1973ء
32۔ ڈان 30جنوری 1972ء
33۔ ڈان 21تا 25مئی 1972ء
34۔ ڈان 30مئی 1972ء
35۔ ڈان 9جون 1972ء
36۔ ڈان 13جون 1972ء
37۔ ڈان 19اکتوبر 1972ء
38۔ ڈان 2نومبر 1972ء
39۔ ڈان 15اکتوبر 1974ء
40۔ ڈان 3فروری 1975ء
41۔ ایلن وڈز، بالشوازم راہ انقلاب،(انگریزی) صفحہ 211
42۔ ٹراٹسکی، لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل ، صفحہ 73

بائیں بازو کی قیادت کا بحران
پاکستان پیپلزپارٹی کا ابھار

”وہ جو انقلاب کو نامکمل اور ادھورا چھوڑتے ہیں،وہ اپنی قبرخودہی کھودتے ہیں۔“

(لوئی ڈی سینٹ جسٹ)(1)

”میں اس آزمائش میں اس لیے مبتلا ہوں کیونکہ میں نے ملک کے شکستہ ڈھانچے کو پھر سے جوڑنے اور متضاد ومتحارب طبقات کے مابین ایک آبرومندانہ اور منصفانہ مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ایسا معلوم ہوتاہے کہ اس فوجی بغاوت کا سبق یہ ہے کہ ایسی ہر مصالحت محض ایک یوٹوپیا' ایک دھوکہ ہے۔فوجی بغاوت ثابت کرتی ہے کہ طبقاتی کشمکش ناقابل مصالحت ہے۔اس میں ایک طبقے کی جیت دوسرے طبقے کی شکست بن جایا کرتی ہے،یہی نوشتہ دیوار ہے“۔

ذوالفقار علی بھٹو(1979-1928)(2)

پاکستان کا بایاں بازو پہلے ہی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکی طرف سے قومی آزادی کی جدوجہد کے عمل میں شدید جھٹکوں اورپھر بٹوارے کے المیے سے دوچارہوچکاتھا۔پاکستان میں نئی حکومت نے بائیں بازو پر شدیدحملے شروع کردیئے تھے۔چین روس کے مابین پیداہوجانے والے تنازعے نے پاکستان کے بائیں بازو میں رہی سہی یکجہتی کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ 1960ء کی دہائی میں بائیں بازو کی پارٹیوں کے مابین اختلافات کو روس چین کے تنازعے نے ا ور بھی پیچیدہ کردیا۔اگرچہ ان دونوں کے مابین کوئی حقیقی نظریاتی سیاسی اختلافات اور تضادات نہیں تھے بلکہ یہ سب محض ماسکو اور پیکنگ سے ملنے والی ہدایات کی اندھی تقلیدکے سواکچھ بھی نہیں کررہے تھے۔اور یہ ہدایات ان سٹالنسٹ گروپوں یہاں تک کہ بڑی بڑی کمیونسٹ اورسوشلسٹ پارٹیوں سے اپنی اپنی خارجہ پالیسیوں پر عملدرآمد کرانے کے سواکچھ بھی نہیں ہوتی تھیں۔1964ء میں کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے ان دونوں ملکوں کے مابین تنازعات اور نوآبادیاتی انقلاب کے موضوع پر ایک مارکسی تجزیہ و تناظر تحریرکیاتھا۔جس میں اس نے ان حقیقی ”نظریاتی“ تضادات اور ان کی وجوہات کا تفصیل سے تجزیہ کرتے ہوئے ان کے نوآبادیاتی انقلاب پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں لکھا :

”اس پھوٹ کے بارے میں”نظریاتی“ توضیحات پیش کرنے کا واحد مقصد اپنے لیے عالمی سطح پر کمیونسٹ پارٹیوں کے اندر سے زیادہ سے زیادہ حمایت کا حصول ہے۔اس وقت چینی زیادہ انقلابی نعروں کا آسرا لے کر عالمی سٹالنسٹ تحریک میں روس کے خلاف اپنے لیے حمایت حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔خاص طور پر یہ نوآبادیاتی ممالک کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔چونکہ اس وقت وہ انقلابی نعرے اپنائے ہوئے ہیں ،اس لیے وہ سٹالنسٹ پارٹیوں میں سے ان لوگوں کی توجہ حاصل کرتے جارہے ہیں جو کہ انقلاب کا رستہ تلاش کررہے ہیں“۔

”دونوں ملکوں کی سٹالنسٹ افسرشاہی کے مابین قومی بنیادوں پر ہونے والی اس پھوٹ نے دنیا بھر میں عوام کی وسیع پرتوں میں الجھائوکو شدید کرکے رکھ دیاہے۔یہاں تک کہ انقلابی مارکسزم کی زیادہ باشعور پرتیں بھی ایک ایسے حوصلہ افزا ماحول میں جب مارکسزم کی قوتیں تعمیر کی جاسکتی ہیں ،اس تقسیم اورتنازعے کی بدولت پریشان ہو کے رہ گئی ہیں“۔(3)

جیساکہ ہم اپنے پہلے ایک باب میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ برصغیر اور عالمی سطح پر بائیں بازو کی قیادت کی کمزوری کی ابتدا سوویت یونین کی تنزلی سے

ہوئی۔کریملن میں سٹا لنسٹ افسر شاہی کا حاوی ہوجانااور اقتدارپر کنٹرول سنبھال لینااور پھر **1920**ء کی دہائی کے وسط میںتیسری انٹرنیشنل کا انحطاط اور تحلیل اس کی بنیادبنی۔برصغیر میں اس تنزلی نے مکمل ہونے میں بہت وقت لیااور یہ **1936**ء میں جاکر وقوع پذیرہوئی۔تقسیم کے دوران مسلمان کمیونسٹوں نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمیونسٹ بھی مذہبی اور قومی تقسیم کے قائل ہیں۔یہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہیں تھا کہ مسلم لیگ کیلئے انتخابی منشور اورپروگرام لکھنے والاایک کمیونسٹ دانیال لطیفی تھا۔یہ نتیجہ تھا سٹالن کی قوم کی تعریف کا ، جس کے مطابق مذہب بھی ایک بڑی قومی پہچان اور شناخت کا حامل ہوسکتا ہے ۔اس زریں اصول پر عملدرآمدنے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکو برصغیرجنوبی ایشیاکی عملی سیاست میںنظریاتی اورسیاسی تباہی سے دوچارکردیا۔بعدازاں سٹالن کے **1953**ء میں مرنے کے بعد سی پی آئی(**CPI**) کی قیادت نے اپنی سنٹرل کمیٹیوں اورکانگریسوں میں ان غلطیوں کی شدید الفاظ میں مذمت بھی کی۔مگر اس کا خمیازہ پاکستان کو بھگتناپڑاجہاں کمیونسٹ پارٹی کبھی بھی سماجی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی،اس کی وجہ یہی غلط نظریاتی پالیسی تھی۔اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ پاکستان کے اندر قائم ہونے والی پے درپے حکومتیں انتہائی کمزورتھیں اور نوآدیاتی ملکوں سمیت اس خطے میں بھی سوشلسٹ تحریکوں کی شدت اوردبائو میں اتنی طاقت تھی کہ سبھی حکمران بائیں بازو سے مسلسل خائف اور دہشت زدہ ہی رہے۔اسی لیے ابتدائی پانچ دہائیوں کے دوران سبھی حکمران بائیں بازوکو اپنے جبر واستبداد کانشانہ بناتے رہے۔اس کے باوجود بھی کہ یہ اتنی بڑی اورموثرقوت میں نہیں تھے کہ ریاست اور اس مروجہ نظام کیلئے کسی خطرے کا باعث بن سکتے۔

ریاست کی طرف سے لگاتار کیا جانے والا جبر وتشددان کئی اہم عناصر میں سے ایک تھا جن کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹیاں سماج کی وسیع پرتوں تک رسائی حاصل نہ کرسکیں۔مگر کب اور کس ملک میں کمیونسٹ پارٹیاں ،بالشویک پارٹی سمیت ریاستی جبر کا شکار نہیں رہیں۔اس کے ہوتے ہوئے ، اس کو سہتے ہوئے اور اس کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی سماج میںاور عوام میں اپنی بنیادیں تعمیر کی گئیں،سوشلسٹ انقلابات کی قیادت کی گئی اور سماج کو بھی بدلاگیا۔پاکستان کے بائیں بازو کے دانشوروں اور مورخوں نے کمیونسٹ پارٹی کی تنظیمی غلطیوں اورقیادت کی انفرادی کوتاہیوں کو ان کی ناکامیوں کا ذمہ دارٹھہرایا ہے اوریہ بات اتنی غلط بھی نہیں۔

ہمارا نقطہء نظر یہ ہے کہ ا س ناکامی کی وجہ کسی طور بھی نہ تو مذہب تھا نہ ہی ریاست کا مذہبی ہونا،نہ ہی اس ناکامی کیلئے تنظیمی خامیوں یا انفرادی کمزوریوں یا قیادت کی غلطیوں کومورد الزام ٹھہرایا جاسکتاہے۔ ہمارا مو قف یہ ہے کہ یہ سب کچھ

نظریاتی٬ سیاسی اورفلسفیانہ بنیادوں پرہواجو تاریخی طورپرغلط اورتباہ کن تھیں۔ ایک انقلابی پارٹی کی تعمیر کیلئے درکار ہر طریق کار،ہرحکمت عملی کا تعلق اس تنظیم کی نظریاتی بنیادوں سے ہواکرتاہے جو اسے تعمیر کرنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ بائیں بازو کی اکثریت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بطن سے جنم لیا تھا یا پھر ان کا تعلق ایسی تنظیموں سے تھا جو یہ سمجھتی تھیں کہ نوآبادیاتی ملکوں میں انقلابات کا کردار سوشلسٹ نہیں بلکہ قومی جمہوری ہوگا۔اس سے انہیں ایک مہلک رعایت مل گئی یا جوازمیسر آگیاجس کی وجہ سے وہ حکمران طبقات کی کسی نہ کسی پرت سے مل جائیں وہ بھی اس برخودغلط تصور کے ساتھ کہ ان کا کردار چونکہ ترقی پسندانہ ہے اس لیے ان کی حمایت کی جائے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہ توخودکونہ ہی پرولتاریہ کو اپنے ملک کے استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑنے کیلئے تیارکررہے تھے جو جاگیردارانہ باقیات کے ساتھ بھی خلط ملط تھا اور سامراج کا غلام بھی تھا۔ چنانچہ سوشلسٹ انقلاب ان کے ایجنڈے سے ہی باہر نکل گیاتھا۔

ان کی ہر" عملی "اور" عوامی "سیاست نرالی تھی۔محروم طبقات کو درپیش مسائل سرمایہ دارانہ نظام کی ننگی اور جارحانہ لوٹ مار کے ہاتھوں دن بدن گھمبیر اور شدید ہوتے جارہے تھے ،چنانچہ کمیونسٹ ہونے کے ناطے سے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ عوام اورپرولتاریہ کی وسیع پرتوں کی ملکی سیاست میں ایک مضبوط وموثر قوت کے طورپر ابھرنے میں ان کی حمایت کریں۔اس کیفیت نے ان کے "کیڈروں "کو تذبذب کا شکارکیے رکھنے میں اہم کردار اداکیاجس سے بحران پیداہوگیااختلافات ہوئے اور پھوٹ پڑی۔لیکن پھر یہ سب کچھ حقیقی نظریاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ انفرادی ،تنظیمی اور طریق کار کے معاملات پر ہوا۔

لینن اور ٹراٹسکی

اصلی اور حقیقی مسئلہ جو درپیش تھا وہ ایک خالص مارکسی رحجان کی غیرموجودگی تھی۔جو بھی نظریاتی ماڈل دستیاب تھے وہ سب کے سب سٹالنزم کی مختلف شکلیں تھے۔بدقسمتی یہ رہی کہ برطانیہ اوریورپ کی درسگاہوں سے پڑھ کر آنے والے کچھ پیٹی بورژوا طالبعلم عناصرنے ،جوخودکو ٹراٹسکائیٹ کہلواتے تھے٬ انتہائی موقع پرستانہ یا پھر الٹرا لیفٹ کردار اداکیاکہ جس کی وجہ سے حقیقی مارکسزم اور ٹراٹسکی ازم کی قوتوں کی تعمیر کو مزید دھچکالگا۔

مارکس٬ اینگلز اورلینن دنیا بھر میں بائیں بازو کیلئے عمومی قبولیت رکھتے تھے۔یہ قبولیت صرف نظریاتی اورسیاسی آئیڈیل اورادارے سے کہیں زیادہ بائیں بازو کی

کرشماتی شخصیات کے طورپر تھی اور یہی وہ شکل وصورت تھی جو ان کی سٹالنزم نے بنائی اور دنیابھر میں رائج کرنے کی کوشش بھی کی۔1950/60ء کی دہائیوں تک توسٹالن ہی بائیں بازو کا ہیرو بنارہامگر بعد میں چینی منصوبہ بند معیشت نے مائو زے تنگ کی قیادت میں تیزی سے جو ترقی کی،اس کے بعدمائو بھی بائیں بازو کی سیاست میں داخل ہونے والی نوخیز اورنوجوان پرتوں کا ہیرو بن گیا۔ٹراٹسکی نہ صرف یہ کہ راندہ درگاہ تھا بلکہ وہ پاکستان میں سٹالنزم کے ہر دھڑے کی قیادت اور ان کے دانشوروں کی طرف سے غدار،ایک سامراجی ایجنٹ اور ایک نازی فاشسٹ قرار دے دیاگیاتھا۔لینن اورٹراٹسکی کو ایسے دو متحارب و مخالف مکاتب فکر، شخصیات اورنظریات قراردیاگیا جن کی جنگ قطعی ناقابل مصالحت تھی۔ سٹالن کامن پسندلینن کا" منتخب" تصنیفی کام پاکستان میں سوشلسٹوں کے سٹڈی سرکلوں میں پڑھا اور زیربحث لایاجاتا جو انہیں غلط نظریاتی جواز فراہم کرتا تھا۔ خاص طور پرلینن کی تصنیف"سوشل ڈیموکریسی کے دو طریق کار"کو بھونڈے طریقے کے ساتھ بروئے کار لاتے ہوئے اسے مرحلہ وار انقلاب two stage theoryکے جوازاوردرستگی کیلئے استعمال کیا جاتا رہا۔یہ اپنی سرشت میں ہی ایک ضرررساں اور بے سود عمل تھااس سے کچھ حاصل تو کیا ہونا تھا مگر اس کی وجہ سے بائیں بازو کے گروپ' پرولتاریہ اور انقلابی نوجوانوں کی وسیع پرتوں سے کٹ کر رہ گئے جو ظالمانہ استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کی جستجو اور لگن سے مالامال تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لینن اور ٹراٹسکی کے مابین نظریات اور طریق کار پراہم اختلافات تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ 1903ء میں RSDLPمیں ہونے والی تقسیم سے لے کر1917ء کے شروع تک لینن اور ٹراٹسکی کے مابین گرماگرم بحثیں اور اختلافی امورچلتے رہے۔خاص طور پر منشویکوں اور بالشویکوں کومتحدکرنے کے معاملے پراختلافی بحثیں مرکوز رہیں۔ٹراٹسکی نے بعد ازاں اعتراف کیاتھا کہ اس نے اس کڑے وقت میں بالشویکوں کے ساتھ شامل نہ ہو کر غلطی کی تھی۔مگر یہاں پاکستان کے سٹالنسٹ دانشوروں نے ٹراٹسکی کے خلاف انتہائی معاندانہ پروپیگنڈہ اختیار کیے رکھا۔دروغ گوئی کی سٹالنسٹ درسگاہ شدومد کے ساتھ مکروہ مہم چلائے ہوئے تھی اورکوئی ایسا ٹھوس مارکسی رحجان موجود نہیں تھا جو اس گمراہ کن مکروہ مہم کامقابلہ کرتااوراس کا جواب دیتا۔کریملن افسرشاہی نے اکتوبر انقلاب سے متعلقہ ہر کتاب 'دستاویز'تصویر میں سے ٹراٹسکی کو گم کردیا۔انقلاب کے پہلے پانچ سالوں کے دوران ٹراٹسکی کی شاندار خدمات کو غائب کردیاگیا۔اسی طرح پاکستان کے سٹالنسٹ دانشوروں نے زمروالڈکانفرنس میں ٹراٹسکی کے کردار کو بھی نظرانداز کیے رکھا جس میں اس نے دوسری انٹرنیشنل کی" لیفٹ اپوزیشن"کی بنیادرکھنے کے ساتھ اکتوبر انقلاب کے دونوں قائدین کے مابین متفقہ و مشترکہ عمل کو ممکن کیاتھا۔اپنی معرکۃالآرا کتاب "بالشوازم راہ نجات"میں ایلن وڈز نے

لینن اورٹراٹسکی کے درمیان اختلافات اور بعد میں ان کیاتفاقِ رائے اور ہم آہنگی کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے ،اسی اتفاقِ رائے اور ہم آہنگی نے ہی 1917ء کے بالشویک انقلاب کی قیادت کرتے ہوئے اسے پایہء تکمیل تک پہنچایا۔

”روسی بورژوازی جرمن بورژوازی کے برعکس تاریخ کے میدان میں بہت ہی تاخیر سے داخل ہوئی تھی،اس بارے میں مارکس اوراینگلز نے 1848ء میں ہی تفصیل سے لکھاتھا۔اس کی سماجی بنیادیں انتہائی کمزور تھیں جس کی وجہ سے یہ اپنے پرولتاریہ سے بہت زیادہ خوفزدہ بھی تھی اور سماج کو ترقی دینے کی صلاحیت سے محروم تھی۔صنعت زمیندارانہ سرمائے سے پیوستہ تھی اور یہ دونوں بینکوں کے محتاج تھے۔غیر ملکی سرمائے پر انحصار نے روسی سرمایہ داری کیلئے ایک کامیاب قومی جمہوری انقلاب کرناناممکن بنادیاتھا“۔

”لینن کی سبھی تحریروں اور تقریروں میں بورژوا ڈیموکریٹک لبرلز کے ردانقلابی کردار کے بارے میں کھل کر کہااورلکھاگیاہے۔تاہم 1917ء تک خودلینن کو بھی اس بات پر یقین نہیں تھا کہ مغرب میں سوشلسٹ انقلاب برپاہونے سے پہلے روس میں بھی مزدور انقلاب کرکے اقتدارحاصل کر لیں گے۔یہ وہ تناظرتھا جسے ٹراٹسکی 1917ء سے پہلے اپنے نظریہ مسلسل انقلاب کی شکل میں پیش کرچکاتھااور اس کا دفاع کرتا چلا آرہاتھا۔یہ روسی مزدور تحریک کے اندر طبقاتی مصالحت کے حامل دائیں بازویعنی منشویکوں کے نظریاتی نقطہء نظر کا مکمل اور بھرپور جواب تھا۔دومرحلوں میں انقلاب کا نظریہ منشویکوں کی جانب سے روسی انقلاب کے تناظر کے طورپر پیش کیا گیا تھا۔یہ نظریہ بنیادی طورپر بیان کرتا ہے کہ چونکہ انقلاب کا پہلا اور ابتدائی مرحلہ قومی جمہوری انقلاب ہے اس لیے لازمی ہے کہ انقلاب کی قیادت قومی سرمایہ دار وں کے سپردکی جائے“۔

”ٹراٹسکی نے اس کے مقابلے میں کہا کہ اگر محنت کش طبقے کو قیادت کا فریضہ سونپ دیا جائے،تو یہ استحصال کا شکارسماج کی دیگر پرتوں شہروں اور دیہاتوں کے درمیانے طبقے کی رہنمائی کرتے ہوئے اقتدار حاصل کرسکتاہے اورپھر اس کے بعد یہ قومی جمہوری انقلاب کے فرائض (خاص طور پر زرعی اصلاحات کرتے ہوئے اور ملک کو غیرملکی تسلط سے نجات دلاتے ہوئے)سرانجام دے گا۔مگر ایک بار اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد پرولتاریہ یہیں رك نہیں جائے گابلکہ سوشلسٹ اقدامات کرتے ہوئے سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکے گااور چونکہ صرف ایک ملک میں ایسے اقدامات کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا،وہ بھی ایک پسماندہ ملک میں،اس انقلاب کو عالمی انقلاب کا نقطہء آغاز بنادیاجائے گا۔چنانچہ انقلاب دوحوالوں سے مسلسل کردار کا حامل ہوگا‘یہ اپنا آغاز ایک بورژوا ہدف سے لے گااور اسے سوشلسٹ اصولوں پر کے ساتھ نتھی کردیا جائے گااور دوسرا یہ ایک ملک سے شروع ہوگااورعالمی سطح پر اپنا پھیلائو

کرتاجائے گا"۔

"لینن نے اس پر اتفاق کیا کہ روسی روشن خیال قومی جمہوری انقلاب نہیں کر سکتے اور یہ فریضہ پرولتاریہ اپنے کسان بھائیوں کے ساتھ مل کر سرانجام دے گا۔ 1905ء سے لے کر 1917ء تک بورژوازی کے کردار کے حوالے سے لینن کا نقطہء نظر ٹراٹسکی کے بالکل قریب تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ ہم آہنگ تھا۔لینن نے اس کا کھلے عام اعتراف لندن میں ہونے والی پانچویں کانگریس میں بھی کیا تھا،جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مارکس کے اقدامات کی پیروی کرتے ہوئے،جس نے بورژوا ڈیموکریٹک پارٹی کو پہلے آزاد خیالوں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک قراردیاتھا۔(4)

لینن نے واضح کہا تھا کہ روسی بورژوازی کا روسی محنت کشوں کا ساتھی یاخیرخواہ ہونا تو دور کی بات ہے،وقت آنے پر یہ ناگزیر طورپر ردانقلابی قوتوں کاہی ساتھ دے گی۔لینن نے 1905ء میں لکھا کہ عوام کے مقابلے میں بورژوازی لا محالہ ردانقلاب کا ساتھ دے گی اور یہ جلد سے جلد عوام دشمنی پر اتر آئے گی۔کیونکہ یہ تنگ نظر بھی ہے ،مفادپرست بھی اوریہ موقع ملتے ہی جمہوریت سے بھی تائب اور الگ ہو جائے گی۔(اوریہ ایسا کربھی چکی ہے)"۔

"لینن کے خیال میں کون سا طبقہ قومی جمہوری انقلاب کی قیادت کرسکتاتھا؟یہ عوام تھے،یعنی مزدوراور کسان۔صرف پرولتاریہ ہی اس قابل ہوتاہے کہ وہ آخر تک یہ سب کچھ کر تا جائے۔یہ جمہوری انقلاب سے کہیں آگے تک جا سکتاہے۔یہی وجہ ہے کہ پرولتاریہ ایک جمہوریہ کیلئے جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہتاہے اور اس کیلئے وہ بورژوازی کو اپنے ساتھ ملانے کے امکانات کی بیہودہ ناقابل اعتبار ہدایات کوحقارت کے ساتھ ردکردیتا ہے"۔(5)

ایلن وڈز اس اہم ایشوپر لینن کی سوچ کو مزیدواضح کرتے ہوئے لکھتاہے:

"اس معاملے پر لینن نے ٹراٹسکی کے ساتھ اختلاف کیا کہ روسی پرولتاریہ مغرب میں انقلاب سے بھی پہلے یہاں انقلاب کر سکتاہے۔1917ء تک یہ صرف ٹراٹسکی ہی تھا جو اس نقطہء نظرکا حامل اور حامی تھا کہ ایسا ہوسکتاہے۔یہاں تک کہ خود لینن بھی اس امکان کو مسترد کرتا تھا ۔اس کا اصرار تھا کہ روسی انقلاب کا کردار بورژوا ہوگا۔محنت کش طبقہ غریب کسانوں کے ساتھ مل کراشرافیہ کا تخت اکھاڑپھینکے گا اور پھر شدومد کے ساتھ قومی جمہوری اقدامات کے حامل پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دے گا۔لینن دل سے اس بات کا متمنی تھا کہ زرعی اصلاحات کی جائیں،جاگیرداری کاخاتمہ کردیاجائے اور زمین قومی تحویل میں لے لی جائے۔ تاہم جیسا کہ لینن نے بارہا اس کا واضح اظہاربھی کیا تھا کہ زمین کی ریاستی تحویل ایک بورژوا مطالبہ ہے ،سوشلسٹ نہیں جس کا مقصد جاگیردار ی کا قلع قمع کرناہے۔لینن نے درجنوں با ریہ بات زور دے کر

کہی تھی کہ روس کے اندر سوشلزم کی تعمیر کیلئے درکار معروضی حالات کی غیرموجودگی کے باعث جس سے ہر کوئی متفق تھا، انقلاب سوشلسٹ فرائض پورے کرنے سے رک جائے گا۔مگر لینن کی بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی تھی'وہ تو ایک ناقابل مصالحت انٹرنیشنلسٹ تھا۔ اس کا تو سارا تناظرہی بین الاقوامی انقلاب پر مبنی تھا،جس کا روسی انقلاب ایک چھوٹا ساحصہ تھا"۔(6)

سٹالنسٹ دانشوروں' مورخوں اور لیڈروں کی تمام تر بہتان ودشنام طرازی کے باوجودلینن اور ٹراٹسکی کے مابین تعلقات و معاملات کی نوعیت اس سے قطعی مختلف تھی جو انہوں نے گڑھ لیے تھے۔ ٹراٹسکی ہمیشہ منشویکوں کی مرحلہ وار انقلاب کے انقلاب کے مقابلے میں لینن کے موقف کو سراہتااور اسے ترقی پسند سمجھتاتھا۔مگر وہ اس کی خامیوں اور کمزوریوں پر بھی تنقید کرتاتھا۔اس نے 1909ء میں لکھا " یہ سچ ہے کہ ان کے اس دوران اختلافات معمولی نہیں بلکہ توجہ کے قابل تھے۔اس وقت جب کہ منشویکوں کے انقلاب دشمن خیالات کھل کر سب کے سامنے آگئے تھے،ایسے وقت میں بالشویکوں کے نظریات ان کی فتح کی صورت میں سب سے بڑا خطرہ تھے"۔(7)

یہ باکمال فقرے اور ان میں بیان کردہ سچائی کو ہمیشہ ٹراٹسکی کے سٹالنسٹ ناقدین نے دانستہ نظرانداز کیاہے۔مگر انہی سے ہی وہ سچائی سامنے آتی ہے جو 1917ء میں منظر عام پر آئی جب لینن کے بالشویک قائدین کے ساتھ"پرولتاریہ اور کسانوں کی جمہوری آمریت"کے نعرے پر اختلافات سامنے آئے اور جسے لینن نے ایک ایسی پالیسی کے حق میں ترک کردیا جو نظریہ مسلسل انقلاب کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی رکھتی تھی۔جب انقلاب کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی توٹراٹسکی نے اس کے حواشی میں لکھا"جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ خطرہ کبھی وجود نہیں پاسکتا تھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ کامریڈ لینن کی قیادت میں بالشویک پارٹی نے 1917ء کی بہار میں ہی اس انتہائی اہم معاملے پر(ایک بڑی اندرونی جدوجہدکے بعد) پالیسی لائن تبدیل کرلی تھی،یعنی اقتدار پر قبضے سے بھی پہلے"۔(8)

مادی نقطہء نظر سے ہر ایک نظریے کا کھرا یا کھوٹا ہونا اس کے عملی نتائج سے ثابت ہواکرتا ہے۔سبھی نظریات' سبھی پروگرام اور سبھی تناظرجو مختلف رحجانات کی طرف سے جوش جذبے اور سرگرمی کے ساتھ روسی مزدورتحریک کے اندرانقلاب کی نوعیت اور اس کیلئے جذبہ محرکہ کے طورپر پیش کیے جارہے تھے،ان سب کا اصلی امتحان 1917ء کے انقلاب کے واقعات ہی تھے۔یہی وہ وقت' وہ مرحلہ تھا جب لینن اورٹراٹسکی کے درمیان موجود باریک سی لکیر بھی مکمل ختم ہو چکی تھی۔لینن کی طرف **Letter from Afar** اور پھر **April Thesis** میں ہمیں وہی اور ویسا ہی لکھا ہوا مل جاتا ہے جسے ٹراٹسکی بھی انہی دنوں **Novy Mir** میں لکھتا چلا آرہاتھا مگروہ یہ سب

ہزاروں میل دور امریکہ میں بیٹھا لکھ رہاتھا۔

اور جیسا کہ ٹراٹسکی نے 1909ء میں ہی خبردار کیا تھا"پرولتاریہ اور کسانوں کی جمہوری آمریت "کے نظریے کاردانقلابی رخ خود انقلاب کے زندہ جاوید واقعات میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا ،جب کامینیف،زینوویف اور سٹالن نے اسے لینن کے خلاف استعمال کیا تاکہ بورژواعبوری حکومت کی حمایت کو ثابت کیا جاسکے۔ جس پر لینن کے بالشویک قیادت کے ساتھ اختلافات پیدا ہوگئے اور انہوں نے لینن پر الزام لگایا کہ وہ ٹراٹسکائیٹ ہوچکاہے۔

اور سب سے بڑی سچائی تو یہ ہے کہ نظریہ مسلسل انقلاب کی درستگی کا سب سے بڑا، ناقابل تردیداور عملی ثبوت خود بالشویک انقلاب ہی کی شکل میں سامنے آیا ۔روس کا مزدور طبقہ جیسا کہ ٹراٹسکی نے 1904ء میں پیشین گوئی کر دی تھی ،مغربی یورپ کے مزدور طبقے سے بھی پہلے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکاتھا۔روس کے مزدوروں نے بورژوا جمہوری انقلاب کے سبھی تقاضے پورے کر دکھائے،فوراًسے پیشترصنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا ،اور اس کے ساتھ ہی سوشلسٹ انقلاب کے مرحلوں سے بھی گزرنا شروع کردیاگیا۔بورژوازی نے کھلم کھلا انقلاب دشمنی کی ،مگر اسے مزدوروں نے غریب کسانوں کی مددو معاونت سے شکست دے دی۔اس انقلاب کے ساتھ ہی بالشویکوں نے دنیا بھر کے مزدورں سے اپیل کی کہ وہ اس انقلاب کا ساتھ دیں اور انقلاب کریں۔لینن بخوبی سمجھتا اور جانتا تھا کہ جدید اور ترقی یافتہ ملکوں کے اندرخصوصاً جرمنی میں انقلاب نہ ہواتوروس کا انقلاب،روس کی پسماندگی کی وجہ سے، تنہارہ جائے گا۔اور جو کچھ اس انقلاب کے ساتھ بعد میں ہوا وہ اس حقانیت کا کھلا ثبوت ہے۔تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل کا ایک عالمی انقلاب کی علمبردار پارٹی کے طورپر قائم کیاجانا اسی ضرورت اور جستجو کا ہی آئینہ دار تھا۔

سرمایہ دار اور افسر شاہی

صورتحال آج بھی صاف اورواضح ہے۔ہر ایک نوآبادیاتی ملک کی قومی سرمایہ داری نے تاریخ کے میدان میں بہت ہی تاخیر سے قدم رکھا کہ جب دنیا پہلے ہی چند ایک سامراجی ملکوں کے درمیان تقسیم ہو چکی تھی۔اس ماحول میں ان ملکوں کی بورژوازی کوئی ترقی پسندانہ کردار ادانہیں کرسکتی تھی۔ اپنی ابتدا سے ہی اسے اپنے سابق سامراجی آقائوں کی مکمل محتاجی میں آناپڑا۔ایشیا،لاطینی امریکہ اور افریقہ کی بدعنوان اور نحیف ونزار بورژوازی اپنے اپنے سماج کو چلانے کیلئے مکمل طورپرسامراج اور غیر ملکی سرمائے کی مطیع اور محتاج ہے ۔یہ ہزار تانوں بانوں کے ساتھ نہ صرف غیرملکی سرمائے

کے ساتھ جڑی ہوئی ہے بلکہ یہ اندرونی طورپر جاگیروں کے مالکان کے ساتھ بھی شریک کار چلی آرہی ہے اور یوں ایک ایسارجعتی وردانقلابی اتحاد قائم کیاہواہے جو ہر قسم کی ترقی کا مخالف اور دشمن ہے۔ان بظاہر آپس کے دشمن طبقات کے آپس میں جتنے بھی اور جیسے بھی تضادات اور اختلافات ہیں مگر عوام کی ترقی وخوشحالی کے معاملے میں یہ ایک ہیں اور وقت آنے پر ایک ہی ہوجاتے ہیں۔چنانچہ ان کے سبھی تضادات' تنازعات اور اختلافات بے معنی اور جھوٹے ہیں۔صرف پرولتاریہ ہی یعنی محنت کش طبقہ اپنے دیہاتوں کے غریب کسانوں اور شہروں کے غریبوں کے ساتھ مل کراقتدار کو اپنے قبضے میں لیتے ہوئے سامراجیت اور سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکنے اور سوشلسٹ اقدامات لیتے ہوئے سماج کو بدلنے کی حقیقی اہلیت اور جرات رکھتاہے۔

اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل ،لینن اور ٹراٹسکی کی اس نظریاتی و سیاسی نقطہء نظر پر قائم وکاربند رہتی تو عالمی سوشلسٹ انقلاب کو برپا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتاتھا۔المیہ اور بدقسمتی یہ رہی کہ کمنٹرن کے ابتدائی سال جب یہ تشکیل کے مرحلے میں تھی،اس کی روس میں سٹالنسٹ ردانقلاب کے ساتھ مڈبھیڑہوگئی۔جس کے دنیا بھرکی کمیونسٹ پارٹیوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔سٹالنسٹ افسر شاہی نے روس میں کنٹرول حاصل کرتے ہی ایک انتہائی قدامت پرستانہ شکل اختیار کرلی۔یہ نظریہ کہ سوشلزم ایک ملک کے اندر قائم اور برقراررہ سکتا ہے،مارکس اور لینن دونوں کے تصورات کی نفی ہی نہیں تھی بلکہ یہ افسرشاہی کی ذہنیت کی حقیقی غمازی کرتا تھا جو انقلاب کے ابھاراور دبائو سے سہمی ہوئی تھی اسی لیے اس نے ”ایک ہی ملک میں سوشلزم کی تعمیر“کا ہدف اپنا لیا۔

طبقاتی آزادی کی انقلابی پالیسی کو بروئے کار لانے کی بجائے،جس کی لینن ہر وقت وکالت کرتا رہتاتھا،افسرشاہی نے دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں کو جمہوری انقلاب کے ذریعے ”ترقی پسند قومی بورژوازی“کی حمایت کرنے کی ہدایات جاری کردیں۔(اگر کہیں یہ ترقی پسند سرمایہ داری نہیں بھی تھی تو کہا گیا کہ اسے ایجاد کیا جائے اوروہ تو شاید اس کیلئے پہلے سے تیار بیٹھے ہوتے تھے)۔اور جب یہ ترقی پسند بورژوازی کہیں بعد کے کسی زمانے میں ترقی اور جمہوریت کو مکمل کرلے اور ملک پوری طرح سے پک کرسرمایہ دار ہو جائے تب سوشلزم کی جدوجہد اختیار کی جائے۔حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اب یہ دوسرا مرحلہ بھی ترک ہی کردیا ہے اور اب یہ لبرل ڈیموکریسی اور زوال زدہ سرمایہ داری کے آگے گھٹنے ٹیک چکے ہیں۔یہ پالیسی مکمل طور پر لینن ازم سے انحراف کی عکاسی کرتی ہے اور یہ منشوازم کے قدیم متروك موقف یعنی” مرحلوں میں انقلاب “کی ہی آئینہ دار ہے۔

بھارت میں مرحلہ واریت کا یہ منشوازم ماسکونواز کمیونسٹ پارٹی آف انڈیاکی

طرف سے اس شکل میں عملاً سامنے آیا جب بھارت کی خودساختہ ترقی پسندبورژواپارٹی کانگریس کی حمایت کی گئی جس کی قیادت نہروکررہاتھا۔پے در پے موقف کی تبدیلیاں، غداریاں اور بورژوا کانگریس حکومت کے مزدوردشمن اقدامات کے حملوں نے کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں میں بے چینی پیداکردی اورعہدیداروں کے مابین تنازعات نے جنم لینا شروع کردیا ۔جس کے نتیجے میں پارٹی **1964**ء میں تقسیم ہو گئی اورکمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ اس تقسیم کے نتیجے میں قائم ہوئی جو پیکنگ نوازی کی طرف مائل ہوگئی۔مگر ماسکو اور پیکنگ کے اس سٹالنزم کے مابین کوئی بنیادی حقیقی نظریاتی اختلاف اور فرق نہیں تھا۔چنانچہ اس نئی پارٹی کو بھی بحرانوں نے لپیٹ میں لے لیا۔وہاں بھی اختلافات نے پارٹی کو تقسیم کردیا اور ایک نئی پارٹی اس کے بطن سے ابھری جس نے مارکسسٹ کے ساتھ لیننسٹ کا لقب اپنے ساتھ لگا لیا۔بدقسمتی سے نظریاتی اختلاف اور فرق یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

تاہم**50/60/70**ء کی دہائیوں میں ان پارٹیوں کے اندر سوشلزم اورکمیونزم نام کا کوئی شائبہ توکم از کم موجودہواکرتاتھا۔ان پارٹیوں کی کیرالہ ،مغربی بنگال اور تریپورہ میں قائم ہونے والی بائیں بازو کی حکومتوں نے کچھ اصلاحات تو کی تھیں۔مگر اب تو جیسے انہوں نے ' خاص طور پرکمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (M)نے مرحلہ وارنظریے کو بھی رد کردیا ہے اور اس کی بجائے ایک مرحلے ؛مالیاتی سرمائے کی اشرافیہ کے زیراثر بورژواجمہوریت کی حکمرانی کوہی اپنا اوڑھنابچھونا بنا لیا ہے۔ اس سلسلے میں تو وہ اتنا آگے جا چکے ہیں کہ جن غریب کسانوں کو **1970/80**ء کی دہائیوں میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا(M)نے زرعی اصلاحات میں زمینیں دی تھیں اب ان کو انہی زمینوں سے ہی بے دخل کیا جارہاہے۔سنگھور اور نندی گرام اوردیگر علاقوں میں ریاستی تشدد اور کمیونسٹ پارٹی(M)کے کیڈروں کے ذریعے ان غریب کسانوں کو زمینوں سے زبردستی بے دخل کردیاگیا۔یہ بے دخلیاں اس لیے کرائی گئیں تاکہ ملٹی نیشنل گروپوں کو جن میں بھارت کا ٹاٹاگروپ اور انڈونیشیا کا سلیم گروپ آف انڈسٹریز شامل تھے ، کیلئے زمین خالی کرائی جائے اور وہاں سرمایہ کاری کی جاسکے۔نیولبرل سرمایہ دارانہ پالیسیاں بنگال سمیت بیشتر علاقوں میں بائیں بازو کی پارٹیوں کی وسیع حمایت کے حامل کسان علاقوں میں تباہی اوربربادی پھیلاتی جارہی ہیں۔اس کے نتیجے میں ان بائیں بازو کی پارٹیوں کے عہدیداروں اور کارکنوں کے اندر غصہ واضطراب انتہائوں کو پہنچاہوا ہے۔نوجوانوں کی بڑی تعداد کے مائواسٹ گروپوں کی طرف رحجان اور مسلح جدوجہد کی طرف رغبت کے باوجودوہاں انقلابی سوشلزم کے پروگرام کیلئے بہت بڑی تعداد میں نوجوانوں اور مزدوروں کو مارکسزم کی طرف لانے کے امکانات روشن ہیں۔

طلباء

پاکستان کے اندرماسکونوازپارٹیاں بنی ہی جمہوری گورکھ دھندے کی محدودیت میں قید رہنے کے باعث عضومعطل بنی رہیں اوریوں وہ ایوب آمریت کے خلاف کوئی مزاحمت یااحتجاج منظم نہیں کر سکیں۔ جبکہ اس دوران چین میں ہونے والی ترقی نے نوجوانوں اور طلبہ کو متاثر کرناشروع کردیاتھا۔1950ء کی دہائی کے آخر اور 1960ء کی دہائی کے شروع میں این ایس ایف(NSF) نے کسی حد تک انقلابی طلبہ کے جوش وجذبے کومرکزی دھارے میں جوڑا اور مرکز سے ضلعی سطح تک تنظیم سازی کرتے ہوئے ترقی پسندطلبہ جن میں قوم پرست،سوشلسٹ اور کمیونسٹ سبھی شامل تھے‘ کو منظم کیا۔ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ NSF کی سب سے مضبوط ترین قوت کا وقت تب تھا جب یہ ایوب آمریت کے ابتدائی سالوں کے دوران اس سے متصادم ہوئی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو یونیورسٹی نظام کے اندر افسرشاہانہ مداخلت کے ذریعے طلبہ سیاست کو کنٹرول کرنے اور اپنی طرزپر چلانے کا موقع مل گیا۔یونیورسٹی آرڈیننسز 1962ء مارشل لا دور کی ہی پیداوار تھے، جو اس کے خاتمے کے بعد بھی مسلط اور لاگورہے۔ان جارحانہ قوانین کے تحت ناپسندیدہ سیاسی سرگرمیوں پر جرمانے عائد کر دیئے جاتے، اساتذہ کی تنخواہوں،ترقیوں،غیر ملکی اکیڈمک رابطوں اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کو سیاسی کنٹرول کے تابع کردیاگیا۔ایک اور ناجائز ایکٹ جو مسلط اورلاگو کیاگیا وہ ”سٹوڈنٹس افیرز ڈیپارٹمنٹ“تھا،جسے پنجاب یونیورسٹی میں کرمنل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ(CID) (جوپولیس کا انٹیلی جنس ادارہ ہے)کی کیمپس برانچ میں ڈھال دیاگیا۔”سیاسی طورپر قابل اعتماد اور معتبر“طلبہ کواس نئے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے وظائف سے نوازا جاتاتھا۔مگر جو طلبہ ”بھروسے “کے اہل نہیں ہوتے تھے ان کے پیچھے ہر وقت ہر طرف سی آئی ڈی(CID) لگا دی جاتی ،انہیں یونیورسٹی سے نکال دیے جانے ،شہر سے باہر لے جاکے زدوکوب کرنے،چونامنڈی تھانے لے جانے یا پھر بدنام زمانہ شاہی قلعے کی یاتراکرانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ڈھاکہ‘ کراچی اورلاہور میں طلبہ کمیونٹیوں نے ان آرڈیننسوں کے خلاف شدید مظاہرے کیے،انہی مظاہروں میں ہی یہ طلبہ، فرانس کے الجزائر پر قبضے اور پیٹرائس لوممبا کے قتل پر امریکہ کے خلاف بھی نعرے لگاتے رہے۔ان سبھی طلبہ سرگرمیوں میں مضبوط حکومت مخالف جذبات کی جھلک صاف نظرآتی رہی۔

پاکستانی بائیں بازو میں مائوازم پر بحث بہت زوروں پر تھی مگر طلبہ کی بڑی اکثریت کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ان کے سیاسی شعور سے جو بات جھلکتی تھی

وہ امریکہ مخالف رحجان تھا جو ایک مارکسی نعرے بازی،اور چین نوازی سے کہیں زیادہ پاکستانی قوم پرستی کے جذبات سے مزین تھا۔بھٹوکے ساتھ شریک اور سرگرم طلبہ کی اکثریت نہ تو مارکسی تھی نہ ہی انقلابی،بلکہ یہ سٹالنسٹ دھڑوں کی مختلف قوم پرست پرتوں سے تعلق رکھتے تھے۔جن کا مقصد بس اتنا تھا کہ کچھ ریاستی ڈھانچے میں تبدیلیوں کو عمل میں لاتے ہوئے ملک وقوم کو معاشی وعسکری لحاظ سے مضبوط و مستحکم بنایا جاسکے۔

چین اورپاکستان

مگر یہاں پھر المیہ یہ تھا کہ مائوزے تنگ کی زیر قیادت چینی افسرشاہی کے پاکستانی حکومت کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم تھے اور پاکستانی ریاست کی معاونت سے پاک چین دوستی کی حامل ایسوسی ایشنیںقائم تھیں۔اس کے باوجود بھی بیشتر بائیں بازو کی پارٹیاں اور طلبہ تنظیمیں چین نواز ہی تھیں۔اس کیفیت نے بدترین تذبذب اور الجھائو پیداکردیا۔پاکستان کی فوجی اشرافیہ کے اہم حصوں اور ریاستی افسر شاہی کے چینی افسرشاہی (کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ)کے ساتھ قریبی اور گہرے تعلقات قائم تھے۔روس اورچین دونوں کی افسرشاہی نے ”ایک ملک میں سوشلزم “کی پالیسی اپنائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ان کا سوشلزم بگڑکر ایک قومی شاونزم کی شکل اختیار کرچکاتھا۔دونوں قوموں کے”کامریڈز“ایک دوسرے کے ساتھ بندوق اور گولہ بارود کی زبان میں بات کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ان تنازعات نے روس چین جھگڑے کو تقویت دی اورانہیں دوسرے سے بدظن کردیا۔اس کے سوشلسٹ تحریکوں پر ،خاص طورپر نوآبادیاتی ممالک میں انتہائی تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔لینن کے بین الاقوامیت کے طریق کار کے اصول کے بالکل برعکس یہ دونوں تنگ نظر قوم پرستانہ ایجنڈے کو اپنائے ہوئے تھے ۔اسے ترجیح دینا درحقیقت ان دونوں ملکوں کی افسرشاہی کے مفادات میں تھا۔اگر چین' یونائیٹڈ سٹیٹس آف سوویت ریپبلکس **USSR** کا حصہ بن جاتا،جیساکہ لینن کی خواہش تھی کہ **USSR** کو دنیا بھر کے سوشلسٹ ملکوں کی یونین بنادیاجائے گا ،توآج دنیا کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔بالادست پاکستانی طبقات اور بھارتی حکمران طبقات کی باہمی دشمنی کی وجہ سے اور سوویت یونین کی طرف سے نہروزدہ سوشلزم کی تائیدوحمایت کرنے کے باعث ،چینی افسرشاہی نے روس کا مقابلہ کرتے ہوئے پاکستان کی فوجی جنتا کی حکومت کی دامے درمے سخنے امداد شروع کردی۔

ٹیڈ گرانٹ نے چینی افسرشاہی کے کرداراورقوم پرستانہ سوشلزم کی غارتگر سٹالنسٹ پالیسی کے بارے میں لکھا”چینی سٹالنزم کا حقیقی چہرہ نوآبادیاتی ملکوں

میں قیادت کی موقع پرستی سے عیاں ہو جاتا ہے۔ جہاں کئی ملکوں میں فرسودہ استحصالی جاگیردارو سرمایہ داربالادست طبقات کو بلا روک ٹوک حمایت سے نوازا جارہاہے۔یمن میں امام،افغانستان میں خوانین،سری لنکا وپاکستان کے حکمرانوں، انڈونیشیاکے سوئیکارنووغیرہ ۔وسائل میں مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے انہوں نے چینی معیشت کے کمتر ذرائع کو بروئے کارلاتے ہوئے روسی افسرشاہی اور سامراج کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ان کے نظریات اور ان کے تصورات تنگ نظر چینی بیو رو کریسی کے قوم پرستی کے مفاد ات سے بلندنہیں ہو سکتے ۔ روسی افسر شاہی کی مانند ان کی ’’ بین الاقوامیت‘‘ بھی اسی کمتر تنگ نظر سوچ کے سوا کچھ بھی نہیں جسے وہ روسیوں کی عالمی حمایت لینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اپنی ترقی کے مراحل طے کرنے کے معاملے میں‌ان کا نظریہ،ان کا طریق کاراور ان کے رویے روسی افسرشاہی کی طرح سے ہی مارکسزم کے منافی اور قاطع ہیں‘‘۔(9)

جنوری **1965**ء کے دھاندلی زدہ انتخابات میں کامیابی کے بعد ایوب خان کوعالمی سطح پر سب سے پہلے جو مبارکبادملی وہ چین کے وزیراعظم چو این لائی کی طرف سے تھی جس نے ایوب کی کامیابی کو ایک’’ تاریخی‘‘فتح قراردیاتھااور کہاکہ یہ ایوب کو عوام کی بھرپورحمایت میسرہونے کا ثبوت ہے۔ **1965**ء کی جنگ کے بعد چین کی پیپلز لبریشن آرمی کے کمانڈر مارشل چین ین نے پاکستان کا دورہ کیااور اس نے ایوب خان کی طرف سے قائم کردہ’’ بنیای جمہوریت‘‘کو چینی کمیونوں کا ہم پلہ قرار دیا۔اپنے ایک بیان میں اس نے’’ جنرل ایوب کی ملک کو متحدومستحکم رکھنے کی شاندار خدمات پر اسے خراج تحسین پیش کیا،جس کی قیادت میں دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے گئے‘‘۔(10)

1967ء میں پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے چینی تاجروں کے ایک وفد نے حسب ذیل بیان دیا’’ایوب خان کی دلیرانہ قیادت میں پاکستان نے صنعت اور زراعت دونوں شعبوں میں مثالی حاصلات کی ہیں ،اور وہ دن دور نہیں جب پاکستان ہر قسم کی معاشی غلامی سے آزادہوجائے گا ‘‘۔(11) ایسے بے شمار بیانات چینی افسر شاہی ایوب خان کی تعریف وتوصیف میں جاری کرتی رہی جس کے بعد پاکستان میں چین نوازسوشلسٹوں کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچاتھا سوائے اس کے کہ وہ اس آمرانہ حکومت کی حمایت کریں۔پاکستان کے روس نواز اور چین نواز سوشلسٹوں کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ ایک مارکسی تجزیے اورتناظرسے محروم تھے۔وہ ایک جدید،برمحل نظریاتی و سیاسی تناظرکی حامل ٹھوس کیڈربنیاد تعمیر کرنے کی بجائے محض سرگرم عمل ہونے کو ہی اپناوطیرہ بنائے ہوئے تھے۔روس اور چین دونوں ملکوں میں منصوبہ بند معیشت کے تحت تیزترین ترقی نے ان میں ٹھہراﺅ اور تعطل پیداکردیاتھا۔’’بس عمل ہی سب کچھ ہے ‘‘کی نفسیات ان میں‌رچ بس گئی تھی اور اس کی وجہ ان دونوں ملکوں میں ہونے والی ترقی کا موازنہ تھا جو یہ

اپنے ملک کے ساتھ کیا کرتے تھے۔روس اور چین کی افسرشاہی کی تعریف وتوصیف اورٹراٹسکی سمیت کئی مارکسسٹوں کا مذاق اور تمسخر اڑانا،بس یہی ان کا سوشلزم تھاجنھوں نے دہائیوں پہلے لکھاتھا کہ ان سوشلسٹ ملکوں کا بالآخر انجام کیاہوگا۔ لینن نے 1921ء میں،اور اس کے بعد1936ء میں ٹراٹسکی نے اپنی معرکۃ لآراکتاب" انقلاب سے غداری' (Revolution Betrayed)اورپھر ٹیڈ گرانٹ نے 1943ء،1951ء اور1959ء میں لکھی گئی اپنی کئی تحریروں میں سوویت یونین کے زوال اور سٹالنزم کے تتر بتر ہوجانے اور عوامی جمہوریہ چین کی نام نہاد منصوبہ بند معیشت کے بکھر جانے کی پیشین گوئیاں کر دی تھیں۔

بکھرا ہوا بایاں بازو

ماسکونواز کمیونسٹ پارٹی کے ایک ترجمان نے اپنے ایک بیان میں طبقاتی مصالحت کے حامل دومرحلوں کے نظریے کا اعتراف کرتے ہوئے کہاکہ:

"ہماری جدید ابھرتی ہوئی بورژوازی بہت جلدعالمی منڈی میں امریکی اور یورپی بورژوازی کے تسلط کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک معاشی لازمے کے طورپرحبیب اللہ،ولیکا اور سہگل ان سب کو سوشلسٹ بلاک کے ساتھ تجارت کرناہوگی۔یہ عمل ہمیں مغربی اجارہ داری پر قابو پانے میں مدد دے گا۔یہی وہ سمت ہے جس کی طرف اس وقت ہم رواں دواں ہیں۔اگر اس موقع پر میں صدرایوب کی حکومت کی مذمت یا مخالفت کرتاہوں' جب وہ بائیں بازو کے لیے یہ رستہ کھول رہا ہے تو یہ محض میرا پاگل پن ہی ہوگا"۔(12) طبقاتی تضاد کے معاملے میں اس قسم کی نظریاتی توضیحات اور تذبذب نے ناگزیر طورپر پاکستان کی سوشلسٹ تحریک کوشدید کوتاہ نظری کا شکار کردیا۔اورایک بالشویک لیننسٹ پارٹی کی تعمیروتشکیل کے رستے کی یہی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی جو ان دنوں پیش آنے والے واقعات میں قیادت کا خلاپرکرسکتی تھی۔طبقاتی مصالحت کے حامل نظریے نے موقع پرستی کو فروغ دیا جس کا نتیجہ مہم جوئی اور الٹرالیفٹ ازم کی صورت میں سامنے آیا۔بے شمار بائیں بازو کے کارکنوں ، نوجوانوں نے بے مثال اور قابل تحسین قربانیوں کی داستانیں رقم کیں اور بدترین ریاستی جبر کا کمال خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ بھی کیا۔ان کی اس یادگار جدوجہد اور فقیدالمثال قربانیوں کا حتمی مقصد سوشلزم اور کمیونزم ہی تھا مگر المیہ اور حقیقت یہ تھی کہ ان کی قیادت بورژوا جمہوریت کی حاشیہ بردار بنی ہوئی تھی۔جوں جوں ان کارکنوں کو اس کیفیت کا ادراک ہوتاگیا توں توں وہ تذلیل کے احساس میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔کئی ایک تو سیاسی تیاگ میں چلے گئے جبکہ کئی دوسرے جرائم اور بدعنوانی کی

لپیٹ میں آگئے۔آخر کار انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کے نظریے نے ان کے ساتھ غداری کی ہے۔المیہ یہ تھا کہ انقلابی سوشلزم کو دومرحلوں کی نظریاتی غلطی اور بددیانتی کا رنگ روپ دے دیا گیا تھا جو درحقیقت اپنی ہئیت اور نوعیت میں منشوازم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

سیاسی عدم تیاری کی اس کیفیت میں جب کوئی تنظیمی صلاحیت ہی موجودنہیں تھی اور جب کوئی مارکسی تناظر مفقودتھا اورپاکستان کے سبھی بائیں بازو کے دانشوروں کے مابین کوئی بھی نظریاتی تال میل نہیں تھا،ایسے ماحول میں **1968/69**ء کے انقلابی واقعات نے بائیں بازو کے دانشوروں اور لیڈروں کو حواس باختہ کردیا کہ کریں تو کیا کریں اور جائیں تو کہاں جاہیں!سٹالنسٹوں کے کردار نے اس کیفیت میں جوخلا چھوڑااسے پاکستان جیسے ملک میں پاپولزم نے پرکردیا۔

پاپولزم اور بھٹو

پاپولزم دراصل ا س تضاد کا شاخسانہ اور نتیجہ تھا جوسٹالنزم کی دو مرحلوں کے نظریے اور نوآبادیاتی ممالک میں پھوٹنے والی بڑی عوامی تحریکوں کی سوشلسٹ جستجواورکردار کے مابین پیداہواتھا۔ پاپولزم کا یہ مظہرزیادہ تر دوسری عالمی جنگ کے بعد ابھرا ۔اس کی بڑی مثالیں ارجنٹائن میں پیرون ازم،انڈونیشیا میں سوئیکارنوازم،مصر میں ناصر ازم سمیت ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی اور ملکوں کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔پاپولزم کایہ جدیدمظہر ایسے انفرادی قائدین پر مبنی تھاجو تاریخی واقعات اورحادثات کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آتے چلے گئے اورجنہوں نے انقلابی نعرے بازی اور سوشلسٹ جوشیلے پن کو بروئے کار لاتے ہوئے مقبولیت اور اقتدار حاصل کرلیا۔یہ مظہر اپنی سرشت میں ایک قدیم سیاسی ثقافت کا بھی نتیجہ تھاجس میں ایک فرد کو عوام کے ہیرو اورنجات دہندہ کے طورپر بڑھاچڑھاکر پیش کرنا معمول چلا آرہاتھاکہ بس وہی ہوگا' وہی آئے گا جو عام لوگوں کوان کودرپیش ذلتوں' محرومیوں اور اذیتوں سے نجات دلائے گا۔اس قدر غیرمعمولی مقبولیت اور انحصارکی بدولت ایک بے پناہ طاقت ایسے افراد کے پلڑے میں آگری ۔مگر اپنی بے پناہ مقبولیت کو مستحکم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کیلئے یہ افراد محض چند ایک انقلابی اصلاحات ہی کر سکتے تھے۔سرمایہ دارانہ نظام جوایسے رہنمائوں سے وابستہ ہو چکے عوام کی ذلتوں' محرومیوں اوراذیتوں کا ذمہ دارتھا ،کو ختم کرنے کیلئے درکارانقلابی مارکسزم کی نہ ان میں سمجھ بوجھ تھی نہ ہی انہوں نے انقلابی نظریات کی حامل پارٹیاں بنائی ہوئی تھیں جن کے ایسے تنظیمی ڈھانچے موجودہوتے جو پرانے استحصالی نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت اورجرات

سے مالامال ہوتے۔

لیکن پھر جیسا کہ بوناپارٹسٹ ریاستوں میں ہورہاتھا ،ان پاپولسٹ قیادتوں نے دومرحلوں کے نظریے کی نفی کرتے ہوئے ایک بگڑی ہوئی یا نامکمل شکل میں ہی سہی، ٹراٹسکی کے نظریہ مسلسل انقلاب پر عمل کرنے کی کوشش کی،ہرچندیہ کوشش بھونڈے اندازمیں تھی۔مگر اس کیلئے درکار روایتی کارکنوں، سوشلسٹ یاکمیونسٹ پارٹیوں کی غیرموجودگی کی وجہ سے یہ پاپولسٹ قیادتیں عوامی اظہارکی سیاسی روایت بن گئیں۔تاہم ان کا کردار ان کے ملکوں میں اپنے اپنے وقتوں میں چلنے والی مزدوروں اورمحروم عوام کی تحریکوں کی حالت اور کیفیت کی ہی غمازی کرتاتھا اورکرتا ہے۔روایتی بائیں بازو کی پارٹیوں کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل اور بھی تیزترہوتاچلاگیا ۔کچھ ماسکونواز عناصرجو قوم پرست،جمہوریت پسنداورترقی پسند پارٹیوں میں کام کر رہے تھے" جمہوری اتحاد "میں شامل ہو گئے۔یہ مختلف النوع بورژوا،دائیں بازو کی پارٹیوں کا اتحاد تھا۔اس عظیم اتحاد کا ایک سرخیل نوابزادہ نصراللہ خان تھا جو کہ ایک انتہائی رجعتی قدامت پرست سیاستدان اور جنوبی پنجاب کا ایک کوتاہ نظر جاگیردار تھا ۔بدقسمتی یہ تھی کہ اس اتحادمیں انتہائی رجعتی جماعتیں بھی شامل تھیں جن میں اسلامی بنیادپرست بھی تھے۔اس وقت امریکی سامراج کی رکھیل اور مذہبی جماعتوں کی سرخیل جماعت اسلامی بھی دائیں بازوکے اس اتحاد کاحصہ تھی۔

عظیم جرمن فلسفی ہیگل نے کیا شاندار کہاتھا کہ وہ جو تاریخ سے نہیں سیکھتے ،آخرکار اسے دہرانے پر مجبورہوجاتے ہیں۔ بائیں بازو کے قائدین ابھی تک بورژوااتحادوں کا حصہ بن کر جمہوریت کی تگ ودو میں مصروف تھے۔ اسی دوران ہی یہ قائدین پارٹی پارٹی کا کھیل بھی کھیل رہے تھے اور جمہوریت جمہوریت کا راگ بھی الاپتے جارہے تھے،وہ بھی اس کیفیت میں کہ ان کے ارد گرد'آس پاس ایک انقلابی تحریک زوروشورسے جاری تھی مگر جو ان سے بے نیازہوکر اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔ذوالفقار علی بھٹو حالات واقعات کی نزاکت کو سمجھتے اور بھانپتے ہوئے" سوشلزم آوے ای آوے "سمیت کئی انقلابی نعروں کے ساتھ تحریک کاشریک سفربن چکاتھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے پروگرام نے عوام کے جذبوں امنگوں اور ضرورتوں کو اپناحصہ بنالیاتھااوریوں راتوں رات ہی پاکستان پیپلزپارٹی پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی عوامی پارٹی بن گئی۔پارٹی کے ابتدائی کیڈروں اور سرگرم کارکنوں میں مائوا سٹ دھڑے اور بکھرے ہوئے سوشلسٹ شامل تھے جو روایتی سٹالنسٹ بائیں بازو کی قیادت سے برگشتہ ونالاں تھے۔ پارٹی کا پہلا تاسیسی کنونشن مین بلیوارڈ گلبرگ لاہور میں واقع ڈاکٹر مبشرحسن کے گھر پر30نومبراوریکم دسمبر 1967ء کی درمیانی شب کوہواتھا۔پارٹی کی بنیادی دستاویزات بھٹو اورجے اے رحیم نے 1966ء میں پیرس، فرانس میں تحریراور مرتب کر لی تھیں،انہیں

ڈاکٹر مبشرحسن ،جوکہ ”پرنسپلزکمیٹی“کا بھی ممبر تھا،کے ساتھ طویل بحث مباحثوں کے بعد حتمی شکل دے کراس کنونشن میں منظوری کیلئے پیش کردیا گیا۔ ان انتہائی انقلابی دستاویزات میں نئی پارٹی کے قیام کا مقصد اور ہدف سماج کی سوشلسٹ تبدیلی قرار دیاگیاتھا۔اس کنونشن میں شریک افراد کی اکثریت اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ ایک نئی تاریخ رقم کرنے جارہے ہیں۔

پیپلزپارٹی کی تاسیسی دستاویز میں قراردیاگیا ”پارٹی پالیسی کا حتمی مقصدطبقات سے پاک معاشرے کا قیام ہے جوہمارے وقتوں میں صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔(13)

اور پھر جیسا کہ توقع کی جارہی تھی،بھٹوکی اس کنونشن میں تقریرنے سب کو اپنی توجہ کامرکز بنالیا،یہ جوش' جذبے' ولولے سے بھرپور تھی۔بھٹونے اپنی تقریر کو ان کلمات پر ختم کیا”ہمارے سامنے بڑا مقصد ہے جس کیلئے ہمیں ہر مشکل' ہر رکاوٹ سے گزرنا ہے اوراس نظام کو ختم کرنا ہے،استحصال کو ختم کرنا ہے اور یہ صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے 'یہی وجہ ہے کہ سوشلزم ہی ہماری پارٹی کا نصب العین ہے“۔(14)

اس تاسیسی کنونشن کے فوری بعد بھٹوایک بھرپور سیاسی عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کے دورے پر نکل پڑا۔اسے اچھی طرح احساس تھا کہ عوام ایک انقلابی تبدیلی کی جستجو میں تڑپ رہے ہیں۔عوام کی ناآسودہ اورتڑپتی ہوئی آرزوئوں کو وہ اپنے اس دورے میں ایک سوشلسٹ انقلابی کے طورپر پیش اوربیان کرتا گیا۔وہ سوشلسٹ تبدیلی کے ذریعے سماج کی حالت بدلنے کا اعلان کررہا تھا ۔انہی دنوں کی انقلابی تقریروں میں سے ایک میں 1968ء میں بھٹو نے کہا”میرے دوستو!میرے بارے میں کہاجاتاہے کہ میں ایک دولتمند انسان' ایک جاگیردار ہوں۔کہاجاتاہے کہ مجھے اپنی دولت تقسیم کرنے سے پہلے سوشلزم کیلئے جدوجہد کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ مگر سوشلزم کاقیام اور حصول اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب تمام ذرائع پیداوار ریاست کے کنٹرول میں آجائیں۔مگر اس کے باوجود بھی اگر میری جائیداد قوم کے کسی کام آتی ہے تو مجھے اس پر ایک لمحے کی بھی جھجھک اور ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔لیکن میں اس نظام کے ہوتے ہوئے کسی طوربھی یہ بیوقوفی نہیں کروں گا کہ میری جائیداد سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مصرف میں آجائے تاکہ وہ مزید منافعوں 'مزیدلوٹ مار کے ذریعے اپنی عیاشیوں میں اضافہ کرلیں“۔

”مگر اس قسم کے فضول دلائل سے لوگوں کو بھی بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا ۔میں سوشلزم پر یقین رکھتا ہوں' اسی یقین کی وجہ سے میں اپنا طبقہ چھوڑکرا س سے الگ ہوچکاہوں اور آپ مزدوروں' کسانوں اور غریب طالب علموں کے ساتھ آشامل ہوا ہوں۔میں آپ سب سے محبت کرتاہوں اور مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے سوائے محبت احترام اوربھرپور ساتھ کے۔دنیا کی کوئی بھی طاقت سوشلزم کو نہیں روک

سکتی۔یہی انصاف کی برابری کی اور عظمت آدم کی علامت ہے۔اسی کوپاکستان میں متعارف کرنا اورلاگوکرناہے۔یہ وقت اورتاریخ کا تقاضاہے۔اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اسی نعرے اسی آوازکومیں جگہ جگہ لوگوں میں پھیلارہاہوں۔میں ایک سوشلسٹ ہوں ‘ایک دیانتدار سوشلسٹ جو اپنی آخری سانس تک غریبوں کیلئے لڑتارہے گا۔کچھ لوگ میرے سوشلسٹ ہونے پر میرا مذاق اڑاتے ہیں مگر مجھے ان کی کوئی پروا ہ نہیں ”۔(15)

پاکستان پیپلزپارٹی کا قیام

جوخواتین وحضرات پیپلزپارٹی کے اس تاسیسی کنونشن میں شریک ہوئے تھے،وہ اپنی اپنی سماجی شناخت ،اپنی پچھلی سیاسی وابستگی اور عمومی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مختلف النوع قسم کے اجتماع کا حصہ تھے۔پیپلزپارٹی کے اہداف ومقاصد اورخود بھٹوکے حوالے سے ان کے مختلف نقطہ ہائے نظر اورتحفظات تھے۔ان میں سے کچھ اچھے دنوں کے متلاشی تھے اور مستقبل میں اپنے لیے محفوظ ومناسب مواقع کے آرزومندتھے اور اس مقصد کیلئے بھٹوکے قریب تر ہونے کی جستجودل میں لیے ہوئے تھے۔کچھ بھٹو کو ایوب کا مضبوط مدمقابل ہی سمجھ رہے تھے جو فوجی وسول افسرشاہی کی آمریت کے خلاف صف آراتھا اور جو مختلف سیاسی رحجانات کو ساتھ ملاتے ہوئے ملک کو حقیقی جمہوریت سے روشناس کراسکتاتھا۔ انہی میں ایسے بھی کچھ طلبہ اورجاگیرداری کے مخالفین تھے جو بھٹوکو ایک حقیقی ترقی پسند جمہوری سوشلسٹ سمجھ رہے تھے جوایک بہت بڑی منظم سیاسی پارٹی کے ساتھ سماج اور معیشت کو سوشلسٹ بنیادوں پر چلانے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔بھٹوکا اپنا ارادہ یا خیال ایک پارٹی کا نہیں تھابلکہ ایک سیاسی تحریک کا تھا۔جہاں مختلف دھاروں اوردھڑوں کے پرجوش اور باہمت لوگ مل بیٹھ کر اسے اپنے چیئرمین کی اتھارٹی سے سرفرازکرتے ۔بلاشبہ اس کا مقصد یہی تھا اسی لیے نہ تو نظریات اور نہ ہی تنظیم کے طریقہ کار کو ٹھوس انداز میں مرتب اور تشکیل دیا گیا۔پارٹی کا تاسیسی کنونشن میں پارٹی کیلئے نظریات اور تنظیم کی ضرورت پر قرار واقعی بحث نہیں ہوسکی‘یہ دونوں پہلو بعد میں پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے زیرغور اورعمل میں لائے گئے تھے۔

بھٹو ایک مارکسسٹ نہیں تھا۔وہ تو 1968/69ء کے انقلاب کے تندوتیز اور زندہ و پائندہ واقعات کے دھارے کا شریک سفر ہونے اور لوگوں کی رہنمائی کا مقصد پوراکرنے کی خواہش رکھنے والا ایک لیڈر تھا۔وہ صحیح وقت صحیح موقع پر واقعات وحالات کے ساتھ ہم رکاب اور ہم آہنگ ہواجس نے خودکوعوام کے تبدیلی کے بپھرتے ہوئے جوش وجذبے کی رہنمائی کیلئے پیش کردیا۔بھٹو ایک وسیع المطالعہ انسان تھاوہ کئی ملکوں‘

کئی سماجوں اورکئی تحریکوں کو دیکھ چکاتھا اور دیکھ بھی رہاتھا۔وہ امریکہ اور برطانیہ کی کئی اعلیٰ درسگاہوں کا فارغ التحصیل تھا۔اس کی سیاسی سمجھ بوجھ بڑی حدتک غیرمعمولی تھی اور وہ سمجھ رہاتھا کہ دنیا کس رخ پر جارہی تھی۔خاص طورپر 1940/50ء کی دہائیوں میں ہونے واقعات نے اس کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔اس کا موازنہ کسی طور بھی چو این لائی سے تو نہیں کیاجاسکتا مگراس عہد میں نوآبادیاتی ممالک میں مراعات یافتہ طبقے سے ایسے کئی رہنما ابھر کر سامنے آئے جو عالمی جنگ کے بعد سے ان ملکوں میں پھٹنے والی عوامی تحریکوں سے شدید متاثر ہوئے تھے۔نوآبادیاتی انقلابات میں ہم اس قسم کی کئی مخصوص کیفیات دیکھ سکتے ہیں کہ جن میں بالادست طبقے کے کئی افراد سوشلسٹ نظریات کی طرف مائل ہو گئے تھے مگربھٹو اس قدر آگے نہیں بڑھاتھا۔بیرون ملک سے واپسی کے بعد 1956ء میں اسے صدر سکندر مرزا کی کابینہ میں شامل کرلیاگیاتھا۔ اور اس کے بعداسے 1960ء کے اوائل میں ایوب خان کی کابینہ میں وزیرخارجہ بنادیاگیاتھا۔

سوبھوگیان چندانی نیوزلائن کو دیے گئے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں بھٹوکی اس عبوری کیفیت بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہتا ہے”بھٹو عوامی پارٹی میں شمولیت اختیار کرناچاہتاتھا۔جی ایم سید نے اس حوالے سے مجھے ایک لطیفہ سنایاکہ بھٹو ایک دن میرے گھر آیااورکہنے لگاکہ شاہ صاحب !میں آپ کی پارٹی میں شامل ہوناچاہتاہوں۔میں نے بھٹوسے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ ہماری پارٹی تو باغیوں کی پارٹی ہے۔بھٹو نے کہا جی میں جانتاہوں۔کامریڈحیدربخش جتوئی جو اس وقت وہاں موجود تھے‘ نے اس دوران ٹوکتے ہوئے کہاکہ کیا تم اپنے والد سے پوچھ کر آئے ہو؟ایک خان بہادرکا بیٹا ایک باغی پارٹی کا ممبرنہیں بن سکتا۔جس پر بھٹو نے پیچھے مڑکر دیکھتے ہوئے کہاکہ انقلاب حیدربخش جتوئی کی ہی اجارہ داری نہیں ‘میں بھی ایک انقلابی ہوں۔مگر حیدر بخش اپنی بات پرڈٹا رہا جس پر بھٹو نے اپنے والد سے فون پر بات کی۔اس کے بعد سکندرمرزا نے شاہنوازبھٹو سے بات کی اور کہاکہ میرے پاس تمہارے بیٹے کیلئے ایک شاندارکیرئیر ہے اور آپ اپنے بیٹے کو باغیوں کی پارٹی میں شامل ہونے سے روك لو۔ اگلے دن بھٹو آیا اور اس نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا جس پر حیدربخش جتوئی نے بھٹو سے کہا دیکھا‘ میں نہ کہتاتھا “۔(16)

1965ء کی جنگ کے بعد بھٹو اور ایوب کے مابین علیحدگی ناگزیر ہوگئی تھی کیونکہ حکمران طبقات کے مابین تنازعات اور تصادم کی کیفیت پیداہو چکی تھی ۔جنگ کے بعد جو صورتحال جنم لے رہی تھی اس میں ایسا ہونا ہی تھا۔جنگ نے معاشی اور سماجی بے چینی میں شدید اضافہ کردیاتھا۔اگرچہ فوری طورپر یہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے تاہم اس سے حکمران دھڑے کااتحاد بکھر گیا اور ان میں تصادم پیداہوگیاتھا۔جب

ایوب خان نے بھٹو کو کابینہ سے نکال دیاتو اس کی انا سخت مجروح ہوئی۔بھٹونے اس فوجی آمر سے انتقام لینے کا فیصلہ کرلیا جسے وہ سیاسی طورپر اور دانش کے اعتبار سے خود سے کمترسمجھتا تھااورشاید ٹھیک ہی سمجھتا تھا۔مگر اس سارے عمل میں ،بھٹو کو حاصل ہونے والی ڈرامائی شہرت نے اسے عوام کے نزدیک مظلوم بنا دیا۔برصغیر کی ثقافت میں‌ظلم یا ناانصافی کا شکار ہونے والے کو غیر معمولی حمایت میسر آجاتی ہے اورلوگ اس کے ساتھ انتہائی ہمدردی جتاتے ہوئے اپنے ساتھ پیش آنے والی زیادتیوں کو اس طریقے سے بھلانے یامٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ہمدردی کی اس بے حدوحساب لہر نے بھٹو کو ایک شخصی اثرورسوخ سے نوازدیاجس کی وجہ سے اسے عوام کے مزاج اور سیاسی دھارے کی قیادت کرنے کا موقع مل گیا۔لیکن یہ اس ساری مساوات (Equation)کا ایک ہی رخ ہے۔معروضی صورتحال بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوجاتی جارہی تھی۔بھٹوکو عوام کی مزاج شناسی کا فن حاصل تھا،اسے پتہ چل جاتا تھا کہ عوام کے ذہنوں میں کیا تبدیلیاں پنپ رہی ہیں اور ان کی جستجو کیا ہے۔چنانچہ اس حوالے سے بھٹو اور عوام کے مابین موضوعی اور معروضی اعتبار سے ایک تعلق اور تال میل پیداہورہاتھا۔بھٹوعوام کی حالت بدلنے کیلئے ، جس کیلئے وہ ترستے آرہے تھے، ایک انقلابی تبدیلی اور سوشلسٹ پروگرام کی ضرورت کو سمجھ چکا تھا۔ دوسری طرف عوامی تحریک کی طوفان کی سی تیزی بھٹو کو مزید ابھارتی اور جلا بخشتی جارہی تھی۔اس کی تقریروں' اس کی سرگرمیوں اور اس کے انداز نے صورتحال اور واقعات کو آسمانی بجلی کی تیزی کے ساتھ آگے بڑھانا شروع کردیاتھا۔پہلی بار یہ ہورہاتھاکہ پاکستان کے عوام اتنے زوروشور' اتنی شدت اور اتنے جوش وجذبے کے ساتھ سوشلسٹ انقلاب کے نام اور نعرے کو سن رہے تھے جسے بھٹو ہر طرف' ہر جگہ پھیلاتا جارہاتھا۔

اپریل1968ء میں "پاکستان کی سیاسی صورتحال"کے عنوان سے چھپنے والے ایک پمفلٹ میں بھٹو نے لکھا" اضطراب اور تذبذب کی صورتحال میں سے یقین و اعتماد کی ایک کیفیت برآمد ہو رہی ہے۔ لوگ بیدار ہورہے ہیں،نئی نسل اپنے سر اٹھانا شروع ہوگئی ہے۔وہ اس یقین سے سرشار ہو چکے ہیں کہ اب پاکستان کے لوگوں کے عرصے سے چلے آرہے برے دن ختم ہونے والے ہیں ۔ہر عہد کی اپنی ہی ایک سیاسی اہمیت اور مخصوص کیفیت ہواکرتی ہے۔ہماراعہد بھی جوش جذبے سے بھرپور ہے جس میں‌ہر طرف چیلنج ہمارے سامنے ہیں۔جوپاکستان کے عوام سے نئے خواب نئی امنگیں اور نئے حوصلے چاہتے ہیں ۔ہم کسی طور ماضی کی طرف پیچھے جانے کو تیار نہیں ہیں‌اور نہ ہی عوام اس زبوں حالی کو زیادہ دیر تک برداشت کر سکتے ہیں۔اس لیے پاکستان پیپلزپارٹی اعلان کرتی ہے کہ" طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں"۔(17)

جمہوریت کے بارے میں بھٹو کا فہم و ادراک جامع اوربالکل درست

تھا۔بورژواجمہوریت کی وضاحت کرتے وقت وہ لینن کے اس نقطہ نظر کے قریب قریب ہوتاتھاجو اس نے ”پرولتاری انقلاب اوربھگوڑا کاوتسکی“میں بیان کی تھی۔بھٹو نے اپنے مذکورہ بالا پمفلٹ میں لکھاکہ:

”جمہوریت بلاشبہ ایک لازمی ضرورت ہے مگر پھر یہ ہر مسئلے کا حل نہیں۔جمہوریت کو فروغ دینے کے عمل میں ہم کسی طور معیشت کو نظرانداز نہیں کر سکتے ۔معاشی ترقی کے بغیر کوئی قوم بھی جمہوریت سے اطمینان اور آسودگی حاصل نہیں کر سکتی۔جمہوری آزادی لازمی ہے مگرمعاشی برابری اور انصاف اس سے بھی بالاآدرش اور حق ہے۔ معاشرے میں کامل تبدیلیاں معاشی تبدیلیوں کے بغیر ناممکن و محال ہوتی ہیں۔معاشی مسائل ہمیشہ اہمیت اور توجہ کے حامل ہوتے ہیں۔اگر لوگوں کی محرومیوں کاخاتمہ کرناہے توجمہوریت کو بہر حال روشن خیال سوشلزم کے ساتھ شانہ بشانہ چلناہوگا۔ اس وسیع آبادی کے حامل ملک کے وسائل ضائع ہوتے چلے جارہے ہیں۔عالمی منڈی میں اجناس کی قیمتیں گرتی چلی جارہی ہیں جس کی وجہ سے ہم باہر کے ملکوں سے کچھ منگوانے کی حیثیت نہیں رکھے۔صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ہم استحصال کا خاتمہ اور اتحادویگانگت کا حصول ممکن بنا سکتے ہیں۔استحصال کی موجودگی میں اتحاد محض ایک نعرہ اور دھوکہ ہی رہے گا“۔

”ہم معاشی تباہی کے دہانے پر پہنچے ہوئے ہیں،ایک نیا طبقہ جو تعدادمیں انتہائی قلیل ہے جو بیشتروسائل پر قابض ہوچکاہے اور قومی دولت کو لوٹتاچلاجارہاہے۔امارت اور غربت میں فاصلہ بڑھتاہی چلاجارہاہے۔پاکستان میں اس وقت صرف لوٹ مار کا دوردورہ ہے۔نجی سرمائے کوفروغ دینے کے نام پربے پناہ اور بے حدوحساب لوٹ مار کے رستے ہموار کیے جارہے ہیں“۔(18)

بھٹو ایک بارپھر سوشلزم کی تعریف کرتے ہوئے کہتاہے کہ:

”صرف اور صرف سوشلزم ہی سب کیلئے برابری کے مواقع مہیاکرسکتا ہے،ہر قسم کے استحصال کاخاتمہ کرسکتاہے،طبقاتی امتیاز کو ختم کرسکتاہے اور سماجی انصاف ومعاشی برابری کو ممکن بنا سکتا ہے۔سوشلزم ہی جمہوریت کی اعلیٰ ترین کیفیت پیداکرسکتاہے اور اسے منطقی اطمینان سے سر شار کر سکتا ہے۔ سوشلسٹ نظریات کی عالمگیریت کی دوبڑی وجوہات ہیں؛پہلی تو یہ کہ جدید سوشلزم کی بنیادہمہ گیر ہے ،دوسرا سوشلسٹ نظریہ ان سبھی ملکوں کیلئے کارآمد اور کارگر ہے جنہیں حقیقی معنوں میں اپنی سیاسی و معاشی حالت سدھارنی ہے۔اس لیے سوشلزم کا نفاذپاکستان کے براہ راست مفادمیں ہے جو کہ ایک ترقی پذیر ملک بھی ہے اور جسے اندرونی وبیرونی استحصال کا بھی سامنا ہے ۔ہمارا خطہ پاکستان بدترین غربت کی زدمیں ہے اس بدقسمت المیے کو صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ختم کیاجاسکتاہے۔ہمارا فوری اورحتمی ہدف

خونخوارسرمایہ دارانہ نظام کاجڑ سے خاتمہ کرنااور اس کی جگہ سوشلزم کی آبیاری کرناہے۔ذرائع پیداوار جو صنعتی ترقی کا وسیلہ ہوتے ہیں ان کو کسی طورنجی ہاتھوں میں نہیں دیاجانا چاہیے۔سبھی ادارے جوقومی معیشت کے انفراسٹرکچرکو ترتیب دیتے ہیں انہیں عوام کی ملکیت میں ہونا چاہیے"۔(19)

26جون1969ء کو حیدرآباد بارایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے واضح اعلان کیاکہ "پاکستان پیپلزپارٹی پاکستان کے عوام کی پارٹی ہے میں یہ واضح اعلان کرتاہوں کہ یہ مزدوروں' کسانوں اور طالب علموں کی پارٹی ہے'یہ ایک انقلابی پارٹی ہے"۔(20)

نظریاتی ابہام

یہ شایدپاکستان پیپلز پارٹی کی سب سے زیادہ انقلابی تشریح تھی۔لیکن یہیں پر پیپلزپارٹی کی کہانی مکمل نہیں ہوجاتی ۔اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بھٹو اور پیپلزپارٹی کے دوسرے قائدین اپنے تما م سوشلسٹ اورانقلابی نعروں' تقریروں اور جذبوں کے باوجودنظریاتی ابہام اور ادھورے پن کاشکار تھے ۔اسی کمزوری کی وجہ سے وہ ایک حقیقی انقلابی پارٹی کی بنیادیں رکھنے میں ناکام رہے۔جو سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑکرپھینکنے کا فریضہ سر انجام دیتے ہوئے سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کا ہدف حاصل کرلیتی۔اور یہ صرف بھٹو ہی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ سبھی دوسرے مائواسٹ اور دیگر سوشلسٹ پس منظر رکھنے والے لیڈروں جومختلف النوع نظریات سے لیس تھے'کا مسئلہ تھا اور یوں ایک کھچڑی سی پکی ہوئی تھی جس میں سوشلزم، قوم پرستی یہاں تک کہ اسلامی سوشلزم کا نعرہ دیوانہ وار لگانے والے اسلامی ملت پرست لوگ بھی شریک و متحرک تھے۔

نظریاتی ابہام ،ادھورے پن اور خلط ملط تصورات کے ملغوبے نے اتنے عظیم انقلاب اور تحریک کو ناکامی کے تپتے سلگتے صحراکی جانب دھکیل دیا۔نظریاتی ابہام اور ایک واضح مارکسی موقف کانہ ہوناخود بھٹو کی اپنی کچھ تقاریر سے واضح تھا۔مثال کے طورپر مانسہرہ میں اپنی ایک تقریر کے دوران بھٹونے پسماندہ اور رجعتی پرتوں کی ہمدردیاں جیتنے کیلئے پاکستانی اور اسلامی تعصب کا آسرا لینے کی بھی کوشش کی۔اس نے طبقاتی امتیاز واستحصال ،سوشلسٹ نظریات کو کمتر کرنے کی بھی کوشش کی جو اس وقت سارے ملک میں موضوع بحث بناہواتھا۔بھٹو نے کہا:

"مسلمانوں اور ہندوئوں کے مابین جھگڑا ایک ہزارسال پرانا چلا آرہاہے۔یہ آگے کیوں نہیں چل سکتا؟اگر ایک قوم ہزار سال تک پہلے لڑ سکتی ہے تو یہ آئندہ بھی لڑسکتی

ہے"۔(21) 3 نومبر 1969ء کوسرحد (پشتونخواہ) میں شیرپائو کے ہاں ہونے والے پارٹی کنونشن میں بھٹو نے ایک بار پھر اسلام اور سوشلزم کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی اور کہا"سوشلسٹ پارٹیاں بھارت میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکیں!اس لیے کہ ہندوازم سوشلزم کا دشمن ہے اوریہ اسلام کا بھی دشمن ہے۔ہندوازم کبھی سوشلزم کو برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ذات پات اور طبقات کا حامل ہے۔سوشلزم بھارت میں اپنی جڑیں مستحکم نہیں کر سکامگر یہ پاکستان کے اندر شاندار نتائج کا حامل ہو سکتاہے کیونکہ اسلام اور سوشلزم میں بہت ہی کم فرق ہے۔میں یہ واضح طورپر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ سماجی اور معاشی شعبوں میں اسلام اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں۔اگر ان دونوں میں کوئی فرق ثابت کردیاجائے تو میں سوشلزم کا ذکرتک ہی ترک کر دوں گا" ۔(22)

اپنی اصل میں یہ ایک واضح تضاد تھا۔ایک معیشت وہ ہے جو سراسر خیرات کی حامل ہے جس میں امیر طبقہ غریبوں کو دیتارہتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یہاں امیر اور غریب طبقات معمول کا حصہ قرار پاتے ہیں۔جبکہ سوشلزم کے اندر طبقات کی تفریق اور امتیاز کا خاتمہ بنیادی شرط ہوتی ہے اور یہ طبقات سے پاک سماج کا علمبردار نظریہ ہے۔انہی دنوں میں اتحادِ اعلام اسلام اورپھر بعد میں بیشتر سٹالنسٹ لیڈروں کی طرف سے" تیسری دنیا "کا نظریہ بھی زور وشور کے ساتھ پھیلایا جانے لگا۔

5جنوری1968ء کو پشاور میں ایک بڑے عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے کہا:

"اگر عرب اسرائیل جنگ کے دوران پیپلزپارٹی موجودہوتی توہم اسرائیلی وزیردفاع کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ کے رکھ دیتے۔مگر افسوس کا مقام ہے کہ دنیاکی سب سے بڑی اسلامی ریاست اپنا وہ کردار ادا نہیں کر سکی جو اسے کرناچاہیے تھا۔آج صورتحال یہ ہے کہ کشمیر بھارت کے اور یروشلم اسرائیل کے قبضے میں ہے۔اور پھرہمارا دعویٰ ہے کہ ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔اگر پاکستان پیپلزپارٹی اقتدار میں آگئی اور انشاء اللہ یہ آئے گی تو تب آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف مزدوروں اورکسانوں کی تقدیر بدل جائے گی بلکہ کشمیر میں کوئی بھارتی اوریروشلم میں کوئی اسرائیلی نظر نہیں آئے گا"۔(23)

26جون1968ء کو ڈسٹرکٹ بار حیدرآبادمیں تقریر کرتے ہوئے بھٹو نے برصغیر کی تقسیم کی نظریاتی بنیادوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"پاکستان محض اس لیے وجود میں آیا کہ ہم مسلمان تھے۔ہم اسلام کیلئے سب کچھ قربان کردیں گے۔اسلام کا مطلب سبھی مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ کرناہے"۔(24)

سارا مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کے مروجہ نظریاتی اور ادارہ جاتی ڈھانچوں کی کیفیت میں رہتے ہوئے قومی جمہوری انقلاب کے تقاضے پورے ہی نہیں کیے جا سکتے ۔اس کے

بنیادی تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر کے ایک سیکولر ریاست قائم کی جائے۔قومی جمہوری فرائض کی تکمیل کر کے بھی سوشلسٹ تبدیلی ممکن نہیں،ہاں البتہ سوشلسٹ تبدیلی کر کے قومی جمہوری انقلاب کے سبھی تقاضے پورے کیے جا سکتے ہیں۔ایک سوشلسٹ انقلاب محض منڈی کی معیشت کو منصوبہ بند معیشت میں ہی نہیں بدلتا بلکہ یہ اپنے انقلابی اقدامات کے ذریعے سرمایہ داری کی سماجی ،ثقافتی،اخلاقی اقدار کو بھی بدل کر بہتر کردیتاہے۔پاکستان بھر کے روشن خیال محمد علی جناح کی11اگست1947ء کی تقریر کا اٹھتے بیٹھتے حوالہ دیتے ہیں تاکہ یہ دلیل دی جاسکے کہ پاکستان کو ایک مذہبی نہیں بلکہ سیکولر ریاست کے طورپر تشکیل دیاجاناتھا ۔یہ تقریر بغیر نوٹس کے کی گئی تھی اور جناح نے کہا تھا کہ ”میں ذاتی طورپر یہی سمجھتا ہوں“۔ پاکستانی روشن خیالوں کی طرف سے پیش کیا جانے والا یہ غیر معمولی حوالہ ان کی تسلی وتشفی کیلئے توکافی ہے مگر جناح کی اکثر دوسری تقریریں اور خیالات اس نقطہء نظر کی تائید نہیں کرتے۔مثال کے طور پر 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا”اس قسم کا الجھائو مجھے تو سمجھ نہیں آتا کیوں پیداکیاجارہاہے کہ پاکستان کا آئین شرعی قوانین سے متصادم ہوگا۔اسلامی اصول ویسے ہی آج قابل عمل ہیں جیسے یہ تیرہ سوسال پہلے تھے۔اسلام صرف عادات واطوارکے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ہر مسلمان کی زندگی کا بنیادی ضابطہ ہے جو زندگی کے ہر پہلوکا احاطہ کرتا ہے یہاں تک کہ سیاست اور معیشت کا بھی“۔(25)

تحریک کے قائدین کی طرف سے سوشلزم کو پاکستانیت اور اسلام کا لبادہ پہنانا اس وقت سماج کے مختلف حصوں کے متضاددبائوکا آئینہ دار تھا جن کی حمایت اس وقت ایک مقبول عام مظہر بن کر سامنے آئی۔یہ توازن قائم کرنے کی کوشش ایک پاپولر بوناپارٹزم کی ہی ایک قسم تھی،جس کی بنیادیں کمزور بھی تھیں اور جو زیادہ عرصہ بھی نہیں چل سکتی تھی ۔اس کا سب سے بڑا ثبوت خود اس عظیم الشان انقلابی تحریک کے بعد اگلے چالیس سالوں میں پیش آنے والے واقعات وحالات ہیں۔

تاریخی طورپر غیرمعمولی اس وقت اور اس عہدکا سب سے نمایاں اور برتر پہلو یہ تھا کہ عوام کا شعور انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکاتھا۔ ملک کے چند ایک پسماندہ علاقوں میں بھٹو کی قوم پرستانہ اور مذہبی جوش وجذبے سے کی جانے والی تقریروں کے باوجود بھی ،ملک کے دوسرے اکثریتی علاقوں میں جو نسبتاًجدید اور صنعت سے وابستہ تھے،وہاں انقلاب کی پکار اور تڑپ اتنی شدید اور زیادہ تھی کہ بھٹوکو انقلابی سوشلزم کے نعرے کو اپنانا اور لگاناپڑا۔

بوناپارٹزم کی دیگر شکلوں کی طرح پاپولزم کی طرف سے بھی مقبول تحریکوں میں متحارب ومتصادم طبقات کے مابین توازن پیداکرنے کی کوشش کبھی دیرپا ثابت

نہیں ہوئی۔ایسی ہر کوشش اپنی بنیاد میں ہی کھوکھلی اور غیر موثرہوتی ہے۔ایسی ہر کوشش میں سماج اور سیاست کے متحارب اور ناقابل مصالحت مفادات کے حامل طبقات کی طرف سے ہمیشہ ہر قسم کے دبائو موجودہوتے ہیں۔ پاپولزم کی جبلتی کمزوری اسے ہر متضاد مفاد اور اس کے دبائو کے آگے جھکنے اور اس کی ہمدردی و حمایت حاصل کرنے کی طرف مجبور کیے رکھتی ہے۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس نوعیت اور کیفیت کی سبھی حکومتوں کی تعمیر میں ہی خرابی کی کئی صورتیں مضمر ہوتی ہیں جو انہیں انجام کار ایک المیے سے دوچار کر دیتی ہیں۔یہ بحرانوں اور مشکلات سے نبرد آزمارہتی ہیں۔پیپلزپارٹی کا ملٹی کلاس پارٹی کا مفروضہ اور تعریف بھی دراصل پاپولزم کے اندرونی تضادات کے گہرے تنائو کی ہی عکاسی کرتا ہے۔ نہ تو کبھی کوئی پارٹی ” ملٹی کلاس “موجودرہی ہے اور نہ ہی کبھی اس نوعیت کی پارٹی ہوسکتی ہے۔آخری تجزیے میں ہر پارٹی یا ایک طبقے کی یاپھر دوسرے متحارب طبقے کی نمائندہ پارٹی ہی ہواکرتی ہے۔کسی پارٹی کو ملٹی کلاس قراردینامحض نعرہ بازی یا ڈھکوسلے کے سوا کچھ نہیں۔پیپلزپارٹی کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اس نے ابتدا توایک پارٹی سے کی مگر بعد میں یہ ایک روایت،شاید ایک امید ،ایک تحریک یاپھرایک پلیٹ فارم بن کے رہ گئی۔جہاں لوگ جب بھی کبھی وہ سیاسی طورپر متحرك ہوناچاہتے ہیں، جمع ہو جاتے ہیں۔لیکن یہاں رہ کر وہ صرف اپنی کسی تحریک کی ابتدا توکرسکتے ہیں،مگرایسی جدوجہدیہاں رك کر کبھی اپنے مقاصد' اپنی منزل حاصل نہیں کر سکتی،اور نہ ہی کبھی اس سیاسی عمل پر تکیہ کر کے ہونے والی کوئی سیاسی سرگرمی عوام کیلئے درکار تبدیلی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتی ہے۔جب پیپلزپارٹی پر سے حکمران طبقات اور سامراج کی گرفت ٹوٹے گی تو یہ پیپلزپارٹی موجودہ پیپلزپارٹی نہیں رہے گی۔اس کی شکل اس کی ہیئیت ہی کچھ اور ہوگی۔ایک سراسرمختلف سیاسی ثقافت اور انقلاب کیلئے جدوجہد سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دے گی۔وہ تو ایک شاندار تحریک تھی،تاریخ کی بڑی بڑی ریلیاں جلسے اور جلوس تھے،کھیتوں کھلیانوں اور کارخانوں پر قبضے اور محنت کش طبقے کا جوش جذبہ اور ولولہ تھا،جو بھٹو کو دن بدن لمحہ بہ لمحہ بائیں بازو کی سیاست کی طرف مائل کرتا چلا جارہاتھا۔یہ بھٹو نہیں تھا جو لوگوں کو آواز دے رہاتھا بلکہ یہ لوگوں کا انقلاب سے معمور جذبہ اور ولولہ ہی تھا جس نے حقیقت میں بھٹو کووہ حوصلہ 'وہ جرات عطا کی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک سوشلسٹ تبدیلی کا نعرہ زن بن کر ابھرتا چلاگیا ۔

پاکستان پیپلز پارٹی پر پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ لکھنے والے (جو ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوا ہے)،مصنف ومحقق فلپ ای جونز نے پارٹی کی نوع اور بھٹو کے کردار پر لکھاہے :

”یہ بات کسی بھی مبالغہ آرائی کے بغیر کی جاسکتی ہے کہ اس ایک فرد کا غلبہ اتنا گہرا ہے کہ یہی اس پاپولسٹ پارٹی کے سبھی تنظیمی اور سیاسی خطوط کو مرتب کرتا ہے۔یہاں شاید یہ کہنا بہت مناسب ہوگا کہ اگر ”تنظیمی بنیاد“ کا ذکر اور موازنہ کیاجائے،تو جیسا کہ بالشویک قسم کی پارٹی کے ساتھ معاملہ رہتاہے ،جو نظم وضبط،نظریات اور تنظیمی اہداف کی بہت پابند ہوا کرتی ہے،اور ایک فردواحدکو اپنا قائد بنائے رکھتی ہے،یا پھر شخصیت پرست قسم کی پارٹیاں جن میں تنظیم اور نظریہ مخصوص سرگرمیوں کی حامل ایک اعلیٰ ترین قیادت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ہر چند یہ دونوں مظاہر عوامی ہوتے ہیں مگر ایک بالشویک پارٹی اپنے اہداف کی بدولت زیادہ انقلابی ہوتی ہے جو نیچے بنیادوں سے اوپر تک ایک نیا ریاستی ڈھانچہ تعمیر کرتی ہے۔مگر دوسری قسم کی پارٹیوں کا مقصداور ہدف یہ ہوتاہے کہ وہ پچھلی حکومتوں سے اقتدار لے کر اپنی طرز اور منشاکے مطابق حکومت چلائیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پارٹیاں اپنی تنظیموں کو اپنے تلے دبائے رکھتی ہیں تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ریاستی ڈھانچے کا حصہ بن سکیں۔پارٹی اور ریاست کے مابین تعلق یا رشتے کی نوعیت سے قطع نظر ان دونوں قسموں کی پارٹیوں کے ماڈل اپنے نتائج ، اپنی قیادت کے اطوار ،اپنی تنظیمی حکمت عملیوں، بھرتی کے طریق کاراور نظریات کے اعتبار سے قطعی مختلف اور منفرد ہوا کرتے ہیں“۔

”اپنے ابتدائی ایام میں اپنے نظریاتی کارکنوں کی شاندار کارکردگی کی بدولت پیپلزپارٹی نے اپنے شروع کے سالوں میں چیئر مین کے عہدے اور ایک مرکزی کمیٹی کی شکل میں اور نیچے تک اپنی تنظیمی بڑھوتری کے حوالے سے خودکو ایک بالشویک پارٹی کے طورپر پیش کرنے کی کوشش کی ۔تاہم پاکستان میں موجود اورمروجہ مخصوص سیاسی وثقافتی رحجانات کی وجہ سے پیپلزپارٹی کو ایک بالشویک پارٹی سے ایک شخصیت پرست قسم کی پارٹی بننے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔اگرچہ یہ عمل 1970ء کے الیکشن سے پہلے ہی پنپناشروع ہوچکاتھامگر اقتدار میں آجانے کے بعد تو یہ عمل تیزسے تیز ترہوتاچلاگیا۔”نظریہ دانوں“ اور ”سیاستدانوں“کے درمیان لمبے عرصے تک چلنے والی اندرونی کشمکش نے پیپلزپارٹی کو ایک ایسے عبوری ڈھانچے میں بدل کر رکھ دیاجو بیک وقت ایک طرف بالادست تو دوسری طرف زیردست طبقات کی نمائندگی کر رہا تھا“۔(26)

بھٹو نے جے اے رحیم کے ساتھ مل کر 16ستمبر1967ء کوحیدرآبادمیں میر رسول بخش تالپور کے گھر پر نئی پارٹی کے قیام کا اعلان کیاجو ایک قومی سطح کی ترقی پسند تنظیم کے طورپرمشرقی ومغربی پاکستان میں اپنی عوامی جڑیں رکھتی ہو۔پارٹی کا تاسیسی کنونشن جیسا کہ بھٹو نے خود تسلیم کرتے ہوئے کہاتھا،اتنی ”بڑی شاندار کامیابی“ ثابت نہیں کر سکاتھا۔پارٹی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ ایوب حکومت بھی چاہتی

تھی کہ یہ اتنا کامیاب نہ ہونے پائے۔ڈاکٹر مبشرحسن کے گلبرگ کے پوش مضافات میں واقع گھر میں جو اندرون شہر اور تعلیمی اداروں کے گڑھ گول باغ سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا،ہونے والے اس کنونشن سے ایک روز قبل ڈھاکہ سے لاہور آنے والی ہر پرواز کی ہر سیٹ پہلے سے ہی خرید لی گئی تھی۔ انگریزی روزنامے ”ڈان“کے مطابق اس کنونشن میں تین سو کے لگ بھگ مندوبین شریک ہوئے تھے،جبکہ پارٹی کے انتہائی خوش گمان حلقوں کے مطابق یہ تعداد پانچ ساڑھے پانچ سو کے قریب تھی۔(27)کنونشن میں مشرقی پاکستان سے کوئی مندوب شریک نہیں ہواتھا جسے بعد میں قومی پریس ٹرسٹ نے خوب اچھالا اور بھٹو کے ایک قومی سطح کے لیڈر ہونے کے دعوے کو ردکردیا۔اس کمی اور کمزوری نے بعدازاں آگے چل کر اپنے اثرات بھی مرتب کیے۔

پاکستان ٹائمز نے اسے بے چہرہ رومانویت پسندوں،کھلنڈرے طالب علموں اور نظریاتی نکموں کا اجتماع قراردیا۔ اس کے علاوہ غیر معروف وکلا اور پرانے کمیونسٹوں کا ذکر بھی کیاجو کنونشن میں شریک ہوئے۔(28)ڈان کے الفاظ میں یہ کسی سیاسی اجتماع سے زیادہ ،میلے میں آئے ہوئے نوجوانوں کاایک کٹھ تھا۔اس نے اس بات پریقین کا اظہار کیا کہ وطن عزیز میں پہلے ہی سیاسی پارٹیوں کی بھرمار ہے،چنانچہ یہ نئی پارٹی عوام پر اپنا رنگ کسی طرح نہیں جما سکے گی۔(29) ضلعی انتظامیہ مکمل طورپرہوشیار باش اور آنکھ رکھے ہوئے تھی،اگرچہ اعلان نہیں کیاگیا مگر دفعہ 144نافذکردی گئی۔پارٹی کو پروگرام منعقدکرنے کی اجازت دینے سے انکارکردیاگیاجو 3دسمبرکو موچی دروازے پر ہوناتھا۔اس جگہ کے بارے میں روایت ہے کہ یہ لاہورکی سیاست کا رخ اورلاہور پنجاب کی سیاست کا رخ طے کرتا ہے۔ دہائیوں سے سیاستدان یہاں اپنی عوامی مقبولیت کا مظاہرہ کرتے چلے آرہے تھے۔ان میں میاں محمد شفیع،فضل حسین،مولانا ظفر علی خان ،مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری،محمد علی جناح،لیاقت علی خان،نواب آف ممدوٹ ، ممتازدولتانہ یہاں تک کہ خودایوب خان تک اس موچی دروازے پر اپنے اپنے جلسے کر چکے تھے۔عرصہ دراز تک یہ دروازہ قدیم شہر میں داخل ہونے کیلئے استعمال ہوتا رہا۔ایک گول سڑک کی حامل یہ ایک ایسی کھلی جگہ ہے جس کے ہر طرف گنجان آبادی کے حامل محلے ہیں۔جس کے شمال اور مغرب میں تنگ وتاریک گلیوں سے اٹاپرانا شہرہے تو اس کے مشرق اورجنوب میں گوالمنڈی،رام گلی اور قلعہ گوجر سنگھ کے علاقے ہیں۔یہاں پرہونے والے اجتماع اپنی کم سیاسی وقعت و اہمیت کے باوجود کافی پرہجوم ہو جایاکرتے ہیں۔

اپنی توقع سے بہت کم تعدادمیں‌ہونے کے باوجود پیپلزپارٹی کے اس کنونشن نے بہت کچھ بدل کے رکھ دیا۔بھٹو جسے پہلے دن پارٹی کا چیئرمین منتخب کرلیاگیاتھا،نے محسوس کیا کہ ابتدا اتنی مضبوط اورتوانا نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے تھی۔دودنوں میں

چار اجلاس منعقدہوئے۔پہلے اجلاس میں بھٹو نے ایک طویل تقریر کی۔جبکہ دوسرا سیشن ایسے مقررین پر مشتمل تھا جو اپنے تئیں خودکو کسانوں ، وکلا، تاجروں، انجینئروں اور طلبہ کے قائدین شمار کرتے تھے ۔اسی سے پتہ چلتاہے کہ پارٹی نے کن کن اور کیسے کیسے باشعور سیاسی لوگوں کو کنونشن میں شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ تیسرے سیشن کے دوران مندوبین نے پارٹی کی بنیادی دستاویزات پر بحث کی اور پھر راتوں رات ”کنونشن قراردادکمیٹی“کی جانب سے قراردادیں ترتیب دی گئیں ۔چوتھے اجلاس میں نئی پارٹی تشکیل دے دی گئی۔تاسیسی دستاویز اور قراردادوں کی منظوری دی گئی۔پارٹی نے فیصلہ کیا کہ اس کا نام پاکستان پیپلزپارٹی ہوگا۔مندوبین نے پارٹی کیلئے تین رنگوں کے پرچم کی بھی منظوری دی ۔کنونشن میں سب سے زیادہ بحث مباحثہ اسی پرچم پر ہواتھا۔

یقینی طور پر بھٹواور اس کے ساتھیوں کوآنے والے سالوں میں بہت سخت' بہت تیز' بہت طوفانی واقعات وحالات سے گزرنا تھا۔اپنی ابتدا سے ہی تحریک پھوٹی نہیں تھی بلکہ”پھٹ“پڑی تھی۔راولپنڈی میں 7 سے 9نومبر 1968ء کے دوران ہونے والے طلبہ واقعات پربھٹواور خورشید حسن میر نے طلبہ کے رہنمائوں سے مذاکرات کیے۔پارٹی کے چیئرمین نے طلبہ کے ایک جلوس کی بھی قیادت کی اور اس کے ساتھ پنڈی گھیب تک کا سفر کیا جو ان واقعات میں شہید ہونے والے عبدالحمید کے جنازے کیلئے روانہ ہورہاتھا،جبکہ پارٹی کے دیگر قائدین نے انٹرکانٹیننٹل ہوٹل کے اردگردجمع ہونے والے اجتماع سے خطاب کیا ۔ 10نومبر کو بھٹو ریل پر لاہور کیلئے روانہ ہواجہا ں اس کی آمد کا سن کر لوگوں نے راستے میں بہت بڑی تعداد میں جمع ہوکر اس کا خیرمقدم کیا۔لاہورپہنچنے پر ایک فقیدالمثال مجمع بھٹو کے استقبال کیلئے موجودتھاجہاں ایک گاڑی اس کے کمپارٹمنٹ سے نکلنے سے پہلے اسے پلیٹ فارم سے لینے کیلئے آئی ہوئی تھی۔اگلے دن بھٹونے ایک پرجوش ماحول میں ڈسٹرکٹ بارلاہور سے خطاب کیا۔اس نے تہذیب وترتیب سے بیٹھے وکیلوں کو بتایا کہ اس نے حکومت کی اس تجویز کو دھتکار دیاہے کہ وہ مشتعل ہوچکے طلبہ کو سمجھائے ۔میں نے حکومت سے کہہ دیاہے کہ میں انہیں ہرگزنہیں روکوں گا بلکہ ان کی لڑائی میں ان کے ساتھ ہوں۔

بھٹو کی گرفتاری اور بائیں /دائیں بازوکی جدوجہد

13نومبرکو بھٹو نے ریل کے ذریعے ملتان کی طرف سفرپر روانہ ہوناتھامگر اسے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ڈاکٹر مبشرحسن کے ہمراہ گرفتارکرلیاگیا۔اس کے استقبال کیلئے جمع ہونے والا بڑامجمع اس کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی بھڑك اٹھا اور اس نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ بھٹو کی گرفتاری نے پارٹی کے عہدیداروں کو کسی حد

تک بوکھلادیا،کچھ بحث وتکرارکے بعد جے اے رحیم کو قائم مقام چیئرمین بنادیاگیا۔یوں اس واقعے اور پھر نومبر میں ہونے والے واقعات نے ثانوی اور بڑی حد تک نظریے سے وابستہ قیادت کو پارٹی میں ابھرنے کا موقع فراہم کردیا۔چھ ماہ تک تعطل کی حالت میں رہنے والا پارٹی کا ترجمان جریدہ ہفت روزہ ”نصرت“ پھر سے شائع ہونا شروع ہوگیاجورابطے کا اہم ذریعہ بن گیا۔اس کی وساطت سے سارے مغربی پاکستان کے اندر پارٹی پالیسی ،رابطوں اور پروپیگنڈے کومنظم کیا جانے لگا۔25نومبر وہ پہلا دن تھا جب بائیں اور دائیں بازو نے تحریک کی قیادت کو اپنے اپنے کنٹرول میں لینے کی تگ ودو شروع کردی تاکہ اس کے نتیجے میں اقتدار کا حصول ممکن کیا جاسکے۔بائیں اور دائیں بازو کی اس کشمکش میں پیپلزپارٹی اور جماعت اسلامی نے سردھڑکی بازی لگا نی شروع کردی ۔جنوری تک ”نصرت“کی اشاعت باقاعدہ ہو چکی تھی اور اس میں مودودی(جماعت اسلامی کے بانی) اور مودودیت پر لگاتار مضامین شائع ہونے لگے جس میں اس جماعت کے فلسفے اور اس کے بانی کے سابقہ سیاسی کردارکو موضوع بحث بنایا جانے لگا۔جنوری کے شروع میں یورپ سے اپنا ”علاج“ کرواکے واپس آنے کے بعدسید ابوالاعلیٰ مودودی نے سوشلزم کے خلاف بیانات جاری کرنے شروع کردیئے اور اعلان کیا کہ” پاکستان میں سوشلزم مومنوں کی لاشوں پر سے ہی گزرکر آسکے گا“۔(30)

مارچ میں جماعت کے بانی امیر نے گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد اپنی جماعت کے عہدیداروں اور کارکنوں کو حکم دیا کہ وہ ملک بھر میں پھیل جائیں اور ”محلے کی سطح پر کمیٹیاں قائم کرکے سوشلزم کے خلاف ہر ممکن پروپیگنڈہ کریں اور جوزبان سوشلزم کا لفظ پکارے اسے کھینچ لیں۔(31) 10 فروری 1969ء کو ہائیکورٹ نے بھٹو کی گرفتاری کی شکل تبدیل کرتے ہوئے اس کو لاڑکانہ میں اس کے گھر میں نظربندکرنے کا حکم سنادیا۔ 11فروری کو بھٹو نے اپنے لیے آنے والے طیارے میں سفر کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ اس میں اسے مارنے کیلئے بم نصب ہے۔جس پر بھٹو کو ریل کے ذریعے لاڑکانہ روانہ کیاگیا۔جہاں راستے میں ملتان ،رحیم یار خان ،روہڑی اور سکھر کے سٹیشنوں پر عوام کی بھاری تعداد اس کے استقبال کیلئے پہنچ گئی۔14فروری سے بھٹو نے اپنے چارساتھیوں اور مغربی پاکستان سے دیگر گرفتار شدگان کے ساتھ مل کر ایوب حکومت کی طرف سے مسلط کردہ” ایمرجنسی رول لاز“کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تادم مرگ بھوک ہڑتال شروع کردی۔اسی دن جب بھٹو اور اس کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال شروع ہوئی ،حکومت نے اعلان کردیا کہ وہ 17فروری کو یہ قانون واپس کرلے گی۔اس کے ساتھ ہی بھٹو کو ذاتی طورپریہ خبر فراہم کر دی گئی کہ وہ اب قید میں نہیں رہاہے اوروہ خودکو آزاد سمجھے مگر بھٹو آسانی سے جان چھوڑنے والانہیں تھا اس نے قانون کی واپسی کی تاریخ تک اپنی بھوک ہڑتال جاری رکھنے کا اعلان کردیا ۔جس پر

وزیرقانون نے اعلان کیا کہ یہ واپس لے لیا گیا ہے۔بھٹو نے کہا اگر یہ دھوکہ نہیں تو وہ اپنی بھوک ہڑتال ختم کرتا ہے۔(32) 17فروری کو بھٹو ایک فاتح کی حیثیت سے کراچی پہنچا۔وہ دو دن پہلے ہی لاڑکانہ میں صحافیوں کو بتا چکا تھا کہ وہ کراچی سے جدوجہد کے دوسرے مرحلے کا آغاز کرے گا۔یہ پاکستان کا وہ پرولتاریہ شہر تھا جو ایوب خان کے خلاف ووٹ دینے کے جرم کی سزا بھگت رہا تھا۔(33) بھٹو نے اپنی پارٹی قیادت اور دوستوں سے طویل صلاح مشورے کے بعد کراچی پریس کلب میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوگا۔اس نے کہا کہ لوگ تبدیلی چاہ رہے ہیں ،مراعات نہیں۔(34)

یہ واضح تھا کہ پارٹی کے بائیں بازو کے رہنما اپنے چیئرمین کو اس پر قائل کرنے میں کامیاب رہے تھے کہ تحریک بہت آگے جا چکی ہے اور ایسے موقع پر حکومت سے کسی قسم کی مصالحت کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ صرف ایک وجہ ایسی تھی جس کی بدولت بھٹو اس کانفرنس میں جانا لازمی سمجھتا تھا اور یہ وجہ اس نے اپنے انتہائی قریبی لوگوں کو بتائی بھی تھی۔ بھٹو کی خواہش تھی کہ کانفرنس میں اگر شیخ مجیب کے ساتھ مل بیٹھ کر باہمی تعاون کا کوئی امکان پیدا ہو جس سے وہ دونوں پیپلزپارٹی اور عوامی لیگ کا اتحاد بنا لیں ۔اپنی رہائی کے بعد سے اپنے پہلے انٹرویو میں ہی پارٹی چیئرمین اعلان کرتا آرہا تھا کہ اس کی اور شیخ مجیب کی شرکت کے بغیر کوئی سمجھوتہ یا مصالحت ناممکن ہو گی۔

بھٹو مجیب کی مشرقی پاکستان میں پیدا ہوجانے والی بے پناہ مقبولیت سے بخوبی آگاہ تھا مگر پھر بھی اسے یہ امید تھی کہ شاید وہ چھ نکات پر مصالحت کرنے کو تیار ہوجائے۔بھٹو 23فروری کو ڈھاکہ پہنچا جہاں اس نے مجیب کی حمایت میں بیانات دینے شروع کر دیے تاکہ اس کا ساتھ حاصل کر سکے۔اس نے کہا کہ وہ چھ نکات سے مکمل اتفاق نہیں کرتا۔ وہ مشرقی پاکستان سے کوئی متفقہ امیدوار سامنے آنے کی صورت میں صدارت کے لیے اپنے امیدوار ہونے سے دستبردار ہونے کو تیار ہے،اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ مجیب کے خلاف قائم اگرتلہ سازش کیس فوری طور پر ختم کیا جائے۔(35)

بھٹو نے ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے رہنما مجیب سے ملاقات بھی کی اور وہ اس کے ساتھ 24فروری کو ایک ہی طیارے میں واپس بھی آیا،مگر وہ لاہور کیلئے روانہ ہوگیا جبکہ مجیب گول میز کانفرنس کیلئے آیا تھا۔جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ مجیب نے اپنی مقبولیت میں اضافہ ہوجانے کے بعد چھ نکات پر اپنا موقف بدلنے کی بجائے اور بھی سخت موقف اپنالیا ہے،چنانچہ صاف نظر آرہا تھا کہ گول میز کانفرنس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔نہ ہی عوامی لیگ اورپیپلزپارٹی میں اتحاد کا کوئی امکان تھا۔لاہور میں نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ صرف اسی صورت میں گول

میز کانفرنس میں شریک ہوگا اگر براہ راست منتخب شدہ ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام پر اتفاق رائے ہوتا ہے ورنہ نہیں،یہ غیر متوقع اعلان تھا،کیونکہ جماعت اسلامی 1956ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کرچکی تھی،بھٹو نے جماعت کے اس موقف کو سراسر ردکردیاتھا۔ 2مارچ کو بھٹو نے اپنا موقف مزید واضح کرتے ہوئے کہا کہ وہ کانفرنس میں شریک ہوگا' بشرطیکہ ایوب خان استعفیٰ دے کر اقتدار چھوڑ دے' ایسی صورت میں سپیکر قومی اسمبلی عبوری حکومت سنبھال لے اورپھر ایک آئین ساز اسمبلی کیلئے براہ راست الیکشن کرائے جائیں۔(36) اپوزیشن لیڈروں نے بھٹو پر کانفرنس میں شریک نہ ہونے اور پیشگی شرائط عائد کرنے پر سخت نکتہ چینی کی جس کا جواب دیتے ہوئے بھٹو نے کہا کہ اس نے شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کرکے اپوزیشن پر دبائو بڑھادیا ہے کہ وہ دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کانفرنس میں شریک ہوں گے اور عوام کو جوابدہی کیلئے تیار رہیں گے۔ بھٹونے اس دوران تحریک کی قیادت ، مزدوررہنمائوں،سماجی گروپوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کردیا اور یہاں تک کہ مستقبل کی پیپلزپارٹی کی حکومت کے حوالے سے بیان بھی دینے شروع کردیئے تاکہ اپنے لیے حمایت حاصل کر سکے۔بھٹو کو ایوب کی کانفرنس میں کیے گئے اعلان میں کچھ نیا نہیں لگا۔ایوب نے اس کانفرنس میں اپوزیشن کے دو مطالبات تسلیم کر لیے تھے۔بھٹو نے الزام عائدکیا کہ دائیں بازوکے ساتھ مل کر حکومت ایک سویلین بغاوت کا رستہ ہموارکرنے کی سازش کررہی ہے۔اس خدشے نے بھٹو اور بھاشانی کو ایک اتحاد کرنے پر مجبورکردیا۔

بھٹوجوپہلے ہی کیے گئے وعدے نہ نبھانے اور مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکنے پرمایوس ہوچکاتھا،اور جس کاسوشلزم کا تصور بھاشانی کے سوشلزم کے تصور سے قطعی مختلف تھا،الیکشن کے ذریعے اقتدار میں آناچاہ رہاتھا۔جبکہ بھاشانی مزدوروں اورکسانوں کی ایک انقلابی تحریک اور وہ بھی گوریلا جدوجہد کی شکل میں اقتدار حاصل کرناچاہتاتھا۔چنانچہ بھاشانی نے الیکشن کے تصور کومستردکردیااور اس نے کراچی میں کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جو بھی الیکشن کے عمل میں شریک ہونے کی کوشش کرے گا وہ اپنی جان مال کی حفاظت کاخود ہی ذمہ دار ہوگااورہم اس کاگھربارجلا کر اسے تباہ کردیں گے۔(37)

جب گول میز کانفرنس کا اتفاق رائے مجیب کے چھ نکات پر ضدکرجانے کی وجہ سے بکھرگیاتو سارے ملک میں ایک افراتفری پھیلتی چلی گئی۔ایسے میں ایوب کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچ گیا تھا کہ وہ مارشل لا بحال کردیتا،پیلومودی مطابق بھٹو کوکراچی سے لاڑکانہ لے جانے والا طیارہ اچانک فنی خرابی کے باعث راولپنڈی کی طرف موڑ دیاگیا۔طیارے کے پنڈی پہنچتے ہی بھٹو کو سیدھا کمانڈر انچیف کے پاس لے جایاگیا۔جنرل یحییٰ نے بھٹوکو بتایا کہ فوج کے پاس اورکوئی رستہ نہیں بچا ، سوائے اس

کرے کہ وہ معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لے،اس نے بھٹو سے کہا کہ وہ اس کی حمایت کیلئے اپنی شرائط بتائے۔بھٹو نے تین شرائط بتائیں؛ایک آزادخارجہ پالیسی؛ون یونٹ کا خاتمہ؛ایک سال کے اندراندر بالغ رائے دہی کی بنیادپر الیکشن۔یحییٰ نے فوری طورپرتینوں شرائط مان لیں۔

26مارچ 1969ء کو ایوب رخصت ہوگیا اور بھٹو نے تحریک کے خاتمے کا اعلان کردیا۔

وسیع تر سٹریٹجک اہداف کے حوالے سے پارٹی کے تنظیمی معاملات شروع دن سے ہی اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ہرحال میں الیکشن جیتنے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔پارٹی کی بے پناہ بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ ہی پنجاب اور سندھ میں خاص طورپر نچلی سطح تک بڑی تعدادمیں پارٹی کے یونٹ قائم ہونے کے بعد ،اور ایک عبوری آئین کی ضرورت کی کیفیت میں نیچے تشکیل پائے جانے والے تنظیمی ڈھانچوں پر پارٹی چیئرمین کی گرفت بہت کمزور تھی۔پنجاب کی حد تک تو یہ کمزوری نمایاں تھی۔

”پیپلزپارٹی کے مرکزی سرگرم حلقوں کے قریبی ذرائع کے مطابق پارٹی کی تنظیم سازی سے چیئرمین کو اس قدردلچسپی نہیں تھی اوروہ اسے اتنی ترجیح نہیں دیتا تھا خاص طوپر تاسیسی کنونشن کے بعد اس کام کو تو جیسے نظراندازہی کردیاگیا“۔(38)

کنونشن کے فوری بعد سنٹرل آرگنائزنگ کمیٹی اور پرنسپلز کمیٹی تشکیل دی گئی تھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی باقاعدہ میٹنگیں کرنا گوارا نہیں کیا تاوقتیکہ چیئرمین ہدایت جاری نہیں کرتا تھا۔ 24 جنوری 1971ء تک تو مرکزی کمیٹی بھی قائم نہیں کی جا سکی تھی مگر یہ بھی اپنی تشکیل کے بعد تبھی میٹنگ کرتی تھی جب چیئرمین کی طرف سے خصوصی ہدایت آتی تھی۔ہاں البتہ ایک خود ساختہ مرکزی کمیٹی اس سے قبل کام کرتی محسوس ہوتی تھی جو کہ آرگنائزنگ اور پرنسپل کمیٹی کے ممبروں پرہی مبنی تھی۔ان کے علاوہ جن افرادکوچیئرمین اپنے ساتھ لاکر شریک کردیتا۔اس کی سب سے اہم ترین اور واحد میٹنگ جس کا ریکارڈ مرتب کیاگیا، 23مارچ1969ء کوکراچی میں منعقدہوئی تھی جس میں ون یونٹ سکیم کے خاتمے کی پارٹی پالیسی پر مضبوطی سے عملدرآمدکرنے کے عزم کا اعادہ کیاگیاتھا۔(39) اس کے بعد سے بھٹوکی بنائی گئی پرنسپلز کمیٹی ،جس میں جے اے رحیم،ڈاکٹر مبشرحسن ،حنیف رامے (جسے 1968ء میں ممبرلیا گیا)اور حفیظ پیرزادہ (جسے 1969ء میں شامل کیاگیاتھا) شامل تھے،کو ختم کرکے اسے ایڈہاک مرکزی کمیٹی بنادیاگیا۔تاکہ پارٹی ڈسپلن اور پالیسی معاملات کی دیکھ بھال کی جاسکے ۔ 1970ء کے آغاز میں جے اے رحیم کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنادیاگیا ۔(40) 1970ء کے بعدسے اس قومی پارٹی کیلئے جن دیگرمرکزی عہدیداروں کا اعلان کیاگیا ان میں سے کوئی ایک بھی پارٹی کے بانی ارکان

میں سے نہیں تھا۔ ان میں مخدوم طالب المولیٰ(پیر جھنڈے واروشریف آف ہالہ)کونائب چیئرمین،میاں محمودعلی قصوری کو بھی وائس چیئرمین اور مولانا کوثرنیازی کو پروپیگنڈہ سیکرٹری بنادیا گیا۔4مارچ1969ء کومشرقی پاکستان کی پیپلزپارٹی کو تحلیل کردیا گیا۔اے قسیم چوہدری نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کروہاں پیپلزپارٹی کو جوڑنے کی کوشش کی مگر مشرقی پاکستان میں پارٹی اس قدر کمزور تھی کہ یہ وہاں پنپ ہی نہیں سکی۔ مغربی پاکستان کی دوسری بڑی پارٹیوں کے برعکس مشرقی پاکستان میں پیپلزپارٹی 1970ء کے الیکشن میں ایک بھی امیدوار کھڑا نہیں کر سکی تھی۔23مارچ1969ء کے پارٹی ترجمان ''نصرت''میں اعلان شائع کیا گیا کہ پارٹی کی پہلی قومی سطح کی کانفرنس 4تا6 اپریل1969ء کولاہور میں منعقدہوگی۔(41)

یہ ایک کوشش تھی کہ نومبر کی تحریک سے پارٹی کو ہونے والی حاصلات کو یکجا کیا جائے ۔اس کانفرنس کیلئے طلبہ،وکلا ، خواتین، صحافی، مزدوروں اورکسانوں کے نمائندہ مندوبین کی فہرستیں مرتب کر لی گئی تھیں۔جبکہ پیپلزپارٹی کی نمائندہ کمیٹیوں نے بھی شرکت کرناتھی۔ 25مارچ1969ء کو لگنے والے مارشل لا نے ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی جس کی وجہ سے یہ کانفرنس ملتوی کردی گئی۔اس کے بعد پہلی قومی کانفرنس یکم سے تین جولائی 1970ء تک ہالہ شریف (سندھ) میں منعقدکرائی گئی۔جبکہ دوسری اور شایدآخری کانفرنس 30نومبراوریکم دسمبر 1972ء کو راولپنڈی میں منعقد ہوئی تب پارٹی اقتدار میں تھی۔

نچلی سطح پر تنظیم بنانے کی کوششیں

پنجاب میں پیپلزپارٹی اوپر کی نسبت نیچے زیادہ پھیلتی گئی۔ہمیں کئی ادوار ملتے ہیں جب یہاں پارٹی میں تیز ترین تنظیم سازی ہوئی۔سب سے پہلا دور تو پارٹی کے تاسیسی کنونشن کے فوری بعد کا ہے۔جب کنونشن سے واپس جانے والوں نے نچلی سطح پر یونٹس تشکیل دیے اور پھرتنظیم سازی کا ایک خودروسلسلہ ہی چل پڑا۔یہ تنظیمیں مقامی سطح پر لوگوں نے خودہی اپنی مرضی ومنشاسے تشکیل دی تھیں اور اس میں بالائی قیادت کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔کئی ایک جگہوں پر تو بالائی یونٹ نہیں بھی ہوتے تھے مگر پھر بھی نچلی سطح کے یونٹ موجود ہوتے تھے۔ بیشتر حقیقی یونٹوں کوضلعی تنظیموں کی منظوری کی ضرورت ہوتی تھی یا پھر انہیں ازسرنو تشکیل دیا جاتا کیونکہ ان میں سے کچھ باہمی مخالفت پر بھی مبنی ہوتے تھے۔دسمبر 1967ء سے لے کر دسمبر 1970ء تک کل تشکیل پانے والے یونٹوں کے تقریباًآٹھ سے دس فیصد ابتدائی یونٹس تاسیسی کنونشن کے بعدکے پہلے تین ماہ میں قائم ہوئے تھے۔ ابتدائی یونٹوں کی

تیزی سے تشکیل کا دوسرا اہم مرحلہ 1969ء کے آخر اور 1970ء کے شروع میں شہری علاقوں میں انجام پایا۔اس کا مقصد انتخابی مہم کی تیاری کے ساتھ ساتھ مزدوروں، طالب علموں اور صحافیوں میں روزافزوں بڑھتی ہوئی بے چینی کے ساتھ ہم آہنگ ہوناتھا۔ اس عرصے کے دوران ہی خصوصی نوعیت کے یونٹس بھی تشکیل دیئے گئے جن میں خواتین کی بھی تنظیمیں قائم کی گئیں۔اس کے سبب پارٹی کے اندر بائیں بازو رحجانات بھی تیزی کے ساتھ امڈ کر آئے۔تیسرا اہم مگر نسبتاً کم تر عرصہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں 22/23مارچ1970ء کو ہونے والی طلبہ' کسانوں اور مزدوروں کی کانفرنس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ان دنوں چونکہ الیکشن کا بھی زور تھا اس لیے پارٹی کے امیدواروں کی کوششوں اور پارٹی کی اپنے عوامی انداز' زوردار انقلابی مہم کے باعث پرانی طرز کے کئی سیاستدان پارٹی کی طرف کھنچتے چلے آئے۔

اپنی ابتدا سے ہی پیپلزپارٹی کی بالاپرت چیئرمین بھٹو کے وفاداروں پر ہی مبنی چلی آتی رہی۔فلپ ای جونز لکھتا ہے:

"مجموعی طور پر بھٹو کی شخصیت ہی اس کی سب سے بڑی معاون ومددگار تھی۔وہ اپنی ذات میں ہی انجمن تھا۔اس کا ظاہری رعب دبدبہ اور اس کی ذہین و فطین طبع اہل فکر ودانش ،ماہر صحافیوں،محققین اورغیرملکی سفارتکاروں کو بھی متاثر کردیا کرتی تھی۔عام لوگوں ،پارٹی کے ساتھ مخلص کارکنوں کیلئے اس کا شخصی مزاج ،ولولہ اورحسن مزاح اس کیلئے مضبوط وموثر رغبت اور تعلق کے حصول کا وسیلہ بنی ہوئی تھی۔اس کی لوگوں کے نام ،ان کے چہرے ،بچوں اور کارکنوں کے نام یادرکھنے کی صلاحیت بھی کمال تھی اور جب کوئی چیئرمین بھٹو سے ملتا تووہ اس کی گرمجوشی سے حیران رہ جاتا۔اس سب کچھ کے باوصف بھٹواپنے برتائو میں ایک پیچیدہ اور بڑی حد تک خطرناك انسان بھی تھا۔وہ اپنے ساتھ سماجی برابری رکھنے والوں سے غیر مبہم اطاعت اور اپنے سے کم حیثیت والوں سے نیازمندی کا طلبگار تھا۔اسے جب بھی غصہ آتا تو وہ کوئی لحاظ نہیں رکھتا تھا اور جو من میں آتا کہتا اور کرجاتا"۔(42)

"یہ امر قطعی حیران کن نہیں کہ بھٹونے اپنی پارٹی کی اعلیٰ انسا نی صلاحیتوں سے قیادت کی ۔چیئرمین تک رسائی کیلئے ایک مشکل مرحلے سے گزرناپڑتاتھا۔بھٹو کے ارد گرد موجود حلقہ جو پارٹی کی تشکیل سے بھی پہلے اس کے ساتھ منسلک چلا آرہاتھا اور جسے پارٹی کے وفادار "مرکزی حلقہ" قراردیا کرتے تھے،ایسے معدودے مخصوص افرادپر مشتمل تھا جن کو بھٹوتک براہ راست رسائی میسر تھی"۔(43)

صرف ایک جے اے رحیم ہی ایسا فرد تھا جو براہ راست بھٹو کے ساتھ اس کے مد مقابل کسی بھی متنازعہ یا لازمی ایشوپربات چیت کرتاتھا۔اس کی شخصیت ،اس کی سینیارٹی، اس کا پارٹی تشکیل میں بنیادی مرکزی کرداراور کارکردگی،اس کی

خوداعتمادی 'ان سب نے مل کر اسے ایک اثرورسوخ عطا کیا تھا جس کے آگے بھٹو اپنے آپ کو بھی بے بس پاتاتھا۔رحیم کو 1970ء کے الیکشن میں مشکوک عناصر ،بڑے جاگیرداروں،ملائوں کی شمولیت پر سخت تحفظات تھے اور وہ سمجھتاتھا کہ یہ لوگ پارٹی کے سوشلسٹ عزائم کیلئے مخلص نہیں ہیں اور مضررساں ثابت ہوں گے ۔بلکہ یہ لوگ پارٹی میں چیئرمین کے مدمقابل اورمخالف ماحول قائم کرلیں گے۔ایک ناخوشگوار قسم کے اثرورسوخ کے تانے بانے نے جو عمومی طورپر تنظیمی ڈھانچوں پر بھی حاوی رہتاتھا، ایک ایسی کیفیت پیداکردی جس سے پارٹی کے اندر ایک سلطنت سی قائم ہوگئی تھی اوریہ سلطنت چیئرمین کے گرد حلقہ زن افراد پر مشتمل تھی۔

پیپلزپارٹی کے اند موجود بایاں بازو بھی کئی گروپوں کا مجموعہ ہی تھاجو اپنے حجم،اپنی تنظیمی وحدت، نظریاتی افق اور پارٹی سیل کی قربت کے حوالے سے مختلف الخیال تھے۔ ان میں شیخ رشید کے ساتھ منسلک بڑے حصے سے ہٹ کرجو پاکستان کسان کمیٹی پر مشتمل تھا،باقیوں کی اکثریت نومبر کی تحریک میں متحرک انقلابی یونین کی سیاست سے تعلق رکھنے والوں پر مبنی تھی۔ان میں مزدورمجلس عمل ملتان،ترقی پسند مزدور محاذ لائل پور،پیپلز لیبر فرنٹ(رفعت حسین)راولپنڈی،اور متحدہ مزدورمحاذ لاہور شامل تھے۔تھل محنت کش محاذ،دانشوروں پر مشتمل چنگاری گروپ،ڈاکٹر عزیزالحق اور" لاڈوصاحب" کے گرد کام کرنے والے کیڈروں کا تشخص مختلف نوعیت کا تھا۔ان میں سے اول الذکرکا تعلق مزدوروں کسانوں کے ایک مشترکہ گروپ سے تھا جس کی بنیاد نیپ(NAP) بھاشانی کے کیڈروں نے میانوالی اور مظفرگڑھ ضلعوں میں رکھی تھی۔اس نے مارچ 1969ء میں پیپلز پارٹی کے ساتھ خودکو منسلک کیاتھااور لیہ اوربھکر کی تحصیلوں میں پارٹی کے ڈھانچے تعمیر کیے تھے۔لیکن بعدازاں یہ لوگ مصطفی کھر کے دبائو کی وجہ سے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں یعنی طبقاتی دشمنوں کو الیکشن ٹکٹ ملنے پر الگ ہوگئے تھے۔چنگاری گروپ جو بعد میں ینگ پیپلزفرنٹ کہلوانے لگاتھا ، بنیادی طور پر نکسلائٹ جریدے چنگاری سے متاثر تھاجو کینیڈا سے شائع ہوتاتھااور جن کے کسی حد تک مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ لیننسٹ) سے روابط بھی تھے۔ان بائیں بازو کے گروپوں نے بڑی حد تک اپنی تنظیمی حدود برقراررکھی ہوئی تھیں اور یہ پیپلزپارٹی کے ساتھ اپناتعلق ایک ایسوسی ایشن کے انداز میں رکھنا چاہتے تھے۔شیخ رشید کے ساتھ جڑاہوا سوشلسٹ گروپ پیپلزپارٹی سے جڑاہواتھا مگر اس کا پس منظر مائواسٹ تھا۔1969ء اور1970ء کی پیپلزپارٹی کے اندرمزدوروں اور طلبہ کی سیاست پر سب سے بڑی اور سرگرم بحث ہواکرتی تھی مگر 1971/72ء تک یہ فیصلہ کن ایشو نہیں بن سکے تھے جب ان کی بنیادپر پارٹی میں سے سوشلسٹ کیڈروں کو نکالنا شروع کردیاگیاتھا۔ یکم اگست 1969ء کو شیخ محمد

رشید ،جوبہت بعد میں بابائے سوشلزم کے نام سے مشہور ہوئے، نے پیپلزپارٹی کی پنجاب اور بہاول پورکونسل کی میٹنگ کی صدارت کی تھی(پہلی میٹنگ جس کا ریکارڈ مرتب کیاگیا)اور یہ وہ میٹنگ تھی جس میں ان ایشوزپر اکثریت رائے سے قراردادیں منظورکی گئی تھیں۔

پیپلزپارٹی کے اپنے عہدیدار اورکارکن کنونشن مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کے پیپلزپارٹی میں جوق در جوق شامل ہونے پر سخت برہم اور نالاں تھے۔ان کی شمولیت پر تحفظات ظاہر کیے گئے کہ اس قسم کی نئی بھرتی کو روکا جائے ورنہ یہ ناپسندیدہ عناصر آگے چل کرپارٹی کا بیڑہ غرق کر دیں گے۔کونسل نے اس دبائو کے پیش نظر فوری طور پرپارٹی کنونشن بلانے کا مطالبہ کردیاتاکہ پارٹی کا تنظیمی ڈھانچہ مرتب کیا جاسکے اور اسے جمہوری بنایاجاسکے۔یہ قرارداد واضح کرتی تھی کہ پارٹی ممبران اپنی آوازکو زیادہ شدت سے اوپر اور آگے پہنچانا چاہ رہے تھے۔اس سے یہ بھی عیاں ہوتاتھا کہ وہ بھٹو کی طرف سے اشرافیہ کے ساتھ گٹھ جوڑکی کوششوں سے ناخوش اور ان کے خلاف تھے اور یہ بھی کہ وہ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچوں کو منظم ومستحکم کرکے بالائی قیادت کے تسلط میں توازن پیداکرناچاہتے تھے۔پارٹی ممبران بھٹو کی طرف سے بڑے زمینداروں کے ساتھ ملنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی اس کیفیت میں بھی اصل ایشوز سے جڑے ہوئے تھے۔

انتخابات سے پہلے زرعی مسئلے کی طرف رویہ زیادہ پر جوش نہیں تھا اس میں بھی وہی عدم دلچسپی نظر آتی تھی جو دوسرے اہم مسائل پر بھٹو کا خاصہ تھی کیونکہ وہ کسی خاص موقف سے جڑا رہنا نہیں چاہتا تھا۔

موچی دروازے اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہونے والے دونوں اجتماعات سے پنجاب کے سوشلسٹوں کو اس بات کا یقین ہوچکاتھا کہ پیپلزپارٹی کی نیچے عوام کی مقبولیت خالص اور حقیقی ہے اور یہ لازمی الیکشن میں بڑی تعداد میں سیٹیں جیتنے میں کامیاب ہو جائے گی۔جس خطرے اور خدشے کو وہ ہوتادیکھ رہے تھے وہ یہ تھا کہ پیشہ ورسیاستدان،سرمایہ داراور زمیندار اشرافیہ پارٹی میں شامل ہوکرٹکٹ حاصل کرلیں گے،جس کے بعد پارٹی کا سوشلسٹ کردار اگر تباہ نہ ہوا تو شدید متاثر ضرور ہوجائے گا۔**29**مارچ**1970**ء کو **A-4**مزنگ لاہور میںہونے والے پنجاب -بہاول پور کونسل کے اجلاس میں(جس میں صوبائی ،ضلعی اور شہری عہدیداروں نے شرکت کی تھی)کچھ قراردادیں پیش کی گئیں جنہیں منظور ہونے کی صورت میں مرکزی قیادت کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیاتھا۔یہ قراردادیں حسب ذیل تھیں۔

* ایسے سبھی افراد جن کے طبقاتی مفادپارٹی منشور سے متضاد ہیں،کوپارٹی رکنیت نہ دی جائے۔

* مقامی پارٹی کی منظوری اور رضامندی کے بغیر کسی کو بھی کسی بھی حالت میں رکنیت ،عہدہ یا پارٹی
ٹکٹ نہ دیا جائے۔

* مرکزی کمیٹی کے اراکین سمیت سبھی پارٹی عہدے چناؤ کے ذریعے منتخب کیے جائیں۔

* پارٹی لٹریچر پارٹی کے ہی کنٹرول میں رہنا اور پارٹی ہی کے توسط سے تقسیم ہونا چاہیے۔

* پارٹی کا اپنی مالیاتی نظم ونسق چلانے کا ونگ قائم کیا جائے تاکہ پارٹی فنڈز منظم کیے جاسکیں۔

* پارٹی زرعی زمین پر پچاس ایکڑ تک حدملکیت مقرر کرنے کی پالیسی اپنائے اور اسے نافذ
کرے۔

* سبھی بڑے ذرائع پیداوار،سبھی بڑی صنعتوں پٹ سن اورٹیکسٹائل سمیت کسی معاوضے کے بغیر
قومی تحویل میں لے لیے جائیں۔

* کچھ بھی ہوجائے ،پارٹی کی ترقی پسندانہ خارجہ پالیسی کو امریکی مفادات یا دباؤ کے تحت کسی بھی
حالت میں تبدیل نہ کیا جائے۔(44)

فلپ جونزتفصیل کے ساتھ نیچے پارٹی کی طرف سے بڑھتے ہوئے طبقاتی تضاد کے دباؤ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ سلسلہ 70ء کے الیکشن سے پہلے ہی شروع ہوچکا تھا۔

”اس قسم کی قراردادوں نے پارٹی میں کھر اور حنیف رامے (سنٹرل سیل)کے گروپوں کو ناراض کردیا ،انہوں نے چیئرمین بھٹو کو بھڑکانا اور اس کے کان بھرنے شروع کردیئے۔ ان قراردادوں کو پارٹی کی الیکشن حکمت عملی کے خلاف قراردینے لگے۔ حساس طبیعت کے مالک بھٹونے اس تنازعے کو ڈاکٹر مبشرحسن کے گھر زیربحث لانے کی بجائے لاہور انٹرکانٹی ننٹل ہوٹل میں میٹنگ رکھ لی۔یہ میٹنگ ایک انتہائی تلخ' ترش' سنگین اور طویل مباحثے کی شکل میں تبدیل ہوگئی جس میں چیئرمین نے سوشلسٹوں کو سخت توہین آمیز لہجے میں جھاڑپلادی“۔(45)

اس واقعے نے گہرے اثرات مرتب کیے ۔امان اللہ خان کی پارٹی رکنیت معطل کر دی گئی۔اس کے بعد پنجاب کے سوشلسٹوں کو کبھی توفیق اور جرات نہیں ہو سکی کہ وہ پارٹی میں کبھی اپنا موقف دوبارہ بیان کر سکیں نہ ہی اس کے بعد کبھی پھر پنجاب

کونسل کی کوئی میٹنگ ہو سکی۔بلاشبہ چیئرمین ” نظم وضبط کے تقاضوں “کے تحت اپنے تسلط کو قائم رکھنا چاہتاتھا مگروہ پارٹی کے سوشلسٹوں کی طاقت اور اہمیت دونوں کو تسلیم بھی کرتاتھا۔”امان اللہ خان کی معطلی پر ہر طرف سے احتجاج شروع ہوگیا،طلبہ پارٹی سے استعفیٰ دینے لگے،اورپنجاب پارٹی کے کئی یونٹوں کی طرف سے اس کے خلاف قراردادیں آنی شروع ہوگئیں جس میں مرکزی قیادت کے غیرجمہوری رویے کی مذمت کی گئی تھی۔اس کے نتیجے میں 25اگست کو امان اللہ خان کی رکنیت بحال کر دی گئی “۔(46)

بائیں بازو کی کمزوری

ماضی کے جھروکوں میں جھانکا جائے تو 29مارچ کی میٹنگ پیپلزپارٹی کے پنجاب کے بائیں بازو کی سب سے بڑی کاوش تھی۔ اگرچہ اس کے بعد اس کا انحطاط کسی طورغیر متوقع نہیں تھا اور یہ ہونا نظرآرہاتھا۔ہالہ کانفرنس کے بعد جونہی پارٹی کی الیکشن مہم نے زورپکڑا بائیں بازو کی اکثریت نے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی کہ جو ہوگادیکھاجائے گا۔بھٹونے پارٹی تنظیموں کی طرف سے آنے والی قراردادوں پر کسی قسم کے غور یا بات چیت سے انکارکردیا۔اس نے دھمکی دی کہ اگر بائیں بازو نے پارٹی اور پارلیمانی عہدے الگ الگ کرنے کا مطالبہ اور دباؤ برقرار رکھا تو وہ پارٹی سربراہی چھوڑ دے گا۔دوسری طرف بائیں بازو کے اپنے داخلی مسائل اور کمزوریاں تھیں۔”پرانا بایاں بازو “جوزیادہ تر لیبر آرگنائزیشنوں اور ڈرائنگ روم سوشلسٹوں پر مبنی ومشتمل تھا،ذاتی و شخصی اختلافات اور فلسفیانہ موشگافیوں کا شکارتھا۔وہ اس سارے کھیل میں پیپلزپارٹی سے باہر اور دور رہااورخاموش تماشائی بنارہا۔مگراس نے زیادہ تر خودکو شہروں میں مرتکز کیے رکھا۔اس کی حقیقی حمایت کا مرکز دیہات تھا جہاں اس کی تنظیمی بنیادیں کم یا کمزور تھیں۔ جہاں جہاں اس نے اپنی کسان کمیٹیاں یا کسان تنظیمیں بنارکھی تھیں وہاں اس کی تعمیرکردہ قوتیں ردانقلابی قوتوں کو توڑنے کے قابل نہیں تھیں جو الیکشن کے بعد سے دیہی اشرافیہ،ضلعی انتظامیہ اور مقامی تھانیداروں (ایس ایچ اوز) کی طرف سے مسلط کی جانے لگی تھیں۔

اقتدار کی منتقلی کے بعد تو بایاں بازو بھٹو پر اس مطالبے کے لیے دباؤڈالنے کے قابل ہی نہیں رہاتھا کہ پیپلزپارٹی کی طرف سے زرعی اصلاحات کے اعلان پر عملدرآمد شروع کیاجائے ۔ شہروں میں بائیں بازو کی بنیادیں طلبہ اورنئی مزدورتنظیموں تک محدودتھیں جن کی قیادت بھٹوحکومت کے ہاتھوں سختی کی زدمیں آئی ہوئی تھی۔وہ پیپلزپارٹی کے پروگرام پر عملدرآمد چاہتے تھے اورانھوں نے سوشلسٹ تبدیلی کی

خاطرووٹ دیاتھاتاکہ کسی طرح سے پیپلزپارٹی اشرافیہ کے سیاسی تسلط اور معاشی جبرواستحصال سے ان کو نجات دلا دے۔جبکہ دوسری طرف پارٹی سے وابستہ عام لوگوں کی اکثریت کے لیے یہ کوئی نظریاتی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس سے الگ صرف بھٹوکی ”عظیم شخصیت “تھی جس نے پارٹی پروگرام پر عملدرآمدشروع کردیاتھا۔ اس لیے بڑے بڑے سوشلسٹ بھی براہ راست بھٹوکی بجائے اس کے اردگرد کے لیڈروں پر ہی تنقیدکرتے تھے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اپنی کوتاہی اور کمزوری کے باوجود بائیں بازو کو بھٹونے اپنی چیئرمین شپ اور واحد شخصی برتری کے زیراثر اپنی پالیسیوں اور کاروائیوں کے ذریعے مزید کمزور اورنڈھال کردیا۔باربار ان کے مطالبات کو بھٹو مستردکرتاچلا گیا کہ پارٹی تنظیموں کو مضبوط بنایاجائے۔اس بات کو پارٹی کے اقتدار میں آنے سے پہلے والے عرصے میں سوچاہی نہیں گیاتھا کہ آگے چل کر یہ معاملہ اتناپیچیدہ اورٹیڑھاہوجائے گا۔یہ دن بھٹوکے ہی دن تھے۔پنجاب میں اس کی کرشماتی شخصیت اوراس کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ اورشاید یہ بات بھٹوکے بھی دل ودماغ میں سرایت کر چکی تھی کہ ایسا ہمیشہ ہی رہے گا۔عوام کی طرف سے ملنے والی اسی سرشاری کی وجہ سے بھٹوطاقت کے منظم، مربوط اور مستحکم ذرائع سے اپنی ہر بات منوانے کی حیثیت میں بھی تھا اور بیک وقت پارٹی کی داخلی تنظیم سے بھی اس کا” داخلی یونائٹڈفرنٹ “قائم ودائم رہا۔

اس قسم کی کیفیت کا برقرار رہنا اوررکھنا کئی وجوہات کی بناپربھٹواپنے لیے ضروری بھی سمجھتاتھا کیونکہ،

1. انتخابات سے پہلے اسے پیپلز پارٹی کی فتح پر یقین نہیں تھا۔

2. اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ کامیابی کے بعد اسے اقتدار فوجی جنتا کی رضامندی اورمرضی
سے ملنا ہے۔

3 ۔ وہ اقتدار کے بعد خانہ جنگی سے سہماہواتھا جسے وہ سیاسی اور عسکری حوالوں سے اپنے لیے درست نہیں سمجھتاتھا ،اسی لیے وہ خود کو حاصل ہونے والی بھرپوراورتاریخی حمایت کے باوجود لوگوں کی امنگوں کی تکمیل کی خاطر زیادہ بائیں طرف کے اقدامات سے گریزکررہاتھا۔

مراعات یافتہ سرمایہ داروں کا کنٹرول

پریشان حال اور مضطرب بائیں بازو کی حالت پہلے ہی کم خراب نہیں تھی کہ اوپرسے اشرافیہ طبقے کے لوگوں کی پارٹی میں شمولیت نے رہی سہی کسر بھی پوری

کردی۔دیہی علاقوں سے یہ شرکت وشمولیت بہت زیادہ ہورہی تھی جہاں سے زمیندار طبقہ جوق در جوق پارٹی میں شامل ہوتا جارہاتھا۔ 1974ء تک پنجاب میں سے طاقت کے اس کھیل میں شامل ہونے والوں میں ڈیرہ غازی خان سے کھوسہ ، لغاری، دریشک، مزاری' سرگودھا سے پراچہ ،ٹوانہ،بندیال ،قریشی،پیرمحل،کورنگہ اور شاہ جیونہ کے سیدبخاری، ملتان سے دولتانہ ،خاکوانی اور گیلانی'لائل پور کے راوی علاقے سے کھرل'مکھڈ'مانکی شریف اورتونسہ شریف کے پیر' لیاقت پور اور رحیم یارخان سے کوریجہ 'کیمبل پور(جواب اٹک کہلاتاہے)سے جودھرا اور ٹمن شامل تھے۔جبکہ ملک خدا بخش بچہ اور عزیزاحمد جیسے سول سروسز کے نامی گرامی لوگ بھی اس میں شریک تھے۔ بالادست طبقات ، درمیانے طبقے کی بالائی پرت،تاجروں کے نمائندوں کی شمولیت یہاں تک کہ بدمعاشوں جنہیں عرف عام میں رسہ گیر کہاجاتاہے ،کے سرپرستوں کی پارٹی میں شمولیت بلاشبہ ایک موقع پرستانہ رد عمل تھا جو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچ کر زمین اور دولت کے مزید حصول کیلئے تھا،جس کی یہ نظام ہمیشہ حوصلہ افزائی ہی نہیں داد رسی بھی کرتا چلا آرہاہے۔

پارٹی منشورکے ساتھ زبانی کلامی حمایت کے دعووں اوربھٹو کے ساتھ وفاداری کاا ظہار کر کے پارٹی میں ایسے عناصر کا شامل ہونا بہت آسان کام تھا۔ہر چند 70ء کے الیکشن کے بعد اپنے اپنے علاقوں کے اندر ان کا مقامی روایتی اثرورسوخ ختم ہو چکا تھا تاہم اشرافیہ طبقے کے ان افراد نے بہت جلد ہی اپنی صلاحیت اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنا کھویاہوا مقام ومرتبہ حاصل کرلیا۔ان کے افسرشاہی میں اپنے روابط اوراثرورسوخ کے ذریعے پارٹی کے ضلعی اور صوبائی عہدیداروں کے ساتھ بہترین تعلق اور مراسم استوار ہوگئے۔ویسے بھی انہیں" دلالی "کا فن خوب آتاتھا جس سے پارٹی کے عہدیداراورکارکن اتنے واقف نہیں تھے اور نہ ہی ان کو پہلے کبھی اقتدار کے ایوانوں سے اس طرح پالاپڑاتھا ۔

اپنے ان تعلقات کو اشرافیہ نے بہت خوبی اورخوبصورتی کے ساتھ بروئے کارلاتے ہوئے اپنی طاقت کو پھر سے تعمیر کرنا شروع کردیا۔انہوں نے مقامی سطح پراپنے پیاروں کے لیے ملازمتیں حاصل کر لیں اوران کے تبادلے اور ترقیاں کرائے گئے۔زیادہ نہری پانی ،زرعی قرضوں'کھادوں' ٹیوب ویلوں وغیرہ کا حصول ان کی دسترس میں آتاچلاگیااور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ خاندانی اور ذات برادری کے عناصر پارٹی اور اس کی سیاست میں حاوی ہونے لگے ،یہاں تک کہ کابینہ سازی اور ضمنی الیکشن تک کیلئے بھی یہ کیفیت پیداہوگئی۔

ایک بار جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر یہ جڑ پکڑتا ہی چلاگیا۔زمیندار گھرانوں کو ویسے بھی ذات برادر ی کی سازشی سیاست کا تاریخی تجربہ اور ملکہ حاصل تھا جس کی مدد سے وہ اپنا حلقہ اثر پیداکرنے اور اسے مستحکم کرنے میں کامیاب ہوتے چلے گئے۔ 1974ء

تک جاگیردار گھرانوں کے چشم وچراغ نہ صرف پارٹی کے ضلعی عہدوں بلکہ پیپلزورکس پروگرام کی باڈیوں میں بھی سامنے آنے شروع ہوگئے۔جبکہ رورل ورکس پروگرام سمیت مقامی ترقی کے ہرپروگرام میں ان کا وسیع عمل دخل تھا۔

1975ء کے وسط تک اشرافیہ خاندان کا ایک فرد سیدناصرعلی شاہ پنجاب پیپلزپارٹی کا جنرل سیکرٹری بن چکاتھاجبکہ پنجاب کا

وزیراعلیٰ بھی نواب صادق قریشی کوبنادیاگیاجبکہ پنجاب کی گورنری نواب صادق محمد خان امیر بہاولپورکو مل چکی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ 1976ء تک یہ طبقہ پارٹی پر حاوی ومسلط ہوچکاتھا اور اسی نے ہی 1977ء کے عام الیکشن کیلئے امیدواروں کی ٹکٹوں کی سیاست بھی سنبھال لی تھی۔اس الیکشن کیلئے جن کو ٹکٹیں دی گئیں ان کے ناموں کی فہرست سے ہی صاف پتہ چلتاہے کہ ان میں کیسے کیسے گھرانوں کے لوگ تھے۔ان کی اکثریت کا تعلق انہی خاندانوں سے ہی تھا جو 1920ء سے 1958ء تک مسلسل پنجاب کی انتخابی سیاست پر حاوی اور مسلط چلے آرہے تھے۔ یہ سارے اقدامات اور پھراس پراس عرصے میں جنم لینے والا افراط زرجو بھٹو کی مختلف حلقوں کو بیک وقت مطمئن کرنے کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور جن کی وجہ سے خاندانی ،تعلیمی،اخلاقی اورادارہ جاتی انحطاط زورپکڑتا چلاگیا ،لاء اینڈ آرڈر اور عمومی معیارزندگی میں گراوٹ آتی چلی گئی جو شہری علاقوں میں پارٹی کی مقبولیت کوکافی حدتک کھاتی چلی جارہی تھی۔

بلوچستان

بھٹو نے فوج کے ادارے کو اس سوچ کے ساتھ بحال کیاتھا کہ وہ اس طرح اپنی حکمرانی کو تقویت اورفروغ دے سکے گا۔جیسا کہ ہم پہلے ذکرکر چکے ہیں کہ 1971ء کی جنگ میں شکست کے بعدکی کیفیت میں سرمایہ دارانہ ریاست کو آسانی سے اکھاڑکرپھینکا جاسکتاتھا اور اس کی جگہ ایک مزدور ریاست قائم کی جاسکتی تھی۔ مگر اس کیلئے نہ توکہیں کوئی نیت تھی نہ پروگرام اورنہ ہی کوئی تیاری تھی۔چنانچہ تباہ وبربادہوجانے کے باوجود بھی پرانے ریاستی ڈھانچے نے پھر سے زندہ ہونا ،پائوں جمانا اور طاقت پکڑنا شروع کردی۔ اپنی سماجی ساکھ کی بحالی اور بقا حاصل کرلینے کے بعد بھٹو کو احساس ہونا شروع ہوگیا کہ افسر شاہی کے اپنے ہی عزائم‘ ترجیحات اورمجبوریاں ہیں مگر تب بھٹو کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔یہ اب فوج تھی جو فیصلوں پر حاوی ہوچکی تھی اور عسکری کاروائی کے ذریعے اپنا آپ منوانا شروع کر چکی تھی۔

پاکستان جیسے ملکوں کے اندر اکثروبیشترایسے حالات و مقامات موجودہوتے اور

رہتے ہیں کہ جن کیلئے فوجی کاروائی کسی بھی وقت شروع کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔بہت سے معاملات و مسائل ہیں جو فوج کو سنبھالنے پڑجاتے ہیں۔اس بار جو مسئلہ پیش آیا وہ بلوچستان میں شروع ہونے والی پرانی سرکشی تھی جو عرصے سے دبی ہوئی تھی۔جہاں ایک سلگتاہوا قومی مسئلہ کب سے موجود چلا آرہاتھا۔بلوچستان میں منظم گوریلا سرگرمیوں کی پرانی روایت چلی آرہی تھی۔بلوچ نوجوان چین ،کیوبا اور چی گویراکی بولیویا اور لاطینی امریکہ میں ہونے والی جدوجہد سے متاثر ہو رہے تھے۔

پیپلزپارٹی 70ء(ANP)کے الیکشن میں بلوچستان اور سرحدمیں حکومت بنانے میں ناکام رہی تھی اور وہاں این اے پی اور جمعیت علمائے اسلام نے الیکشن میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔چنانچہ وہاں ان دونوں نے مخلوط حکومتیں بنالیں۔ریاست کی مرکزیت کی بحالی اور برتری نے جلد ہی اپنے اثرات مرتب کرناشروع کر دیئے ۔جن کے نتیجے میں مسائل اور تنازعات نے جنم لیا اور ریاست ان مظلوم قومیتوں کے حامل صوبوں پر چڑھ دوڑی اوروہاں فوجی آپریشن کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی گئی۔

فروری 1973ء میں عراقی سفارتخانے سے سفارتی ترسیل کے ذریعے سے آنے والے اسلحے کی برآمدگی پر پاکستانی حکومت نے الزم عائدکردیاکہ یہ بلوچستان میں تقسیم ہونے کیلئے آیاتھا۔ فروری 1975ء میں سرحد میں حیات محمد شیرپائو کے ایک دھماکے کے نتیجے میں ہلاک ہونے کے بعد جو بھٹو کا دایاں ہاتھ سمجھا جاتاتھا، بھٹوکے پاس عذر آگیااور اس نے سرحد میں قائم مخلوط حکومت کو برخاست کردیاجس پر بلوچستان کی حکومت نے احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔تمام صوبوں میں برتری کی خواہش میں بھٹو کی این اے پی(ANP) کی قیادت،خاص طورپر بلوچوں کے ساتھ مسلسل تصادم کی کیفیت چلی آرہی تھی ۔ANP قیادت کی کوششوں میں مشرقی پاکستان کاتاثر محسوس کررہاتھا ۔یہ ایک خوف تھا جو اس کے دل ودماغ میں بیٹھ چکاتھا اسے اچھی طرح یادتھا کہ نیپ(NAP) نے مشرقی

پاکستان میں عوامی لیگ کی حمایت کی تھی،جبکہ اب نیپ کے حامی پٹ فیڈرضلع سبی کے علاقے میں زرعی زمینوں پر قبضے کے لیے پاک فوج کے ساتھ لڑائی میں ملوث ہو چکے تھے۔جس پر بھٹو نے اعلان کر دیا کہ ”بلوچ قیادت صوبے بھر میں پھیلی وسیع بے چینی کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو چکی ہے جس کی وجہ سے وہاں کے رہائشیوں کیلئے بلکہ صوبے کے امن وامان کیلئے بھی شدید مشکلات پیداہوچکی ہیں“۔(47)

چنانچہ بھٹو نے نیپ(NAP) کی حکومت ختم کرتے ہوئے فوج کو بلوچستان بھیج دیا جس کا مقصد یہی ظاہر کیاگیا کہ یہ وہاں سڑکیں تعمیر کرے گی اور غریب بلوچوں کیلئے بجلی اور پانی کی فراہمی کا بندوبست کرے گی۔

یوں ایک بارپھر پاکستان کی فوج سیاست میں داخل ہو چکی تھی جس نے آگے چل

کر خود بھٹو کا بھی فیصلہ کرناتھا۔چھوٹے چھوٹے بلوچ رہنما اپنے ساتھیوں سمیت صرف پہاڑوں کی چوٹیوں تک ہی رسائی رکھتے تھے۔جبکہ بڑے سردار اور قبائلی سربراہ اورنیپ(NAP) کے قائدین جن میں سردار خیر بخش مری بھی شامل تھا،کوسازش اور غداری کا الزام لگا کر گرفتار کرلیاگیا اور انہیں مقدمے کیلئے حیدرآباد لے جایاگیا۔

”خیر بخش مری کے ایک نائب میر ہزار خان نے 1976ء تک مری قبائل کے علاقے میں سرکشی جاری رکھی اور اس کے بعد وہ افغانستان چلاگیا اور وہاں سے ہدایات کے ذریعے سرکشی کو جاری رکھا۔اس دوران ہی پاک فوج کو ایران کی طرف سے تیس ہیوئے کوبراہیلی کاپٹرگن شپس کا تحفہ مل چکاتھا۔ ایران کو خود بھی پاکستانی بلوچستان کے علاقے میں ہونے والی سرکشی کے اپنے ملحقہ علاقوں میں در آنے کے خطرات لاحق تھے۔فوج نے 3ستمبر1974ء کوان گن شپس کو وادی چمالنگ کے علاقے میں پناہ گزین مری قبائل کے خلاف استعمال کیا(جس کی زدمیں عورتیں او ربچے بھی آگئے)۔ اس واقعے سے برگشتہ ہوکر مری قبائل چوٹیوں سے اتر آئے اور تین دن تک فوج کے ساتھ شدید جنگ شروع کر دی جس میں مری قبائل کو بہت بھاری نقصان سے دوچارہوناپڑگیا“۔(48)

اس کے بعد بلوچستا ن کے دوردراز کے علاقوں میں لڑائی چلتی رہی‘ قبائلیوں نے فوج کی عددی وعسکری برتری کے باوجود مقابلہ جاری رکھا۔بھٹو حکومت نے با لآ خردسمبر 74ء میں بلوچستان پر ایک وائٹ پیپر شائع کیا۔جس میں پاک فوج کی شاندار فتح کا اعلان بھی شامل تھا اور یہ بھی کہ اسے جلدہی واپس بلالیا جائے گا۔فوج کی تو خیر واپسی نہیں ہوسکی ہاں البتہ خود بھٹو کی ضرور واپسی کر دی گئی ۔

اس لڑائی میں دونوں طرف سے بھاری نقصان ہوا۔بلوچ نوجوانوں نے انتہائی دلیری سے مقابلہ کیاتھااور اس وقت اس مسلح جدوجہد کے پیچھے ایک بائیں بازو کا عنصر موجودتھا ۔اگرچہ اس کا طریق کار اور نظریاتی بنیادیں کلاسیکل مارکسسٹ لیننسٹ حکمت عملی کی حامل نہیں تھیں۔فوج نے وحشیانہ طریقے سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی بلکہ کسی حدتک اس نے وہی کردار اداکیا جو71ء میں بنگال میں کر چکی تھی ۔ بلوچ جدوجہد حکومت کے 74ء میں کیے گئے دعوے کے باوجود ختم نہیں ہوئی تھی۔بلکہ اس نے ہتھیار نہیں پھینکے اور کسی نہ کسی شکل میں چلتی رہی۔ المیہ یہ ہے کہ فوج کے ہاتھوں بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعدضیائی حکومت کی طرف سے ایک سازش کی گئی جوکہ بلوچستان میں ہونے والی جابرانہ فوج کشی کے مرکزی کرداروں میں‌سے ایک تھا۔ضیاء نے انتہائی منافقانہ انداز اپنایا اور چال چلی اور حیدرآباد سازش کیس کو ختم کرتے ہوئے بلوچ رہنمائوں کو رہاکردیا۔یہاں تک کہ افغانستان میں جلاوطنی اختیار کرنے والے بعض بلوچ رہنمائوں کو فوجی C13Oطیارے میں‌واپس لایاگیا جن کا ضیاء نے اپنی منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ استقبال بھی کیاتھا۔

ریاست کے ساتھ جاری رہنے والی اس طویل مزاحمت کے بہت ہی غیر معمولی نتائج نکلے اورپھر یہ جدوجہد صوبے اور ملک کے عوام سے مکمل طورپر الگ تھلگ اور تنہا رہی۔مگر اس کی وجہ سے بعد کے کئی سالوں تک قومی مسئلہ بلوچستان میں سر اٹھائے رہا۔یہ مسئلہ ابھی تک بھی حل طلب ہی ہے اورجب تک یہ سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے یہ حل ہو بھی نہیں سکتا۔پاکستان میں جاری بحران کی شدت میں اضافے سے اس کی پیچیدگی اور نوعیت بھی بڑھتی چلی جارہی ہے۔قومی مسئلہ اور بھی متشدد ہوتا چلا جارہاہے۔ایک لیننسٹ طریق کار کے

بغیر مظلوم قومیتوں کے دکھوں اور محرومیوں کا مداوا ناممکن ہے۔اس کے بغیر یہ طبقاتی وحدت اور جدوجہدکو بھی مزید نقصان پہنچاتارہے گا ۔قومی آزادی کاحصول صرف اس نظام کو اکھاڑکر پھینکنے سے ہی ممکن ہوسکے گا جو ان سب ذلتوں ٗمحرومیوں اور دکھوں کو جنم دیتا اور ان کی مسلسل پرورش کرتا رہتا ہے۔سرمایہ داری کو ختم کرتے ہوئے ،اس کی جگہ مزدوروں کی انقلابی ریاست کے قیام سے سبھی جمہوری حقوق بشمول قومی اور لسانی آزادی کے حقوق کی ضمانت ممکن ہو سکتی ہے اور ایساصرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی کیا جاسکتاہے۔

بھٹو حکومت کے درمیانی عرصے میں ہی اس بات کے اشارے ملنے شروع ہو گئے تھے جن سے پتہ چلتاتھا کہ افسرشاہی دھیرے دھیرے اپنا اثرورسوخ بحال اور مستحکم کررہی ہے۔اس کا آغاز اس نے پیپلز ورکس پروگرام سے کیاجس میں تحصیل اور ضلع کی سطح کی افسرشاہی پیپلزپارٹی کے قومی وصوبائی ارکان اسمبلی کی معاونت سے اس پروگرام میں سے پارٹی عہدیداروں کو باہر نکالنے اور دور رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔لیکن اس سے بھی بڑھ کر افسرشاہی خود پارٹی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوگئی۔اس نے بھٹو کے مقامی دوروں اور اس دوران بھٹوکی عوامی کچہریوں کو منظم کرناشروع کردیاتھا۔پارٹی کے عہدیداروں کو صرف عوام کو اطلاع دینے اور اکٹھا کرنے کی ہی ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔یہ پروگرام اپنی نوعیت میں شاہانہ طرز سے ایک دربارکی طرح سے ترتیب دیے جاتے تھے۔1974ء میں ہی دو اور اہم واقعات ایسے ہوئے جوقابل توجہ اور اہمیت کے حامل تھے۔ان میں سے ایک ڈاکٹر مبشرحسن کی وزیرخزانہ جیسے مضبوط عہدے سے برخاستگی تھی۔صنعتکاروں کیلئے تو یہ ایک خوشخبری سے کم واقعہ نہیں تھا مگر اسی سے یہ بھی ثابت ہورہاتھا کہ تیسری دنیا کی قیادت کا نعرہ لگانے والی پیپلزپارٹی کی قیادت کس طرح قدیم ریاستی ڈھانچے کے دبائو کا شکارہوچکی تھی۔دوسرا اہم ترین واقعہ جولائی میں جے اے رحیم کی کابینہ اور پارٹی عہدے ،دونوں سے برخاستگی تھی۔ رحیم کی رخصتی پیپلزپارٹی کیلئے اندھی کھائی ثابت ہوئی،وہی ایک لیڈر تھا جو نہ تو بھٹو کے رعب دبدبے سے دبتا تھا نہ ہی اقتدار کی چکاچونداس کے دامن پرکوئی داغ

دھبہ رقم کرسکی تھی۔ وہ کبھی بھی خوشامدی نہ بن سکا اور پارٹی میں سوشلزم کے نظریات کا مسلسل علمبرداربھی رہا اور پارٹی کو تنظیمی طورپرایک وحدت میں جوڑکررکھنے والالیڈربھی تھا۔جو اس امیدپر لگا رہا کہ ایک دن آئے گا جب پارٹی اپنی حکومتی پالیسیوں پر آخرکار نظرثانی کرے گی۔

نتیجہ

پیپلزپارٹی میں شامل اور اس کا شریک سفر بننے والے بائیں بازو کے لیڈروں، دانشوروں اور ٹریڈ یونینسٹوں سے کچھ انتہائی فاش غلطیاں سرزدہوئیں۔جن کا نتیجہ ایک توخودپارٹی کی حکومت کے خاتمے کی اور ضیائی آمریت کی شکل میں سامنے آیادوسراسماج میں خود بائیں بازو کی تحریک کی اپنی رہی سہی ساکھ بھی داؤپرلگ گئی اور ان کے قائم کردہ کئی ادارے سوویت یونین کے زوال اور دیواربرلن کے گرنے سے بھی بہت پہلے زوال کا شکارہوگئے۔حقیقت یہ ہے کہ پارٹی میں داخل ہونے والال بایاں بازو نظریاتی طورپر اتنا پختہ و مضبوط نہیں تھااور نہ ہی یہ تنظیمی طورپر خود کو منظم کرپایاتھا کہ جو پیپلزپارٹی کی عبوری تحریک میں کوئی انقلابی کردار اداکرسکتا۔

سوشلزم کے بارے میں باتیں کرنا' اس پر بحث مباحثے کرنا ایک بات ہے جبکہ ایک انقلابی تبدیلی کیلئے نظریاتی پختگی کی سمجھ بوجھ رکھنا دوسری بات ہوتی ہے۔بھٹو عام طورپر سوشلزم کی کئی اقسام کی تشریح کرتارہتاتھاان میں اصلاح پسندی بھی شامل ہوتی تھی۔وہ اکثر وبیشتر سویڈن اور سکینڈے نیویا کی مثالیں بھی دیاکرتاتھا۔اور کچھ سیانے توابھی تک بھی ایسی ہی مثالوں سے اپنی دانش چمکاتے ہوئے مل جاتے ہیں۔دوسری انٹر نیشنل کے رجعتی کردار سے لے کر مرکزیت پسندی اوربائیں بازو کی اصلاح پسندی سمیت سٹالنزم کی کئی متروك قسمیں اب بھی سوشلزم کے نام پر پیش کی جاتی ہیں ۔مگر اپنی ہئیت اور نوعیت میں یہ سب اصلاح پسندی کی ہی شکلیں ہیں جو آخری تجزیے

میں سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک کر سر بسجود ہو جاتی ہیں اور یوں ایک بھیانک ردانقلابی کردار اداکرتی ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ مختلف النوع نظریات سے لیس تھے جو نہ تو کبھی نظریاتی طورپر منظم و متحد ہوسکتے تھے اور نہ ہی یہ ایک خالص مارکسی نظریاتی بنیادیں تعمیر کر سکتے تھے جو سماج کو درپیش بڑے چیلنجز کا سامنا اور مقابلہ کرنے کی اہلیت کی حامل ہوتیں۔دوسرا یہ بایاں بازو خود بھٹوکی ذاتی وشخصی مقبولیت کے حصاروسحر سے متاثرہوچکا تھا۔پارٹی کے یہ بائیں بازو کے سیاستدان اگر کم سے کم

بھی کہا جائے تواتنے نادان اور بھولے بادشاہ تھے کہ انہوں نے اس سماجی یلغار کو مضبوط کرنے کی بجائے جو تحریک کی حقیقی طاقت تھا اور عوام کی سماج کو تبدیل کردینے کی خواہش کا براہ راست عکاس بھی تھا' بھٹو کی شخصیت کا طلسم ابھارنے پر زیادہ زور دیا۔عوام سماج کو بدلنا چاہتے تھے اور اس نظام کو تہس نہس کرنا چاہتے تھے جس نے ان کی زندگیوں کو تہس نہس کررکھاتھا۔بھٹوہی ان کی تبدیلی کی اس جستجو کا تشخص بن گیا۔

یہ تشخص دن بدن مضبوط ہوتا گیا کیونکہ بھٹو اپنی ہر جوشیلی تقریر میں ان کے مسائل اور دکھوں کوبیان کرتااور سوشلزم کے نعرے لگاتا اورلگواتاچلا جارہاتھا۔جس کا پرجوش جواب اسے مزید بائیں بازو کی طرف دھکیلتا چلاگیا۔مگر جب حکمران طبقات نے تحریک پر پہلے جنگ اور پھر اصلاح پسندی کے ذریعے ردانقلابی حملہ کیا تو ان بائیں بازو والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ اب عوام کو کیسے اور کس طرح منظم و متحرك کیا جائے اور ریاست کے ان حملوں کا جواب کس طرح دے کر اسے شکست دی جائے۔پیپلز پارٹی کی حکومت کی موجودگی میں ایک سرمایہ دارانہ ریاست کا اصلاحات کرنا ایک ناگزیر عمل تھا۔ ایک بورژوا ریاست کے ہوتے ہوئے' اس کے ڈھانچوں کے اندر رہتے ہوئے حکومت کرکے انقلابی نتائج کاحصول وہ یوٹوپیا ہے جس کے خلاف مارکسزم کے سبھی عظیم استاد **1848**ء سے اب تک تاریخ کے ہر نازك مرحلے پر مسلسل لکھتے چلے آرہے ہیں۔

سب سے بڑی کمزوری اورخامی ان بائیں بازو کے لیڈروں کی جو تھی وہ بین الاقوامیت کے احساس سے محرومی تھی۔مارکسز م یا تو بین الاقومیت ہے یا پھر یہ کچھ بھی نہیں۔ پہلی سے چوتھی انٹرنیشنل تک نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے مارکسزم اپنے آغاز سے انجام تک صرف اورصرف بین الاقوامیت ہی ہے۔ سٹالنزم کا پیداکردہ قومی سوشلزم پہلے حب الوطنی،پھر پاکستانیت سمیت ہمہ قسم کے قومی شاونزم کی بنیادبنتا چلاگیا۔قومی خودمختاری،قومی مفادات،اور قومی دفاع وغیرہ جیسے تصورات اسی کا ہی شاخسانہ اور نتیجہ ہیں۔اس قسم کے پیٹی بورژوا تصورات اور ان کی طرف سوشلسٹوں کے معذرت خواہانہ رویوں نے ہی دائیں بازو کی قوتوں اور ریاست کو وہ طاقت فراہم کردی جس سے انہوں نے مل کر انقلابی قوتوں کو پیپلزپارٹی کے اندراور باہر شکست سے دوچار کردیا۔**71**ء کی جنگ نے بھی سوشلسٹوں کو گمراہ کرنے میں اہم کردار اداکیا جس کی وجہ سے وہ بین الاقوامیت کے اصول کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوتے چلے گئے۔

پیپلزپارٹی کا بایاں بازو اپنی متضاد ومتذبذب نظریاتی بنیادوں کی وجہ سے کبھی بھی خودکو ایک انقلابی وحدت و اکائی کے طورپر منظم نہیں کرپایانہ توپارٹی کے اندر نہ ہی اس سے باہر۔وہ پارٹی میں کہیں گہری مداخلت(**Deep entryism**) کررہے تھے اور وہ

بھی اس وقت کی کیفیت میں ایک بھدے اندازمیں کیاگیا۔بائیں بازو نے دائیں بازو کے خلاف کوئی کمزور سا بھی یونائٹڈ فرنٹ بنانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔چنانچہ اقتدار ملتے ہی پیپلزپارٹی کی قیادت نے آسانی کے ساتھ معاملات کو چلایا اور موقع ملتے ہی بائیں بازو کوبے وقعت کرکے رکھ دیاکچھ تو ان میں سے پارٹی سے باہر نکل گئے اور کچھ وہیں رہ کر اپنی حقیقی پالیسیوں پر مصالحت کرتے رہے جبکہ اس دوران وہ سوشلزم کے نام کی مالا جپنا ہرگزنہیں بھولے۔

اگر ہم پیپلزپارٹی کے جنم،ڈھانچوں اور اس کی نشوونما کا جائزہ لیں تو یہ دوسری سوشلسٹ انٹرنیشنل کے ساتھ منسلک مزدور طبقے کی پارٹیوں کے عمومی تنظیمی معیار پربھی پوری نہیں اترتی تھی ۔تاہم اس کے باوجود بھی پیپلز پارٹی اس انٹرنیشنل کا حصہ بن ہی گئی (جسے روزالکسمبرگ متعفن مردہ خانہ قراردیتی تھی) جو تیزی کے ساتھ دائیں بازوکی طرف لڑھکتی چلی گئی۔تبدیلی کے اس عمل کے دوران یہ سوشل

ڈیموکریسی کی ان پالیسیوں کو بھی منظورومقبول کرتی چلی گئی جنہیں یورپ کی قدامت پسند پارٹیاں بھی اپنانا پسند نہ کرتیں۔

لیکن پیپلزپارٹی چونکہ **1968/69**ء کے انقلاب کی پیداوارتھی جس سے سٹالنزم غداری کر چکا تھا جس کے باعث خلا پیداہوا جسے بھٹونے پر کیااور اس نے اس میں پہل قدمی کرکے موقع سے فائدہ اٹھایا۔اس نے انقلابی زبان اور سوشلسٹ نعرے لگاتے ہوئے اس عظیم انقلابی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔پیپلزپارٹی پاکستان کے محنت کشوں اور محروم عوام کے سیاسی اظہار کی وہ روایت بن گئی کہ آج تک کوئی اس کا متبادل نہیں بن سکا۔مسئلہ یہ ہے کہ قومی قیادت حکمران طبقات کی پالیسیوں کے شدیددبائومیں آجاتی ہے جس سے ان کا محنت کشوں اورعوام کی امنگوں کے ساتھ ایک تضاد ابھرناشروع ہوجاتاہے۔یہ کیفیت ناگزیرطورپرپارٹی کے اندر ایک ”لیفٹ اپوزیشن“ کوابھار دے گی جبکہ محنت کش طبقے کا دبائو پارٹی کو طبقاتی جدوجہدکی طرف دھکیلنے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے۔مارکسسٹوں نے خود کو اس تناظر سے جوڑے رکھنا ہے اور اس دوران وہ پارٹی کے اندر ایک مارکسی رحجان تعمیر کررہے ہیں جوآنے والے وقتوں میں محنت کشوں کی تحریک کیلئے متبادل قیادت فراہم کرے گا۔

اگرصرف بھٹوپر ہی یہ الزام عائدہوتاہے کہ اس نے سوشلزم کو اپنے اقتدار کیلئے استعمال کیا تو پھر بائیں بازو کو بھی کسی طور اس سے بری الذمہ قرارنہیں دیاجاسکتا۔اگر بھٹونے سوشلزم کے ساتھ قوم پرستی اور مذہب کو خلط ملط کرنے کا ارتکاب کیا تو بائیں بازو کی بڑی تعداد بھی مائواسٹ اور سٹالنسٹ پس منظر کے ساتھ اسی قوم پرستی میں لپٹی رہی‘مذہب نہ ہی سہی۔انہوں نے بھی طبقاتی جدوجہد کو حب الوطنی اور قوم پرستی کے غلاف پہنائے رکھے۔سچ تو یہ ہے کہ یہ سب تو ان کی ہی

نظریاتی وسیاسی تعلیم وتربیت و آگہی سے بالکل ہم آہنگ نقطہء نظر اور کوشش تھی .یہ بھی تو انہی پیشین گوئیوں اور آدرشوں کا ہی مجموعہ تھی جسے وہ سوشلزم قراردیتے چلے آرہے تھے۔دومرحلوں کی نفسیات اور نصاب کے باعث ہی انہوں نے بھٹو کو ایک ترقی پسندبورژوا ،امید کا مینارہ قراردیاتھا جو قومی جمہوری انقلاب کا فریضہ مکمل کرسکتاتھا اور جس کے بعد انہوں نے مستقبل بعید کے کسی مرحلے پرسوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کر دینی تھی۔کئی ”عظیم انقلابیوں“ نے تو برصغیر کی تقسیم اور پاکستانی قوم پرستی کی بھی حمایت کر دی تھی ۔ایک بار پھر قیادت کے مسئلے پر وہ بھی سٹالن اور مائو کی تقلید کے اندازمیں بائیں بازو قیادت ایک فرد کی قیادت ،ایک مسیحا اور ایک عوامی رہنما کے عقیدے کے تحت بھٹو کو بت بنا کے غیر بالشویک رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ایک اجتماعیت کی حامل سوچ اور رویہ اپنانے کی بجائے جس کے ذریعے بنیادی مسائل پر بحث مباحثے کرتے ہوئے قیادت کی تعمیر وتشکیل کی جاتی،بھٹو کی ذات اورصفات کوہی مرکزومحور بنالیاگیا۔بطور فرد بھٹو کا کردار ماضی کی کابینہ کے اہم وزیر کی حیثیت کی وجہ سے ابھرا جسے پہلے حکمران طبقات کے ذرائع ابلاغ اور بعدازاں عوام نے اپنے کاندھوں پر بٹھالیا۔اس کی ذات اس کی شخصیت پر عوام کا بے پناہ بھروسہ اور اعتماد ایک اجتماعی بالشویک قیادت کی غیرموجودگی اور ایک جمہوری مرکزیت کی حامل پارٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے تعمیر ہوتا گیا کیونکہ ان کے پاس کوئی اور انقلابی متبادل ہی نہیں تھا۔ ہر چند تاریخ میں فرد کے کردار کو کبھی بھی مکمل طورپرنظرانداز نہیں کیاجاسکتامگر کسی انقلاب کا مقدر اورمنزل کبھی بھی ؛کہیں بھی ایک فردواحد کے پابند نہیں رہتے ،نہ ہی رہے ہیں۔مارکس کبھی مارکس نہیں ہوسکتاتھااگر پہلی انٹرنیشنل کی کمیونسٹ لیگ نہ ہوتی۔اسی طرح لینن بھی کبھی لینن نہیں ہوتا اگر بالشویک پارٹی نہ ہوتی۔ادھر ادھر بھٹکنے والی بائیں بازو کی قیادت کو مجبوری کے عالم میں سیاست کے مرکزی دھارے میں شریک ہونے کیلئے شارٹ کٹ استعمال کرناپڑگیاانہوں نے بھٹو کو اس کام کیلئے استعمال کرنے کی کوشش کرنے کی ٹھان لی اوران کو یہاں مطلوبہ جگہ مل بھی گئی۔مگر اس کیلئے انہیں بھٹوکو قائد عوام کے طورپر تعمیر کرنے کی قیمت بھی اداکرنی پڑی۔بجائے ایک انقلابی سوشلسٹ پارٹی کو تعمیر کرنے کے جو انقلابی تحریک کو انقلاب سے ہمکنارکرتی،انہوں نے ایک تشخص کو تعمیر کرناشروع کردیا۔لینن اکثر اوقات ایک بات کہا کرتاتھا کہ انقلاب کیلئے کوئی چورراستہ نہیں ہواکرتااور ٹیڈگرانٹ کے بقول تو بہت سے چور رستے صرف اندھی کھائی میں ہی دھکیل دیاکرتے ہیں۔

1967ء میں پیپلزپارٹی کے قیام سے لے کر اب تک پارٹی کے بائیں بازو کے پاس بے شمار مواقع آئے کہ جب آگے پیش

قدمی کرتے ہوئے ایک حقیقی سوشلسٹ پروگرام کی طرف بڑھا جا سکتا تھا مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔اس وجہ سے پارٹی کے اندر مارکسسٹوں کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔زندگی ہی زندگی کے بارے سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر سکھایا کرتی ہے اور پیپلزپارٹی سے امیدیں لگائے عوام بھی بہت جلدبہت بڑے واقعات سے بہت کچھ سیکھ لیں گے۔اگر ایسے موقع پر مارکسسٹ موجود رہتے ہوئے،انتہائی صبروتحمل کے ساتھ اپنے پروگرام کو عوام میں پیش کرتے رہے،تو وہ پارٹی کے ا ندر ایک انقلابی مارکسی رحجان تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ناقابل مصالحت نظریاتی موقف اور اصولوں پر استوار رہتے ہوئے،طریق کار میں انتہائی لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے،یہ رحجان پہلے تو پارٹی کے اندر ”لیفٹ اپوزیشن“ کی حیثیت اختیارکرے گا اور پھر اس کے بعد یہ آنے والے وقت میں ایک سوشلسٹ فتح کی رہنمائی کرتے ہوئے اس کو یقینی بنائے گا۔ **1968/69**ء کے اسباق،اس کے تجربات ،اس میں کی جانے والی پارٹی کے بائیں بازوکی غلطیاں،یہ سب پاکستان میں انقلاب کیلئے ناگزیر داخلی قوت کی تعمیراوراس کی نظریاتی تربیت اور تنظیمی بڑھوتری کے عمل میںمعاون ورہنما ثابت ہوگا۔

جنگیںا ور انقلابات تاریخ کے غیر معمولی واقعات ہواکرتے ہیں؛یہ نہ تو ہر آئے دن ہوتے ہیں نہ ہی یہ غیر معینہ طویل مدت تک جاری و ساری رہاکرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی موجودگی میں مروجہ نظام اور اس کے سبھی معمولات درہم برہم ہوکر رہ جاتے ہیں۔اس سے سماج میں ایک مبہم و مشتعل کیفیت حاوی ہوجایاکرتی ہے جو زیادہ عرصہ نہیں قائم رہ پاتی۔ایسی کیفیت میں ریاستی طاقت کا محنت کش طبقے کے ساتھ کھلاتصادم ہوتاہے۔یا توایک انقلابی پارٹی اقتدار پر کنٹرول حاصل کرکے مزدورریاست قائم کرلیتی ہے یا پھرحکمران طبقات خانہ جنگیوں اور بدترین تشدد پر اتر آتے ہیں۔کسی بھی انقلابی تحریک کی شکست بدترین عواقب ونتائج کا باعث بن جایاکرتی ہے۔**1968/69**ء کی انقلابی تحریک کا پہلا مرحلہ 138 دن تک چلتارہاتھا۔

ایک انقلابی پارٹی کو ہر صورت میں سیاسی اورتنظیمی ڈھانچوں پر قبضہ کرناہوتا ہے۔ایسی پارٹی ریاستی طاقت کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد ایک مزدورریاست قائم کرتی ہے اور ایک نیا سیاسی و سماجی نظام رائج کرتی ہے۔لیکن اگر کوئی انقلابی پارٹی انقلاب کیلئے تیار نہیں ہوتی اور نئے سماجی نظام کا فریضہ سرانجام نہیں دیتی تویہ لامحالہ پرانے ریاستی ڈھانچے کوہی کام میں لانے پر مجبور ہوجاتی ہے اوریوں اس کی انقلابی پالیسیوں اور پروگرام کے باوجود بھی انقلاب مکمل نہیں ہو پاتا۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پرانے سماجی نظام اور اس کے ڈھانچوں کو قائم رکھنے سے ریاست اس کے ہاتھوں استعمال ہونے کی بجائے اسے استعمال کرتی ہے، اسے عوام کی حمایت سے محروم کرکے اسے نشان عبرت بنا دیتی ہے۔پیپلزپارٹی بارہا اس انجام سے دوچارہو چکی ہے۔راولپنڈی

کی جیل میں لکھی جانے والی اپنی آخری کتاب ”اگر مجھے قتل کیا گیا“ میں بھٹو نے لکھا:

”میں اس آزمائش میں اس لیے مبتلا ہوں کہ میں نے ملک کے شکستہ ڈھانچے کو پھر سے جوڑنے اور متضاد ومتحارب طبقات کے مابین ایک آبرومندانہ اور منصفانہ مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فوجی بغاوت کا سبق یہ ہے کہ ایسی ہر مصالحت محض ایک یوٹوپیا' ایک دھوکہ ہے۔فوجی بغاوت ثابت کرتی ہے کہ طبقاتی کشمکش ناقابل مصالحت ہوا کرتی ہے۔اس میں ایک طبقے کی جیت دوسرے طبقے کی مات بن جایا کرتی ہے،یہی نوشتہ دیوار ہے“۔(2)

ذوالفقار علی بھٹو کا یہ آخری اعتراف سچا بھی تھا اور دیانت پر مبنی بھی۔مگر پھر اس کے بعد کی پارٹی قیادت اپنے بانی چیئرمین کے اس تاریخی سبق کو بھی کچرے دان میں پھینکتی چلی آرہی ہے۔ پارٹی قیادت بھٹو کی موت کی کال کوٹھڑی میں لکھے گئے اس تاریخی پیغام سے سیکھنے میں نااہل ثابت ہوئی ہے۔انہیں سرمایہ دارانہ نظام سے ہٹ کر کچھ نہ سمجھ آرہا ہے نہ نظر'لیکن ان کی بدقسمتی کہ عوام ابھی تک پارٹی سے بندھے ہوئے ہیں اور جب یہ عوام تاریخی عمل میں قدم رکھتے ہیں'خواہ وہ الیکشن ہو ں یا کوئی انقلابی تحریک،تو یہ پیپلزپارٹی کا ہی رخ کرتے ہیں محض اس کے پروگرام اور خاص طور پر **1968/69**ء کے انقلاب کی وجہ سے کہ جس نے پارٹی کو عوام کی روایتی پارٹی کے تاریخی کردار

سے نوازا تھا۔

مسئلہ اور معاملہ یہ ہے کہ عوام اس قیادت سے محروم ہیں جس کے وہ مستحق ہیں جس کی ان کو تلاش اورجستجو ہے۔تین دہائیوں میں پارٹی تین بار اقتدار میں آئی اورتینوں دفعہ ہی اس نے عوام کی امنگوں کو مایوسیوں میں بدل ڈالا۔پارٹی حکومت کا ہر تجربہ عوام کیلئے ایک ہی سبق کا حامل رہا ہے۔پارٹی اقتدار کا موجودہ تجربہ بھی کوئی نیا سبق نہیں دے گا مگر پھر تاریخ میں کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا۔اس بار لاکھوں مزدور'کسان اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی سنجیدہ تبدیلی ضروری ہو چکی ہے۔ موجودہ مخلوط حکومت کا انجام واضح ہے۔زرداری الیکشن میں پارٹی کی حاصلات کو ضائع کرتا جا رہا ہے۔مارکسسٹوں نے باربار پارٹی قیادت کو خبردار کیا ہے کہ ایک حقیقی انقلابی پروگرام کو اپنائے اورلاگو کیے بغیر'سرمایہ داروں اورجاگیرداروں کا قلع قمع کیے بغیر حکمران طبقات پھر سے وہ حالات پیدا کردیں گے جو کہ ان کیلئے پہلے سے بھی بھیانک نتائج کے حامل ہوں گے۔مگر شاید واقعات ہی ان تجزیوں کو سچ ثابت کریں گے مگرپھر یہ کوئی حتمی کہانی نہیں ہوگی۔ پارٹی قیادت نظریات سے بے نیازی برت رہی ہے اور عوام ذلتوں کو بھگت رہی ہے۔عوام سبق سیکھ رہے ہیں'وہ جلد ہی جان جائیں گے کہ

صرف مارکسسٹ ہی تھے جو انہیں آگاہ اورخبردار کرتے آرہے تھے۔ ان حالات میں پارٹی کے اندرایک وسیع مارکسی بایاں بازو تشکیل دیاجاسکتا ہے ۔ بڑھتی ہوئی طبقاتی تفریق اور جلد ابھرنے والی عوامی تحریک پارٹی پر بے پناہ دباؤ ڈالے گی جس کے نتیجے میں پرولتاری دھڑا اصلاح پسند دھڑے سے الگ ہو جائے گا۔آنے والے وقت میں ایک اور 1968/69ء ناگزیر ہوچکاہے مگر اس بار یہ بلند وبرتر سطح پر اپنا اظہارکرے گا،جس قسم کے حالات اور کیفیت میں تحریک نے پیپلزپارٹی کو انقلاب کی روایت بنایا تھا ویسے ہی پیپلزپارٹی کے اندر موجود مارکسی رحجان ایک عوامی قوت کے طورپر ابھر کر سامنے آجائے گا۔اگر ایک مضبوط و مستحکم بالشویک طاقت اس دوران قائم کر لی جاتی ہے تو یہ آنے والے تاریخی لمحات اور واقعات میں فیصلہ کن کردار اداکرتے ہوئے پاکستان میں انقلابی سوشلزم کی فتح کی ضامن قرار پائے گی۔

نوٹس

1۔ انقلاب فرانس کا راہنما،نیشنل کنونش کا صدر بنا اور رابس پئیر کے اقتدار کے خاتمے کے بعد پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

2۔ ذوالفقار علی بھٹو،اگر مجھے قتل کیا گیا،(وکاس پبلشرز، دہلی ، 1979ء)، صفحہ 55

3۔ ٹیڈ گرانٹ، نوآبادیاتی انقلاب اور روس چین تنازعہ، اگست 1964ء ، ان ٹوٹ دھارا، صفحہ 310, 309 ,308

4۔ ایلن وڈز، بالشوازم راہ انقلاب، صفحہ 310

5۔ لینن ،مجموعہ تصانیف جلد 9، جمہوری انقلاب میں سوشل ڈیموکریسی کے دو طریقہ کار، صفحہ 98

6۔ ایلن وڈز، بالشوازم راہ انقلاب، صفحہ 312-311

7۔ لیون ٹراٹسکی،1905ء میں ہمارے اختلافات،صفحہ 332اور اسی صفحے پر حاشیہ

8۔ ایضاً

9۔ ٹیڈ گرانٹ، نوآبادیاتی انقلاب اور روس چین تنازعہ، اگست 1964ء ، ان ٹوٹ دھارا، صفحہ 309

10۔ پاکستان ٹائمز، لاہور، 30مارچ 1966ء

11۔ ایضاً 29اکتوبر1967ء

12۔ آؤٹ لک، 25اپریل 1964ء

13. پاکستان پیپلز پارٹی ، بنیادی دستاویز، صفحہ 5

14. بھٹو، ایک شفاف آغاز(انگریزی)، صفحہ 45

15. سٹینلے وولپرٹ، زلفی بھٹو آف پاکستان ، (آکسفورڈ) ، صفحہ 124

16. سوبھو گیان چندانی، نیوز لائن میں انٹرویو، اکتوبر 2008ء

17. بھٹو، جاگتے ہوئے عوام(انگریزی)، ذوالفقار علی بھٹو کے بیانات، مضامین، تقاریر، صفحہ 90

18. ایضاًصفحہ 93

19. ایضاًصفحہ94,95

20. ایضاًصفحہ233

21. ایضاًصفحہ169

22. ایضاًصفحہ179

23. ایضاًصفحہ197

24. ایضاًصفحہ240

25. دی نیوز اسلام آباد، 28ستمبر 2008ء

26. فلپ ای جونز، پیپلزپارٹی کی اقتدار تک اٹھان، صفحہ 98,99

27. ڈان یکم دسمبر 1967ء

28. پولیٹیکل کارسپانڈنٹ، نظریاتی مخالفین کا اتحاد(انگریزی)، پاکستان ٹائمز، 2دسمبر 1967ء

29. A Damp Squib، ڈان اداریہ ، 4دسمبر 1967ء

30. نصرت، نمبر 16، 21 جنوری 1968ء صفحہ 15

31. پاکستان ٹائمز، 15مارچ 1969ء

32.پاکستان ٹائمز، 18فروری 1969ء

33. ڈان 16فروری 1969ء

34. پاکستان آبزرور، ڈھاکہ، 19فروری 1969ء

35. ڈان 24فروری 1969ء

36. مارننگ نیوز، 3مارچ 1969ء

37. پاکستان ٹائمز، 2اگست 1969ء

38. جے اے رحیم ، انٹرویو، ویو پوائنٹ، 12اکتوبر 1973ء

39. نصرت، نمبر 27، 30مارچ 1969ء ، صفحہ 7-8

40. مارننگ نیوز، 17جنوری 1970ء

41. نصرت ، نمبر 26، 23مارچ 1969ء ، صفحہ 4

42. فلپ ای جونز، پیپلز پارٹی کی اقتدار تک اٹھان،صفحہ 217
43. ایضاًصفحہ 217
44. پاکستان ٹائمز 31مارچ 1970ء
45. فلپ ای جونز، پیپلزپارٹی کی اقتدار تک اٹھان، صفحہ 245
46. مساوات، 31اگست 1970ء
47. شجاع نواز، کراسڈسورڈز، (آکسفورڈ)، صفحہ 333
48. ایضاًصفحہ 335-334

آمریت اور جمہوریت
اقتدار بدلتے ہیں‘محنت کشوں کے حالات نہیں

”انسانی سماج کی تاریخ میں طبقاتی حکمرانی کے مختلف طریقے ملتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ سماج میں تو خاص طورپر یہ درست ہے جہاں آپ کو ریپبلک، بادشاہت، فاشزم،جمہوریت،آمریت،بوناپارٹسٹ،وفاقی اور مرتکز ہر قسم کے نمونے مل سکتے ہیں“۔

(ٹیڈگرانٹ)(1)

”اگر ہم عام سوچ اور تاریخ کا مذاق نہیں اڑا رہے تو یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمیں طبقات کی موجودگی میں”خالص جمہوریت“کا کہیں بھی نام ونشان نہیں ملے گا۔ہاں البتہ ہم طبقاتی جمہوریت کی بات ضرور کر سکتے ہیں۔”خالص جمہوریت“ محنت کشوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کسی لبرل کا کاذب اور مکارانہ فقرہ ہے۔بلاشبہ سرمایہ دارانہ جمہوریت قرون وسطیٰ کے مقابلے میں ایک جدید تصور ہے مگر یہ سرمایہ داری کے زیر اثر ہمیشہ محدود، اپاہج ‘تنگ نظر،جھوٹی اورمنافقانہ ہے۔گویہ امیروں کیلئے تو ایک جنت سے کم نہیں ہے مگریہ محروموں‌اور غریبوں کیلئے ایک پھندہ‘ ایک لعنت اور ایک دھوکہ ہوتی ہے“۔

(ولادیمیر لینن)(1870-1924ء)(2)

اپنی آزادی کے اکسٹھ سال بعد پاکستان ایک ”قوم“ جو ملک ڈھونڈ رہی تھی سے

تبدیل ہو کر ایک ملک بن گیا ہے جسے ''قوم'' کی تلاش ہو۔ 1968/69ء کے انقلاب کے چالیس سالوں بعدبھی عوام ابھی تک نجات کی جستجو میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ شاید جتنی نجات کی تڑپ آج ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ذلت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔سماجی ومعاشی محرومی کا زخم دن بدن بلکہ لمحہ بہ لمحہ گہراہوتاچلاجارہاہے ۔محروم محنت کش طبقے کے کرب کی شدت کا کوئی حساب نہیں ہے۔غصہ اور اضطراب عمومی رویہ بن چکاہے۔یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ جریدے ''اکانومسٹ ''نے اپنی جنوری 2008ء کی اشاعت میں پاکستان کو کرہ ارض کی سب سے خطرناک جگہ قرار دے دیا۔ 1991ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''اللہ کا انتظار''میں فنانشل ٹائمزکی نمائندہ کرسٹینا لیمب نے پاکستان کی صورتحال کے بارے میں لکھا تھا:

''آج کے دن پاکستان میں مزید 12000انسان جنم لیں گے۔ان میں سے 2000پہلے ہی سال میں مرجائیں گے۔ان میں سے بیشتر اپنی مادری زبان سیکھنے سے پہلے بندوق چلانا سیکھیں گے۔ان میں سے صرف ایک تہائی کو ہی پینے کاصاف پانی نصیب ہو سکے گا۔جبکہ صرف 15%سیوریج کی سہولت سے مستفید ہوسکیں گے۔ایک چوتھائی سکول جا پائیں گے جبکہ کئی ہیروئن کا نشہ کریں گے۔یہ ایک ایسا ملک ہے جو اپنے ہی مستقبل کا قتل کررہاہے''۔

''ا س وقت تک اس دن کا تعین نہیں کیاجاسکا ہے کہ کب اس ملک میں انسانوں کو انسان سمجھا جائے گا۔''اسلام خطرے میں ہے ''کا نعرہ لگاکر برصغیر کی وحدت سے علیحدگی کا جوازگھڑ لیا گیا۔آج اسی مسلمان ملک میں مسلمان سے مسلمان محفوظ نہیں اور ایک کو دوسرے سے تحفظ اورپناہ کی تلاش ہے''۔

''عوام کی ضروریات اسی طرح سے نظرانداز ہوتی رہیں گی کیونکہ دو طبقوں کے مابین تفاوت انتہاکو پہنچاہواہے۔طاقت کے منبع کو پاش پاش کرنے کیلئے کسی انقلابی کی ضرورت ہوگی۔ورنہ ان کے پاس اب واحد رستہ یہی رہ گیا ہے کہ ملک کو ہی توڑدیاجائے''۔(3)

ان الفاظ کے لکھے جانے کے وقت کے بعد سے تو پاکستان کی صورتحال اور بھی زیادہ بگڑ چکی ہے۔کئی علاقوں میں جنگ ،خانہ جنگی جاری ہے تو کہیں سرکشیاں معمول بن چکی ہیں۔امریکی سامراج کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ ''پاکستان کے لیے لعنت اور ملامت کا ایک طوق بن چکی ہے۔عراق اور افغانستان پر جارحیت کے بعد سامراجی اب پاکستان کے شمال مغرب اور دوسرے علاقوں کو اپنی خونریزی کانشانہ بنائے ہوئے ہیں۔خودکش بم دھماکے، بنیادپرستانہ جنونیت ،قتل وغارتگری اور تباہی وبربادی نے